حلاج رحمۃ اللہ علیہ کے نظریہ انا الحق سے ماخوذ فلسفہ طریقت

شعائر الحق

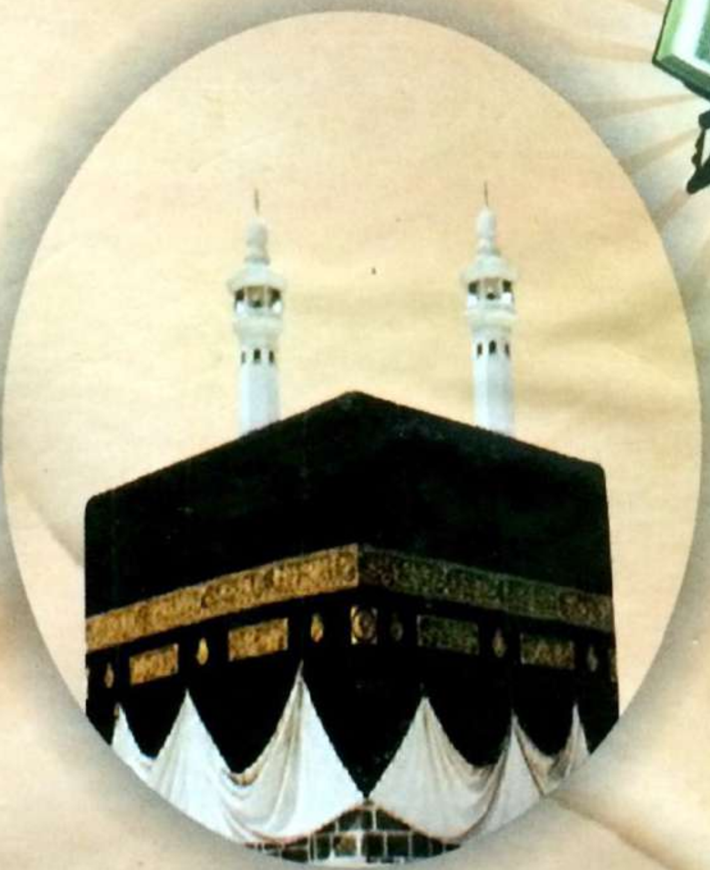

صاحبزادہ سید مرتضیٰ امین نقشبندی مجددی

زیب سجادہ آستانہ عالیہ امینیہ نقویہ

آلو مہار شریف۔ تحصیل ڈسکہ۔ ضلع سیالکوٹ

حلاج رحمۃ اللہ علیہ کے نظریہ انا الحق سے ماخوذ فلسفہ طریقت

شعائر الحق

صاحبزادہ سید مرتضٰی امین نقشبندی مجددی

زیب سجادہ آستانہ عالیہ امینیہ نقویہ
آلو مہار شریف ○ تحصیل ڈسکہ ○ ضلع سیالکوٹ

جملہ حقوق محفوظ ہیں

نام کتاب	شعائرالحق
مصنف	صاحبزادہ سید مرتضٰی امین نقشبندی مجددی
خصوصی تعاون	غلام نبی شیخ
اشاعت	مارچ 2004ء
ناشر	ضیاء القرآن پبلی کیشنز، لاہور
تعداد	ایک ہزار
قیمت	-/200 روپے

ملنے کا پتہ

زیب سجادہ آستانہ عالیہ امینیہ نقویہ

آلومہار شریف، تحصیل ڈسکہ، ضلع سیالکوٹ

انتساب

داعی انا الحق

حسین بن منصور حلاج رحمۃ اللہ علیہ

کے نام

تفصیل ابواب ''شعائر الحق''

تقریظ	5
پیش لفظ	6
باب اول: شہید حق	9
عقیدہ حلول کے متعلق ایک غلط فہمی	23
باب دوم: تصور ذات تعالیٰ	40
توکل	67
معرفت الٰہیہ	86
جوہری ارتقاء اور ذات الٰہیہ	100
جدید نفسیات اور تصور حقیقی	104
منازل یقین	120
فلسفہ عشق	151
باب سوم: حقیقت نفس اور تزکیہ نفس	180
بحوالہ حقائق روزمرہ	229
باب چہارم: سفر سلوک	249
مرید کامل	290
کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں	307
ادب شیخ	317

تقریظ

بفحوائے إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحٰفِظُونَ مشیت ایزدی نے اسلام کی حفاظت وصیانت اپنے ذمہ کرم پر بایں اہتمام لے رکھی ہے کہ علمائے ربانی نے کمال جانفشانی اور جگر سوزی سے اسلام کی روایت ودرایت کو ایسے انتہائی کڑے اصولوں سے محفوظ کر دیا ہے کہ آج بام عروج پر پہنچنے کی دعویدار دانش فرنگ بھی اس پر انگلی اٹھانے کی جرأت نہیں کر سکتی۔ دوسری جانب صوفیائے عظام نے اسلام کی روح، دین حق کے عملی پہلو، اس کے مقصود حقیقی، تزکیہ قلب ونظر اور اصلاح ظاہر و باطن کیلئے ایسے انمٹ نقوش چھوڑے ہیں جن کی شبنم ریزی سے کشت انسانیت تا ابد سیراب ہوتی رہے گی۔

انہی گروہ پاکباز اں میں سے سادات آلومہار شریف بھی ہیں جن میں ایک طرف حضرت خواجہ شمس الہند سید چنن شاہ نوری دائم الحضوری رحمۃ اللہ علیہ ہیں جو دنیائے روحانیت کے آفتاب بن کے یوں چمکے کے کئی مہتاب بکھیر دیئے دوسری طرف خواجہ خواجگان حضرت پیر سید محمد امین شاہ رحمۃ اللہ علیہ کی عظیم شخصیت ایسی بدر منیر ہے جس کی ضوفشانی سے تاریک دل صدیوں جگمگاتے رہیں گے۔

تیسری طرف ابوالکلام خطیب الاسلام حضرت صاحبزادہ سید فیض الحسن شاہ رحمۃ اللہ علیہ ہیں جو شریعت وطریقت کے پیکر حسین بن کے ابھرے۔ سراندیپ سے لے کر چترال کی سرحدوں تک، نصف صدی مسلسل انگریزوں، ہندوؤں، کانگریسیوں اور مرزائیوں کے خلاف اس انداز سے نبرد آزما رہے کہ دجلہ وفرات کے مجاہدین کی یادیں تازہ ہو گئیں۔

اسی خانوادہ عالیہ کے چشم و چراغ حضرت صاحبزادہ سید مرتضٰی امین شاہ مجددی دامت برکاتہم ہیں جو اپنے آباء واجداد کے فیضان ولایت کے امین اور انہی کے نقوش ہدایت پر گامزن ہیں کہ ''بچہ بط گرچہ شبینہ بود قعر دریا تا بہ سینہ بود'' سبزہ عنفوان حیات نوخیز ہونے کے باوجود ان کی تحریر میں روانی اور مضمون میں شگفتگی موجود ہے۔

زیر نظر کتاب ''شعائر الحق'' کے چیدہ چیدہ مقامات کو بندہ نے بنظر غائر دیکھا ہے کتاب اپنے مضمون کے اعتبار سے نہایت ہی جامع ہے۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کتاب کو خاص وعام کے لئے مفید بنائے اور صاحبزادہ صاحب کے علم وعمل میں ترقی عطا فرمائے (آمین)

علامہ پیر محمد سعید احمد مجددی، گوجرانوالہ)

پیش لفظ

''شعائرالحق'' اس ناقص العقل فقیر کی جانب سے تاثیر حق کا ادراک حاصل کرنے کی خاطر ایک معمولی کاوش ہے کہ جسے بارگاہ ایزدی میں شرف قبولیت حاصل ہو۔ پس منظر تا حرف آخر جو تحریک کارفرما رہی وہ فقط ان حقائق سے آگاہی کا حصول ہے، جو اس کائنات بے ثبات میں مختلف الانواع کرشمات الٰہی سے خود کو ثابت کرتے ہیں۔ وگرنہ اگر کارفرمائے تحریک یہ ہو کہ قدرت کل کو عین بہ عین بیان کیا جائے تو یہ جان لینا چاہئے کہ ایسی تحریک بے دست و پا متحرک ہونے سے قبل ہی ناپید ہو جائے گی۔ کیونکہ اس کی بنیاد منطقی دلائل، فصاحت علم، انداز فکر اور روانی قلم پر رکھی گئی، کہ جن کو قدرت نے از خود نقص کے ساتھ ظہور پذیر کیا تو پھر یہ ان بے نقص صفات ربانی کو کیونکر کاملیت سے بیان کر پائیں۔ اس بناء پر مقام مذکور پر خود کو شکست خوردہ تسلیم کر لینا ہی حتمی نتیجہ اور عقل ناقص کی فتح مبین ہے۔ اور شائد یہ وہ واحد شکست ہو کہ جس کو ڈنکے کی چوٹ پر بیان کرنے میں فاخر ہوں۔

بہر کیف حق سے متعلق چند نشانیاں بیان کرنے کی جسارت چاہی ہے۔ اور لطف تو یہ ہے کہ کمال، مصنف کا نہیں کہ ان نشانیوں سے متعلق اپنے قلم سے لولوئے لالہ بکھیرے، بلکہ بذات خود اس رب الاولیٰ کا ہے کہ جس نے از خود ان نشانیوں کو اہل تجسس کے لئے قابل افشاء بنایا تا کہ ان کو احاطۂ بیان میں لایا جا سکے۔ چنانچہ ظاہر میں شکست پے شکست سے دوچار ہوں لیکن باوجود اس کے باطنی سرور محسوس کرتا ہوں۔

قارئین کرام! یہاں مقصد کسی مبالغہ کا نہیں یا پھر ان منطقی دلائل پر مہر تصدیق ثبت کروانا نہیں بلکہ فقط ایک نکتۂ نظر پیش کرنا ہے۔ ممکن ہے کہ یہ کسی اختلافی رائے یا تنقیدی نگاہ سے دوچار ہو، جس سے کوئی اور زاویۂ فکر واضح ہو، مگر یہ تغیر فقط زاویہ کی رو سے تو ثابت ہو سکتا ہے لیکن نکتہ میں ثبات رہے گا۔ اور یہ نکتہ، عالم اجسام، عالم ارواح اور عالم میثال تینوں

حالتوں میں اسی ذات تعالیٰ سے تعبیر ہے اگر Compass کی مدد سے کوئی شخص ایک چھوٹا دائرہ کھینچتا ہے اور دوسرا شخص اسی نقطہ پر Compass رکھ کر ایک بڑا دائرہ بناتا ہے تو فرق فقط حجم اور زاویہ کا پڑا مگر مرکز دونوں صورتوں میں ایک ہی رہا۔

اب رہا سوال باعث تحریر کا تو وہ ایک سائل کا مرہون منت ہے کہ جس نے شائد مجھے کامل العقل جان کر میرے تدبر کا مذاق اڑایا اور ایسا سوال میرے گوش گزار کیا کہ جس سے متجسس ہو کر میں موضوع فکر انگیز پر جنبش قلم دے بیٹھا پھر جب اپنی دانست میں جوابدہ ہوا تو اپنے لکھے پر خود ہی شرمندہ ہوا اور اپنی ابتداء کو اپنی انتہا میں بدلتے پایا۔ اس سائل کا کہنا تھا کہ اللہ عزوجل صریحاً ارشاد فرماتا ہے کہ اِیَّاکَ نَعۡبُدُ وَ اِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ (یعنی) میں تیری ہی عبادت کرتا ہوں اور تجھی سے مدد چاہتا ہوں۔ اب اس فرمان الٰہی میں اس کی اپنی جانب ''اشارہ'' پایا جاتا ہے۔ جبکہ دوسری جانب جناب علی کرم اللہ وجہہ الکریم کا بیان ہے کہ ''جس کی جانب اشارہ کر دیا جائے وہ محدود ہو جاتی ہے''۔ تو کیا مندرجہ بالا بیانات کی روشنی میں وہ ذات تعالیٰ محدود ہو گئی؟ اس کا جواب تو بلا مبالغہ ثابت ہے کہ وہ ذات ہر حال میں لامحدود ہے۔ لیکن وہ شخص اس جواب کو منطقی رکھنا چاہتا تھا۔ اب میں اپنی عقل محدود سے کس طرح اس کی لامحدودیت کو منطق کامل عطا کرتا۔ کیونکہ جو خود لاثانی ہو اس کے بارے میں منطقی دلائل کہاں سے فراہم کئے جائیں؟ میں نے اس سائل سے اس بحث پر معذرت خواہانہ طرز عمل اختیار کرتے ہوئے رخصت چاہی۔ کیونکہ مجھے یقین تھا کہ اگر میں مباحثہ میں الجھ جاتا تو اپنی ہی حقیقت کی بھول بھلیوں میں پڑ جاتا۔ بہر کیف اس سوال سے کم از کم مجھے اسقدر رغبت ضرور پیدا ہوئی کہ ہر طرح کے جواز کو پس پشت ڈالتے ہوئے ذات تعالیٰ کی مختصراً ثنا خوانی کی جائے۔ کہ جو اس کے ہر منطق پر حاوی ہونے کا برملا اعلان کرے۔ برائے جواز سورۂ اخلاص ہی کافی ہے۔ علاوہ ازیں واللہ عالم الغیب۔

لیکن اگر معاملہ فہمی، حقیقت انسانی اور شعور انسانی کے تحت مقصود ہو تو جواز کی مد میں اس قدر لفاظی ضرور قابل قبول سمجھی جائے کہ جب شعور خود آگاہ ہو جائے۔ اور اپنی قوت تخلیق اور

اس کے ضابطوں کو جان لے تو اس کے نتائج بے پناہ ہوتے ہیں۔ جب ہمیں یہ یقین حاصل ہو جائے کہ تمام قوت کا منبع ہمارے اندر ہے اور ہم قوت کو خارج کی بجائے اپنے اندر سے حاصل کر سکیں تو اس صداقت کے عرفان سے ہمیں معجزانہ قوت حاصل ہو جاتی ہے۔

ہمیں چاہئے کہ کہ قرب و معیت حق ہر وقت مستحضر رکھیں۔ تا آنکہ ہم حق میں محدود ہو جائیں اور ہم حق کے لئے جئیں اور حق میں ہی جئیں۔ اس سے ہمیں حیات سرمدی نصیب ہو گی اور فیضان حق سے ہماری قوتیں بے پناہ ہو جائیں گی۔ مراقبۂ حق کی مشق طویل جبر و استقامت کے بعد ہی مکمل ہوتی ہے۔ قرب و معیت حق کا ادراک صرف شعوری طور پر ہی نہ ہونا چاہئے، بلکہ یہ یقین دل کی گہرائیوں میں جاگزیں ہو جائے۔ محویت حق میں ہم خود فراموش ہو جائیں اور حق ہی قائل رہے۔ یہ فراموشگاری ہی کامل ہوشیاری ہے۔

آخر میں بطور ''تشکر'' عرض ہے کہ اپنی فہم کو جلا بخشنے کی خاطر حلاجؒ کے فلسفہ انا الحق کا سہارا لیا ہے۔ کیونکہ ان کی فکر بے پایاں ہی ان الجھی گتھیوں کو سلجھانے میں بہترین معاون ثابت ہوئی۔ علاوہ ازیں تعلیمات مجددیہ اور امثال رومیہ سے بھی اپنے افکار کو مزین کیا ہے۔ حتی الوسع کوشش رہی ہے کہ آسان الفاظ میں مفہوم کو واضح کر سکوں اور اہل دانش کی دعاؤں کا مستحق ہوں۔

طالب دعا فقیر

مرتضی امین آلومہاروی

۱۰/۱۲/۲۰۰۲

باب اول

شہید حق

حسین بن منصور حلاج رحمۃ اللہ علیہ

حسین بن منصور حلاج رحمۃ اللہ علیہ کے فلسفہ انا الحق کو اپنے موضوع کی بنیاد بنانے سے قبل یہ ضروری ہے کہ آپ کے حالات زندگی اور فکر ونظریات سے مختصراً واقفیت حاصل کر لی جائے۔

حلاج رحمۃ اللہ علیہ جو درحقیقت فقہاء اور صوفیاء کی صدیوں سے جاری باہمی نظریاتی جنگ کا انجام ہوئے اور اہل تصوف کی بجھتی ہوئی رنگت کو اپنے خوف حق سے رنگین کیا۔ شہر بیضا میں پیدا ہوئے۔ بیضا فارس کا ایک شہر ہے۔ آپ کی ولادت ۲۴۴ھ میں ہوئی۔ عمر کا ابتدائی زمانہ عراق کے شہر واسطہ میں گزرا۔

پھر ہواز کے ایک مقام تستر میں سہل بن عبداللہ التستر ی کے ہم رکاب رہے پھر بصرہ میں عمرو مکی کے فیض صحبت سے استفادہ کیا۔ ۲۶۴ھ میں بغداد آئے اور جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ کے حلقہ بیعت میں شریک ہو گئے۔ حلاج رحمۃ اللہ علیہ کو سیر وسیاحت کا بڑا شوق تھا۔ چنانچہ ان کی عمر کا بڑا حصہ اسی شغل میں بسر ہوا۔

اپنی زندگی میں تین مرتبہ مکہ مکرمہ تشریف لے گئے اور ہر مرتبہ حج کے فریضہ سے سبکدوش ہوئے۔

ابن منصور رحمۃ اللہ علیہ نے طبیعت بے باک اور غیور پائی تھی۔ جو بات دل میں آتی اسے زبان پر لانے میں تامل نہیں کرتے تھے۔ اپنے عقیدے اور مسلک میں ذرا بھی لچک نہیں رکھتے تھے۔ بہت سخت تھے نہ رواداری کے قائل تھے نہ مصلحت کے۔ جس بات کو سچ سمجھ لیتے تھے اس کا فاش اور برملا اعلان کرنا اپنا فرض سمجھتے تھے۔ ۲۹۷ھ میں ابن داؤد الاسفہانی الظاہری کے فتوے کی بنیاد پر پہلی مرتبہ گرفتار ہوئے۔ لیکن ٹھیک ایک سال بعد

زندان سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے۔ ۳۰۱ھ میں دوسری مرتبہ ان کی گرفتاری عمل میں آئی اور آٹھ سال تک مسلسل اسیر زنداں رہے۔

ابن منصور رحمۃ اللہ علیہ کو جب دوسری مرتبہ قید کیا گیا تھا تو آپ کی طبیعت یکسر بدل چکی تھی۔ نقل ہے کہ جب آپ کو قید کیا گیا تو پہلی ہی رات آپ جیل خانے سے غائب ہو گئے۔ قید خانے والوں نے آپ کو بہت تلاش کیا لیکن نہ پا سکے۔ دوسری رات جب ڈھونڈ کر آئے تو دیکھا کہ نہ تو قید خانہ ہے اور نہ ہی آپ ہیں۔ ہر چند قید خانے کو دیکھا لیکن نہ پایا۔ تیسری رات جب آئی تو آپ بھی تھے اور قید خانہ بھی تھا۔ لوگوں نے پوچھا کہ پہلی رات کہاں رہے اور دوسری رات نہ تو آپ تھے اور نہ ہی قید خانہ تھا اور آج تم بھی ہو اور قید خانہ بھی ہے؟ آپ نے فرمایا! پہلی رات میں حضور میں تھا یہی وجہ تھی کہ میں نہ تھا، دوسری شب حضور اس جگہ تھے یہی سبب تھا کہ قید خانہ گم ہو گیا۔ آپ نے مجھ کو حفظ وشریعت کے لئے واپس بھیجا ہے کہ جاؤ اور اپنا کام کرو۔ نقل ہے کہ آپ قید خانے میں ہزار رکعت نماز ہر روز ادا کرتے تھے۔ لوگوں نے کہا آپ تو کہتے ہیں کہ میں خدا ہوں اور یہ نماز کس کی ادا کرتے ہیں؟ آپ نے فرمایا! یعنی قدر ہم خود ہی خوب جانتے ہیں۔ پھر ایک رات قیدیوں کی تعداد تین سو تک پہنچ گئی۔ آپ نے فرمایا! اے قیدیو! میں تم کو آزاد کروں؟ انہوں نے کہا کس طرح کرو گے؟ پہلے اپنے آپ کو آزاد کر لو۔ آپ نے فرمایا! میں خدا کا قیدی ہوں اور شریعت کا پاس رکھتا ہوں۔ اگر میں چاہوں تو تمام طوق و زنجیر کو ایک اشارے سے توڑ ڈالوں۔ پھر آپ نے اشارہ کیا تو تمام قیدیوں کے طوق وزنجیر کو توڑ ڈالا۔ انہوں نے کہا کہ ہم کہاں سے باہر نکلیں قید خانہ کا دروازہ بند ہے؟ آپ نے ایک اور اشارہ کیا تو قید خانے کی دیواروں میں شگاف پڑ گیا اور آپ نے فرمایا اب اپنا راستہ لو۔ لوگوں نے کہا کیا تم نہیں آتے؟ آپ نے فرمایا! میرا اس کے ساتھ ایک راز ہے جو سوائے سولی پر چڑھنے کے نہیں کہا جا سکتا۔ دوسرے روز قید خانے والوں نے کہا قیدی کہاں ہیں؟ آپ نے فرمایا! میں نے آزاد کر دیئے ہیں۔ انہوں نے کہا تم کیوں رہ گئے ہو؟ آپ نے فرمایا کہ حق تعالیٰ کو مجھ

پر کچھ عتاب ہے اس لئے ہم ٹھہرے ہیں۔ یہ خبر خلیفہ کو پہنچی تو خلیفہ نے کہا ضرور کوئی نہ کوئی فتنہ اٹھ کھڑا ہوگا۔ اس نے آپ کو قتل کرنے یا سولی پر چڑھانے کا حکم دیا تا کہ ایسی باتیں کرنے سے باز رہیں۔ آپ کو تازیانے لگانے والا کہتا ہے کہ آپ کو ضرب تازیانہ لگائی گئی تا کہ آپ انا الحق کہنے سے باز رہیں۔ وہ کہتا ہے کہ ہر تازیانہ جو میں آپ کو لگاتا تھا تو اس پر آپ کی آواز نہایت فصیح معلوم ہوتی تھی۔ ہاتف نے ندادی کہ ابن منصور رحمۃ اللہ علیہ (لا تخف) اے پسر منصور خوف نہ کر۔ پھر آپ کو سولی پر چڑھانے کے لئے لے گئے۔ ایک لاکھ آدمی کا مجمع تھا آپ ہر ایک کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھتے تھے اور فرماتے تھے! حق حق انا الحق۔ ایک درویش دوڑ کر آپ کے پاس پہنچا اور پوچھا کہ عشق کیا ہے؟ آپ نے فرمایا! تو آج دیکھئے گا، کل دیکھئے گا اور پرسوں دیکھئے گا۔ یعنی اس روز آپ کو قتل کیا گیا، دوسرے روز جلایا گیا اور تیسرے روز آپ کی خاکستر کو ہوا میں اڑا دیا گیا یعنی عشق یہ ہے۔

آپ کے خادم نے اس حالت میں آپ سے وصیت چاہی۔ آپ نے فرمایا!

"نفس کو کسی شے کے ساتھ مشغول رکھ ورنہ وہ تجھ کو کسی شے کے ساتھ مشغول کر دے گا۔ اسے یاد رکھو کہ اپنی حفاظت کرنا نہایت زبردست لوگوں کا کام ہے۔"

آپ کے صاحب زادے نے کہا کہ ابا جان مجھے بھی وصیت فرمائیے۔ آپ نے فرمایا! اے بیٹے وصیت یہ ہے کہ!

"جب جہاں والے اعمال میں کوشش کریں تو ایسی شے میں کوشش کر کہ اس کا ایک ذرہ تمام جہاں کے جن و انس سے بہتر ہو اور وہ علم حقیقت کا ایک ذرہ ہے۔"

آپ سولی کی طرف جاتے تھے اور نہایت ذوق وشوق کے ساتھ خراماں خراماں چلتے تھے۔ لوگوں نے کہا ایسے وقت میں خوشی کا کیا باعث؟ آپ نے فرمایا! ہم اپنے خیمہ گاہ کی طرف جا رہے ہیں اور اس سے بڑھ کر ہمارے لئے اور کوئی خوشی کا وقت نہیں۔ آپ نہایت بلند آواز یہ اشعار پڑھتے تھے۔

ندیمی غیر منسوب الیٰ شی من الحیف
سقانی مثل مایشرب کفعل انصیف باالغیف
فلما دارت الفاس دعا بالنطع والیسف
کذا من یشرب الراح مع الذین بالضیف

یعنی ''میرا دوست بھی ظالم نہیں ہے اس نے مجھ کو اپنی شراب دی ہے جو مہمان کو مہمان دیتا ہے۔ جب چند دور گزر گئے تو اسنے شمشیر ونطع طلب کی کیونکہ ایسے شخص کی یہی سزا ہے۔ جو گرمی میں اژدھا کے ساتھ شراب پیتا ہے۔''

جب آپ کو سولی کے نیچے لے گئے تو آپ نے باب الطاق کو بوسہ دیا اور پھر سیڑھی کے پائے پر قدم رکھا۔ لوگوں نے پوچھا کیا حال ہے؟ آپ نے فرمایا! دونوں کا معراج سولی پر ہے۔ آپ کمر سے ایک چادر باندھے ہوئے تھے اور ایک چادر آپ کے کندھوں پر تھی۔ آپ نے ہاتھ اٹھائے اور منہ قبلہ کی جانب کر لیا اور جو کچھ چاہا، پایا۔ جب آپ سولی پر چڑھے تو آپ کے مریدوں نے آپ سے پوچھا کہ آپ ان لوگوں کے بارے میں کیا کہتے ہیں جنہوں نے آپ کے ساتھ ایسا سلوک کیا؟ اور ہمارے حق میں کیا فرماتے ہیں جو آپ کی فکر میں ہیں۔ آپ نے فرمایا! ان کے لئے دو ثواب ہیں اور تمہارے لئے ایک ثواب۔ اس لئے کہ تم کو میرے ساتھ صرف حسن ظن ہے اور وہ قوت توحید اور صلابت شریعت سے کانپ رہے ہیں اور توحید شروع میں اصل ہے اور حسن ظن فرع ہے۔

نقل ہے جوانی کی عمر میں ایک عورت کی طرف دیکھا تھا۔ جس وقت آپ سولی پر تھے اس وقت آپ نے فرمایا! ہائے وہ کیا بات تھی جو مجھ پر گزری اور گزر گئی اب کئی سالوں کے بعد اس کا بدلہ مجھ سے لیتے ہیں۔ پھر آپ نے سیڑھی سے نیچے کی طرف دیکھا اور خادم سے کہا کہ جو اس طرح اوپر چڑھتا ہے وہ اس طرح نیچے دیکھتا ہے۔ پھر حضرت شبلی رحمۃ اللہ علیہ آپ کے نزدیک آئے اور بلند آواز سے کچھ کہا تو آپ نے فرمایا کہ تصوف کا کم ترین درجہ ہے کہ جو تم دیکھ رہے ہو۔ حضرت شبلی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا بلند ترین درجہ کون سا ہے؟ آپ

نے فرمایا تم کو وہاں تک راہ نہیں۔ پھر ہر ایک شخص آپ پر پتھر پھینکتا تھا۔ حضرت شبلی رحمۃ اللہ علیہ نے ان کی موافقت میں ایک مٹی کا ڈھیلا اٹھا کر پھینکا۔ آپ نے ایک آہ لی۔ لوگوں نے کہا اتنے آدمیوں نے آپ پر پتھر پھینکے تو آپ نے بات تک نہ کی اب اس مٹی کے ڈھیلے سے آہ کرتے ہیں۔ آپ نے فرمایا! وہ نہیں جانتے ہیں کہ اس لئے معذور ہو کر لگاتے ہیں اور جو چیز ناگوار گزار ہے وہ اس لئے ہے کہ جو اصل حالت سے واقف ہے انہوں نے بھی وہی کچھ کیا جو ان معذور لوگوں نے کیا۔

پھر سولی کی سیڑھی پر آپ کے ہاتھ کاٹے گئے، آپ ہنسے۔ لوگوں نے کہا یہ ہنسی کا کیا موقع ہے؟ آپ نے فرمایا! ان ظاہری ہاتھوں کو کاٹ لینا آسان ہے اگر مرد آئیں اور ہمارے صفاتی ہاتھوں کو، جنہوں نے کلاہ ہمت کو عرش کے سر سے اتارا ہے، کاٹیں تو تب بات بنے۔ پھر آپ کے پاؤں کاٹے گئے لیکن پھر بھی آپ نے تبسم کیا اور فرمایا! اگرچہ جہاں کا سفر ان پاؤں سے میں نے کیا ہے لیکن میرے دوسرے پاؤں بھی ہیں جن سے دونوں عالموں کا سفر کر سکتا ہوں۔ تم میرے وہ پاؤں کاٹو تو تب بات بنے۔ پھر آپ نے اپنے ہاتھوں کو خون سے بھر کر اپنے منہ پر ملا۔ لوگوں نے کہا آپ یہ کیوں کرتے ہیں؟ آپ نے فرمایا! میرا بہت سا خون نکل گیا ہے میں جانتا ہوں کہ میرا چہرہ زرد ہو گیا ہو گا اور تم خیال کرتے ہو گے کہ میرے چہرے کی زردی خوف کی وجہ سے ہے۔ میں خون چہرے پر ملتا ہوں تاکہ لوگوں کی نظروں میں سرخرو معلوم ہوں کیونکہ مردوں کے چہرہ کا غازہ ان کا خون ہی ہے۔ لوگوں نے کہا کہ ہم مانتے ہیں کہ چہرے کو آپ نے اس لئے سرخ کیا ہے لیکن یہ تو بتلائیے کہ کلائیوں کو کیوں خون سے بھرا ہے؟ آپ نے فرمایا! وضو کر رہا ہوں۔ لوگوں نے کہا یہ کیسا وضو ہے؟ آپ نے فرمایا! یعنی دو رکعتیں ایسی ہیں جن کا وضو خون سے کیا جاتا ہے۔ پھر آپ کی آنکھیں نکال لی گئیں۔ لوگوں میں ایک قیامت بپا ہو گئی بعض روتے تھے اور بعض پتھر پھینکتے تھے۔ پھر انہوں نے چاہا کہ آپ کی زبان کاٹ لی جائے۔ آپ نے فرمایا! اتنا توقف کرو کہ میں ایک بات کر لوں۔ آپ نے منہ آسمان کی طرف کر لیا اور کہا الٰہی اس قدر

تکلیف جو مجھ کو محض تیرے لئے دے رہے ہیں ان کو محروم رکھا اور اس دولت سے ان کو بے نصیب نہ کرنا۔ الحمداللہ! اگر میرے ہاتھ پاؤں کاٹتے ہیں تو تیری راہ میں اگر میرے سر کو تن سے جدا کرتے ہیں تو تیرے جمال کے مشاہدے سے کرتے ہیں۔ پھر آپ کے کان اور ناک کاٹ ڈالے گئے اور لوگ پتھر مارتے جاتے تھے۔ آپ کا آخری کلام یہ تھا!

''حب الواحد افراد الواحد حب الواحد افراد الواحد''

آپ نے یہ آیت پڑھی!

یستعجل بھا الذین لا یومنون بھا والذین امنوا مشفقون منھا و یعلمون انھا الحق

اور یہ آپ کا آخری کلام تھا پھر آپ کی زبان کاٹ ڈالی گئی۔ نماز مغرب کا وقت تھا کہ خلیفہ کا حکم آیا آپ کا سر تن سے جدا کر دیا جائے کیونکہ خلیفہ کے مطابق لوگوں نے نماز مغرب ادا کرنی تھی۔ لوگ تو شور ہی بپا کرتے رہے اور آپ نے جان دے دی اور اس طرح آپ نے بتاریخ ۱۸ ذیقعد ۳۰۹ھ کو قضائے گیند کو رضا کے بیابان میں ڈالا۔

آپ کے ہر ایک عضو سے ''انا الحق'' کی صدا بلند ہوتی تھی۔ پھر آپ کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا گیا اور سوائے گردن اور پشت کے کچھ باقی نہ رہا۔ آپ اسی طرح گردن اور پیٹھ سے ''انا الحق'' کہتے رہے۔ دوسرے روز لوگوں نے کہا کہ یہ فتنہ تو آپ کی اس حالت سے اور بھی زیادہ ہو جائے گا۔ پھر آپ کے تمام اعضاء کو جلا دیا گیا لیکن آپ کی خاکستر سے بھی وہی آواز آتی تھی۔ آپ کے قتل کرنے کے وقت جو قطرہ خون کا زمین پر گرتا تھا اس سے ''انا الحق'' کا نقش پیدا ہوتا تھا۔ آخر جب مجبور ہو گئے تو آپ کی خاک کو دجلہ میں پھینک دیا۔ پھر تو سطح آب سے بھی وہی صدا آنے لگی اور پانی میں ایک جوش بپا ہوا۔ آپ نے ایک خادم کو وصیت فرما دی تھی کہ جب میری خاک کو دجلہ میں ڈالیں گے اور بغداد کے لئے ایک آفت بپا ہو جائے گی، پانی میں طوفان پیدا ہو جائے گا اور بغداد کو غرق کر دیگا۔ جب ایسی حالت واقع ہونے لگے تو میرے خرقہ کو دجلہ پر لے جانا۔ خادم نے جب

دیکھا کہ پانی میں طوفان پیدا ہو گیا تو آپ کے خرقہ کو دجلہ پر لے گیا۔اسی وقت پانی ساکن ہو گیا اور آپ کی خاکستر بھی خاموش ہو گئی۔اس کو جمع کر لیا گیا اور دفن کر دیا گیا۔

اہل تصوف میں سے کسی کو بھی وہ فتوحات نصیب نہ ہوئیں جو آپ کے حصہ میں آئیں۔حضرت شبلی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں! کہ جب آپ کو سولی پر چڑھایا گیا تو ابلیس لعین آپ کے سامنے آیا اور کہا کہ ایک بات تم نے کہی اور ایک بات میں نے کہی۔تو نے ''انا الحق'' کہا اور میں نے ''انا خیر'' کہا۔لیکن تجھ پر تو رحمت ہوئی اور مجھ پر لعنت۔ آپ نے جواب دیا تو نے ''انا'' اپنے لئے یعنی اپنی خودی سے کہا اور میں نے خودی کو اپنے آپ سے دور کر کے کہا اور یہی فرق ہے مجھے رحمت نصیب ہوئی اور تجھے لعنت۔تا کہ تو جان لے کہ خودی خوب نہیں اور خودی کو اپنے سے دور کرنا نہایت نیکی ہے۔

حلاج رحمۃ اللہ علیہ کے اور بھی عقائد تھے جو ان کے قتل کے فیصلے کا سبب بنے۔مثلاً حج کوئی ایسا فریضہ نہیں ہے کہ انسان اس کی ادائیگی پر مکلّف ہو۔صورتحال یہ ہے کہ حج کا ظاہر وہ ہے کہ انسان اپنے شہر سے ارض مقدس حجاز سفر کرتا ہے اور وہاں جا کر مناسک حج ادا کرتا ہے۔لیکن اس کے علاوہ ایک دوسرا حج بھی ہے اور وہ ہے روحانی حج۔اگر انسان اپنے نفس کی تربیت اور تکمیل کر چکا ہے تو وہ یہ محسوس کر سکتا ہے کہ خود خانہ کعبہ اس کے پاس آ گیا اور خود خانہ کعبہ نے اس کا طواف کیا۔بجائے اس کے وہ خانہ کعبہ تک جاتا اور وہاں طواف کرتا۔جو حج ظاہر کی ایک معروف صورت ہے۔

حلاج رحمۃ اللہ علیہ کی ہلاکت کے بعد ان کے عقیدے،مسلک اور مذہب کے بارے میں مختلف قسم کی آرائیں مختلف لوگوں نے ظاہر کیں۔ایک فریق کا تو یہ کہنا ہے کہ وہ کافر اور زندیق تھے اور یہ کہ کتاب وسنت کی رو سے سوائے اس کے کہ انہیں کافر کہا جائے اور کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ایک دوسرا گروہ وہ ہے جو کہتا ہے کہ وہ بہت بڑے ولی اور برگزیدہ شخص تھے اور مقربین بارگاہ الٰہی میں داخل تھے،خدا کے ہاں ان کی بہت بڑی منزلت تھی اور وہ اس سے بہت قریب تھے۔ان کی طرف جو اقوال منسوب ہیں ان کے ظاہری مفہوم کو سمجھتے تو ہرگز

ان کے بارے میں ایسی غلط رائے قائم نہ کرتے اور نہ ان کو تکفیر اور تفسیق کی جرأت کرتے۔
پہلے گروہ کے ہم نواؤں میں ابن ندیم بھی شامل ہیں جن کا خیال ہے کہ حلاج رحمۃ اللہ علیہ
نے شعبدہ بازی سے کام لے کر تصوف کو اپنا شعار اور پھر اپنی سپر بنالیا تھا۔ ان کا دعویٰ تھا کہ
وہ ہر علم سے واقف ہیں حالانکہ حقیقت یہ تھی کہ وہ ہر علم میں صفر تھے۔ (تحقیق: الفہرست)
لیکن جو لوگ دوسرے گروہ سے تعلق رکھتے ہیں اور حلاج رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں اچھی
رائے رکھتے ہیں ان کا عقیدہ ہے کہ وہ بہت بڑے ولی اللہ تھے ان کی سی برگزیدہ اور مقدس
ہستی شاذ و نادر عالم وجود میں آتی ہے۔ وہ اپنی حقیقت اور مطلقیت الٰہی کے اتحاد کے قائل
تھے۔ یہی ان کا مضبوط اور مستحکم عقیدہ تھا۔ اس سلسلے میں ہم زیادہ نام نہیں گنوانا چاہتے
صرف دو ناموں پر اکتفا کریں گے۔ ایک تو حضرت جلال الدین رومی رحمۃ اللہ علیہ مشہور و
عظیم فارسی شاعر جو حلاج رحمۃ اللہ علیہ کی تعریف و توصیف اعلانیہ کرتے تھے اور ذرا نہیں
جھجکتے۔ دوسرے حضرت فرید الدین عطار رحمۃ اللہ علیہ جو حلاج رحمۃ اللہ علیہ سے اپنی
عقیدت اور محبت رکھتے تھے اور انہوں نے انہیں ''شہید حق'' کا خطاب دیا ہے۔

حلاج رحمۃ اللہ علیہ نے تصوف اور طریق تصوف اور اپنے مخصوص عقائد و نظریات کی
شرح و توضیح میں متعدد کتابیں لکھیں اور رسائل قلمبند کئے۔ ابن ندیم نے اپنی الفہرست میں
۴۷ تک تعداد گنوائی ہے جن میں سے چند کا ہم اس جگہ ذکر کرتے ہیں۔

- ☆ کتاب الاحرف المدثہ والازلیہ، والاسماء، الکلیۃ
- ☆ کتاب الاصول والفروع
- ☆ کتاب سر العالم والمبعوث
- ☆ کتاب العدل والتوحیۃ
- ☆ کتاب علم البقاء والفنا
- ☆ کتاب مدح النبی المثل الاعلیٰ
- ☆ کتاب ھوھو

مذکورہ کتابیں حلاج رحمۃ اللہ علیہ کی اہم ترین تصانیف میں شمار ہوتی ہیں۔ ابن منصور رحمۃ اللہ علیہ کے مذہب اور عقیدے کی اگر چھان بین کی جائے تو معلوم ہوگا کہ انہوں نے اپنی نظم ونثر میں جن خیالات وعقائد کا اظہار کیا ہے وہ تین چیزوں پر مشتمل ہے۔

☆ مطلقیت الٰہی کا حلول ذات بشری میں۔

☆ حقیقت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قدم۔

☆ توحید ادیان۔

حلاج رحمۃ اللہ علیہ کے نظریہ حلول کے بارے میں صفوان کے ایک معاصر اصطخری نے حسب ذیل خیالات کا اظہار کیا ہے۔

''حسین بن منصور رحمۃ اللہ علیہ جو حلاج کے لقب سے مشہور ہیں، بیضا کے رہنے والے تھے۔ وہ پیشے کے اعتبار سے جولاہے تھے۔ ان کا یہ عقیدہ تھا کہ جو شخص طاعت میں اپنے نفس کو پختہ کرے، اپنے دل کو اعمال و اشغال صالحہ کا خوگر بنائے، ترک لذات کا عادی ہو جائے، شہوات وخواہشات پر اقتدار حاصل کر لے تو وہ مقام مقربین تک پہنچ جاتا ہے۔ پھر جب اس کا تزکیہ اور تنقیہ اور زیادہ ہو جاتا ہے تو وہ بشریت کی حدود سے گزر جاتا ہے۔ پھر جب اس میں بشریت کا شائبہ نہیں رہتا تو وہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی روح (مطلقیت) میں تحلیل ہو جاتا ہے۔ جیسے حضرت عیسیٰ بن مریم علیہ السلام۔ پھر وہ مطیع سے مطاع بن جاتا ہے۔ یعنی وہ کسی کی اطاعت کرتا نہیں خود اس کی اطاعت لوگ کرتے ہیں۔ پھر وہ جس چیز کا ارادہ کرتا ہے وہی ہو جاتی ہے۔ پھر اس کا کوئی فعل اس کا نہیں رہتا بلکہ خود اللہ کا فعل بن جاتا ہے۔''

اصطخری کی رائے کے پیش نظر حلاج رحمۃ اللہ علیہ انسان میں اللہ کے حلول کے قائل تھے۔ لیکن اس عقیدہ حلول میں وہ تنہا نہیں تھے۔ حضرات جعفریہ کے عقائد میں بھی یہ اہم ترین عقیدہ ہے۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حلاج رحمۃ اللہ علیہ نے یہ عقیدہ یہیں سے لیا

اور اسی بنیاد پر اپنے عقیدہ حلول لاہوت اور ناسوت کی بنیاد رکھی۔ اس عقیدے کی رو سے اللہ انسان میں، محبوب محبّ میں اور رب عبد (مطلقیت کے ضمن) میں حلول کر جاتا ہے۔

چنانچہ ذیل کے اشعار میں وہ کہتے ہیں!

"ہم دو روحیں ہیں (روح سے مراد صفائی استعداد ہے)
جنہوں نے ایک بدن کی صورت اختیار کر لی ہے
جب وہ مجھے دیکھتا ہے
میں اسے دیکھتا ہوں
جب میں اسے دیکھتا ہوں
وہ مجھے دیکھتا ہے"

ایک اور مقام پر محبوب یعنی خدا کو مخاطب کر کے کہتے ہیں!

"تو میری رگ و پے میں اور قلب میں جاری و ساری ہے
جس طرح
آنسو میری آنکھوں سے جاری ہیں
ضمیر، قلب میں اس طرح حل ہو گیا ہے
جس طرح
روح بدن میں جذب ہو جاتی ہے!"

حلاج رحمۃ اللہ علیہ روح محبوب اور روح نفس یعنی انسان اور اللہ کی روح (مطلقیت) کے امتزاج کے قائل تھے۔ ثبوت کے لئے اشعار ذیل ملاحظہ ہوں!

"اے اللہ!
تیری روح میری روح میں اس طرح سما گئی ہے
جس طرح
شراب آب ذلال میں

جب کوئی چیز
تجھ سے مس ہوتی ہے تو مجھے بھی مس ہوتی ہے
کیونکہ
تو اور میں ہر حال میں ایک ہیں''

ان اشعار میں وہ امتزاج روح (یعنی حقیقت انسانی اور مطلقیت الٰہی) کو تشبیہ دیتے ہیں کہ جس طرح شراب اور پانی کو جدا نہیں کیا جا سکتا اسی طرح مجھے اور تجھے الگ نہیں کیا جا سکتا، جس طرح شراب اور پانی مل کر ایک ہو جاتے ہیں اسی طرح تو اور میں مل کر ایک ہو گئے ہیں۔ لیکن حلاج رحمۃ اللہ علیہ کی بعض ایسی تحریریں بھی ہیں جو باہم مختلف ہیں۔ مثلاً ابھی ہم اوپر کے اشعار میں بتا چکے ہیں کہ وہ امتزاج بشریت اور الوہیت کے قائل تھے۔ لیکن خود ہی اپنی ایک تحریر میں اس نظریئے سے اختلاف بھی کرتے ہیں۔

''جس شخص کا یہ خیال ہے کہ الٰہیت، بشریت میں مدوج ہو سکتی ہے یا بشریت، الٰہیت میں حلول کر سکتی ہے وہ کافر ہے۔ کیونکہ خدائے بزرگ و برتر اپنی اس ذات اور صفات کے اعتبار سے فرد ہے۔ ان لوگوں کے مقابلے میں جو اس کے پیدا کئے ہوئے ہیں اور جن کی صفات عارضی ہیں۔ وہ کسی بھی مخلوق سے مشابہت نہیں رکھ سکتا اور نہ مخلوق خدا سے کسی درجے میں مشابہت رکھ سکتی ہے۔ اس لئے یہ محال عقلی ہے۔''

اس تحریر کے پیش نظر اندازہ ہوتا ہے کہ حلاج رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک لاہوت اور ناسوت، رب اور عبد، محبوب اور محبّ دو الگ الگ چیزیں ہیں جو اپنی ذات کے اعتبار سے بالکل جدا، متغائر اور متمائز ہیں۔ اگرچہ اس مسئلہ میں حلاج رحمۃ اللہ علیہ کی رائے میں بظاہر تضاد پایا جاتا ہے لیکن حلاج رحمۃ اللہ علیہ کے عقیدہ سے متعلق یہیں سے ہمیں وہ تفصیل حاصل ہوتی ہے جس بناء پر یہ عیاں ہوتا ہے کہ حضرت حلاج رحمۃ اللہ علیہ درحقیقت وحدت الوجود ہی کی تفصیل بیان کرتے ہیں اور ان کا حلول فقط ''مطلقیت'' سے تعلق رکھتا ہے نہ کہ

''حقیقت'' سے۔ اس صورت میں انسان سے جو فعل سرزد ہوتا ہے وہ درحقیقت ارادہ انسانی نہیں ہوتا بلکہ مشیت الٰہی ہوتا ہے۔ دوسری عبارت میں اس خیال کا مطلب خود حلاج رحمۃ اللہ علیہ کے الفاظ میں یوں سمجھئے کہ اللہ نے انسان کو اپنی صفاتی صورت میں پیدا کیا۔ اسی لئے اس نے ملائکہ کو حکم دیا کہ وہ آدم علیہ السلام کو سجدہ کریں۔

جیسا کہ خود قرآن کریم سے ثابت ہے۔

''یعنی ہم نے ملائکہ سے کہا آدم کو سجدہ کرو ابلیس کے سوا سب نے سجدہ کر لیا۔ ابلیس نے انکار کیا اور استکبار کیا اور وہ کافروں میں شامل ہو گیا۔'' (بقرہ:34)

حلاج رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب ''الطّواسین'' میں حقیقت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قدم پر بڑی فلسفیانہ گفتگو کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دو مختلف صورتیں ہیں۔ ایک صورت تو یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نور ازل ہیں جو قدیم ہے حادث نہیں یعنی جو ہمیشہ سے ہے اور جسے کبھی فنا کا جھونکا نہیں بجھا سکتا۔ یہ نور محمدی صلی اللہ علیہ وسلم دنیا کے وجود میں آنے سے کہیں پہلے سے موجود تھا۔ اسی نور سے علم و عرفان کے سوتے پھوٹے۔ دوسری صورت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبی مرسل کی ہے اور یہ پہلی سے بالکل الگ ہے۔ حلاج رحمۃ اللہ علیہ، نور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں!

''آپ صلی اللہ علیہ وسلم غیب کے نور کی روشنی تھے۔ ظاہر ہوئے اور واپس لوٹ گئے۔''

انوار محمدی صلی اللہ علیہ وسلم اور نور نبوت کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں!

''انوار نبوت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے نور ازلی سے چمکے اور فروغ گیر ہوئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نور سے بڑھ کر کوئی نور بھی انور اور اظہر نہیں اور نہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قدم سے بڑھ کر کوئی قدم ہے۔'' (نفس المرجع)

ایک دوسرے مقام پر بتایا ہے کہ تمام علوم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے علم کا قطرہ ناچیز تھے، تمام حکمتیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سمندر کے سامنے ایک چھوٹی سی نہر تھیں۔ چنانچہ

اس مسئلہ کو بیان کرتے ہوئے حلاج رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں!

"آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اوپر بادل تھے جن سے بجلیاں کوندتی تھیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے نیچے بجلیاں تھیں جو چمکتی اور دمکتی تھیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا سحاب نور برساتا اور پھل لاتا تھا۔ تمام علوم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بحر بے پایاں کا ایک قطرہ ناچیز تھے، تمام حکمتیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حکمت کے سمندر کے سامنے ایک چھوٹی سے نہر تھیں، تمام زمانے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے کے سامنے ایک ساعت سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے۔" (نفس المرجع)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قرب الٰہی کے پہلو کو نمایاں کرتے ہوئے حلاج رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں!

"حق آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا وجود ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے وجود سے ہی حقیقت نمودار ہوئی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم خلقت میں اول اور نبوت میں آخر تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم حقیقت کے باطن اور معرفت کے ظاہر تھے۔"

حلاج رحمۃ اللہ علیہ کے ان آثار و اقوال سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی نظر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نور قدیم کا کیا درجہ تھا۔ حلاج رحمۃ اللہ علیہ کا یہ نظریہ حلاج رحمۃ اللہ علیہ تک ہی محدود نہ رہا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ دوسرے صوفیوں نے بھی دوسرے الفاظ اور دوسرے رنگ میں اختیار کیا۔ مثلاً محی الدین ابن عربی اور عمر بن الفارض رحمۃ اللہ علیہم۔ ان دونوں کے علاوہ دوسرے صوفیاء کے ہاں بھی یہ رنگ کافی نظر آتا ہے۔

حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ اپنی مکتوب نمبر ۴۳ میں حسین بن منصور حلاج رحمۃ اللہ علیہ کے عقیدہ کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں!

"پس بعض مشائخ کے اقوال جو بظاہر شریعت حقہ کے مخالف معلوم ہوتے ہیں اور بعض لوگ انہیں توحید وجودی (جس کا تعلق علم الیقین سے ہو) پر محمول کرتے ہیں۔ جیسے ابن منصور الحلاج رحمۃ اللہ علیہ کا قول "انا الحق" اور ابو یزید

بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کا سبحانی کہنا اور اس طرح کے اور اقوال اولیٰ یہی ہے کہ انہیں توحید شہودی (جس کا تعلق عین الیقین سے ہے) پر محمول کیا جائے اور عقل و شرع کے ساتھ مخالفت کو دور کیا جائے۔ کیونکہ غلبہ حال میں ماسوائے حق سبحانہ کے ہر شے ان کی نظر سے پوشیدہ تھی تو ایسے الفاظ ان سے صادر ہو گئے اور انہوں نے حق سبحانہ کے سوا کسی شے کو ثابت و موجود نہ مانا۔ ''انا الحق'' کا معنی ہے ''حق ہے میں نہیں ہوں'' جبکہ وہ اپنے آپ میں بھی نہیں دیکھتے تو اپنے آپ کو ثابت نہیں کرتے۔ یہ مطلب نہیں کہ یہ بزرگ اپنے آپ کو دیکھتا ہے اور اپنے آپ کو حق کہتا ہے یہ مفہوم تو صریح کفر ہے۔''

توحید ادیان بھی حلاج رحمۃ اللہ علیہ کا ایک نظریہ تھا۔ حلاج رحمۃ اللہ علیہ کا خیال تھا کہ تمام ادیان اپنی حقیقت کے اعتبار سے ایک ہیں۔ ان کا ''فروعات'' میں اختلاف ہے لیکن جہاں تک تعلق ہے اصل کا وہ ایک ہی ہے۔ تمام ادیان کا مرکز اور منبع خدا ہے۔ تمام ادیان خدا کے لئے ہیں۔ ہر دین سے کوئی نہ کوئی گروہ وابستہ ہے اپنی مرضی سے نہیں بلکہ کسی بالادست قوت کی مرضی سے۔ جو شخص کسی مذہب کا بطلان کرتا وہ گویا حکم لگاتا ہے کہ فلاں مذہب اس نے خود اختیار کیا اور یہ بات حلاج رحمۃ اللہ علیہ کی رائے میں مسلک قدریہ کے ذیل میں آتی ہے۔ اس کے نزدیک اس امت کے مجوس جو لوگ کہلا سکتے ہیں وہ قدریہ ہیں۔ حلاج رحمۃ اللہ علیہ کا یہ خیال بھی تھا کہ یہودیت، مسیحیت، اسلام اور دوسرے مذاہب کے نام اور القاب جدا جدا ہیں۔ علامات و آثار میں بھی اختلاف اور تغائر ہے لیکن جو مقصود اصل ہے اس میں کوئی اختلاف نہیں وہ ایک ہی ہے۔

دوسرے الفاظ میں حلاج رحمۃ اللہ علیہ کا مطلب یہ تھا کہ وہ صرف اللہ ہے جو اپنے بندوں پر مشیت نافذ کرتا ہے اور وہ صرف خدا ہی ہے جو اپنے بندوں کے بارے میں فیصلہ کرتا ہے کہ فلاں آدمی یہودی ہو، فلاں آدمی نصرانی ہو اور فلاں مسلمان کے گھر پیدا ہو۔ لہٰذا نہ کسی پر معترض ہونا چاہئے نہ کسی کے بارے میں مناظرت کرنی چاہئے کہ دین سب خدا کے

ہیں اور جو شخص جس دین کو اختیار کرتا ہے اس میں خدا کی مشیت اور مرضی شامل ہوتی ہے اور جو اختلاف مختلف ادیان میں نظر آتا ہے وہ اصلی اور جوہری اختلاف نہیں یہ صرف اسم اور مظہر کا اختلاف ہے ورنہ سچی بات تو یہ ہے کہ تمام ادیان نام کے اعتبار سے متعدد ہیں لیکن حقیقت کے اعتبار سے ایک ہیں۔ مسمی ایک ہے اسم جدا جدا ہیں۔ یہ متغائر مظاہر ایک ہی حقیقت کے ہیں۔ جس طرح حقیقت محمد یہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سلسلے میں حلاج رحمۃ اللہ علیہ کا نظریہ بعد کے دوسرے لوگوں نے قبول کیا اسی طرح وحدت ادیان کے معاملہ میں بھی حلاج رحمۃ اللہ علیہ کے نظریہ کی تائید وتقلید بعد کے دوسرے اکابر، صوفیاء اور علماء نے کی۔ شعراء نے اپنے اشعار میں اور مصنفین نے اپنی تصنیفات میں اس نظریہ کو سراہا اور اسے تسلیم کر کے اس کی توثیق اور تائید کی۔ اس نظریہ نے اسلام کی حیات روحیہ کی تاریخ پر گہرا اور دیرپا اثر ڈالا۔

عقیدہ حلول کے متعلق ایک غلط فہمی

حضرت حلاج رحمۃ اللہ علیہ کا نظریہ حلول جس انداز فکر سے عوام الناس میں مشہور ہوا یا یوں کہہ لیجئے کہ تشہیر کیا گیا، اس سے تو اچھے بھلے انسان کا ایمان بھی حد متزلزل پار کر جاتا ہے اور شہادت حلاج رحمۃ اللہ علیہ کے ضمن میں اسی انداز تشہیر نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ جہاں تک میری فکر میرے علم ناتمام سے نتائج اخذ کرتی ہے تو مجھے کچھ کہنے میں عار نہیں کہ جس کسی نے بھی حضرت حلاج رحمۃ اللہ علیہ کے نظریہ کی تہہ کو پالیا اس نے درحقیقت اس آیہ مُبارکہ کی شان نزول کو پالیا۔

فرمان باری تعالیٰ ہے۔

''ہم تمہاری شہ رگ سے بھی نزدیک ہیں۔'' (ق:16)

قصہ مختصر عقل ناقص سے پس پردہ جو حقیقت پنہاں ہے وہ یہی ہے کہ عام لوگ بلکہ بعض علماء وصوفیاء بھی یہ سمجھنے سے قاصر رہے ہیں کہ وحدت الوجود اور نظریہ حلول میں بنیادی فرق کیا ہے اور یہ کہ آیا فرق ہے بھی یا نہیں۔ مثلاً بعض اوقات جب کسی شخص کا فہم کسی معاملے کا

مکمل ادراک کرنے سے قاصر ہوتا ہے تو وہ اپنے نتائج کی بنیاد محض قیاس آرائی پر قائم کرتا ہے کہ جس سے وہ اپنے اردگرد ایسے لوگوں کا ہجوم پیدا کرنے میں کامیاب ہوتا ہے کہ جو اس کی مانند قیاس کی زندگی بسر کرتے ہیں اور چونکہ علم ایک نقطہ پر مرکوز رہتا ہے اس لئے بے حقیقت تفاصیل کے جھرمٹ میں گم رہتا ہے۔ اب ایک ایسی دیدۂ روشن چاہئے کہ جو نقطہ کو بطریق احسن ڈھونڈ سکے۔ چونکہ ایسے افراد کی تعداد کم ہے کہ جو ایسی بیناء روشن رکھتے ہیں۔ اس بناء پر اکثر قیاسی اذہان اپنی بے علمی اور کثرت ہجوم کی بناء پر Democracy کو بنیاد بناتے ہیں اس باعلم اقلیت کو ناقص قرار دیتے ہیں۔ اس اقلیت سے جن چند افراد نے اپنا لوہا بہرکیف منوالیا ان میں حضرت عمر بن الفارض، حضرت محی الدین ابن العربی، حضرت جلال الدین رومی، حضرت فرید الدین عطار اور حضرت علامہ محمد اقبال رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہم کے نام سرفہرست ہیں۔ یہ وہ ہستیاں ہیں جو حضرت حلاج رحمۃ اللہ علیہ کو ''شہید حق'' تصور کرتی ہیں اور حضرت حلاج رحمۃ اللہ علیہ ہی کی تعلیمات کو بلواسطہ یا بالواسطہ اپنے کام میں آراستہ پیراستہ کئے رکھا۔

جیسا کہ علامہ محمد اقبال رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

''خودی یا انا، ذات انسانی میں اپنے کمال کو پہنچ جاتی ہے اور وجود حقیقی وہی ہے جسے اپنی حقیقت کا شعور ہو۔ جتنا کسی کا شعور ذات گہرا ہے اتنا ہی مدارج حقیقت میں اس کا درجہ بلند ہے۔'' (تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ، ص ۱۱۰)

پھر علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ مزید فرماتے ہیں۔

''یہ صرف تصوف تھا جس نے کوشش کی کہ عبادت اور ریاضت کے ذریعے واردت باطن کی وحدت تک پہنچے۔ قرآن پاک کے نزدیک یہ واردات علم کا ایک سرچشمہ ہیں جن میں عالم تاریخ اور عالم فطرت کا اضافہ کر لینا چاہئے اور ان واردات کی نشوونما حضرت حلاج رحمۃ اللہ علیہ کے نعرہ ''انا الحق'' میں اپنے معراج کمال کو پہنچ گئی۔''

پھر علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ انسان کے اپنے شعور کی لاعلمی کا اعتراف ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

''ابن خلدون نے محسوس کرلیا تھا کہ ان مراتب کی تخلیق کے لئے ایسے منہاج علم کی ضرورت ہے جو فی الواقع موثر ہو۔ جدید نفسیات کو بھی اگر چہ اس قسم کے کسی منہاج کی ضرورت کا اعتراف ہے۔ لیکن اس کا قدم ابھی اس انکشاف سے آگے نہیں بڑھا کہ صوفیانہ مراتب شعور کی خصوصیات کیا ہیں؟ ہمارے پاس کوئی ایسا ذریعہ نہیں جس سے اس قسم کے احوال اور مشاہدات کی تحقیق علمی نہج پر کی جائے۔ جیسے حضرت حلاج رحمۃ اللہ علیہ کو پیش آئے جو علم کا ایک سرچشمہ ہیں۔ لیکن ہم ان سے کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکے۔'' (صفحہ نمبر ۱۴۵)

کیمرج یونیورسٹی کے لیکچرار A.E.Affifi اپنی تصنیف The Mystical Philosophy of Muhyuci Din Ibnul Arabi میں تحریر کرتے ہیں۔

"The Hallajian elemest in particular is predominant in Ibnul - Arabi's view about One and the Many and Hallaj seems to have paved the way for Ibnul - Arabi's Pantheistic doctrine-"

حضرت محی الدین ابن العربی رحمۃ اللہ علیہ کا اصل مسلک ''وحدت الوجود'' تھا۔ بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ یہ نظریہ انہی کا پیش کردہ تھا۔ لیکن ان کا یہ مسلک حضرت حلاج رحمۃ اللہ علیہ کے نظریہ حلول ہی سے اثر حاصل کرتا ہے کہ جس کو ابن تیمیہ بھی حلول مطلق کہہ کر پکارتے ہیں۔ بلکہ خود مولانا اشرف علی تھانوی نے بھی اپنی ایک تصنیف میں حضرت ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ کی تعلیمات کو صحیح قرار دیا۔ ملاحظہ ہو کتاب ''تنبیہ الظر فی'' از مولانا اشرف علی تھانوی۔

خود حضرت ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

"وجود واحد ہے اور مخلوقات کا وجود عین وجود خالق ہے۔ حقیقت کے اعتبار سے
خالق اور مخلوق میں کوئی فرق نہیں ہے جو شخص خالق اور مخلوق کے وجود میں امتیاز کا
قائل ہے وہ ادراک حقیقت سے نا آشنا ہے۔ جو خود اس ذات کے اندر موجود
ہے۔" (الفتوحات مکیہ)

کتاب اللہ میں ارشاد ہوتا ہے۔

"تم جدھر اپنا منہ پھیرو وہیں وجہ اللہ۔" (بقرہ:115)

مندرجہ بالا آیہ کریمہ سے ہم یہ نتیجہ اخذ نہیں کر سکتے ہیں کہ انسان کو ہر جانب اور ہر شے کے حضور سجدہ کرنا مقصود ہے۔ کیونکہ اس میں "وجہ اللہ" کا لفظ آیا ہے۔ بلکہ اس سے مراد مطلقیت ہے۔ جس بناء پر یہ کہا گیا ہے کہ اللہ زمین و آسمان کا نور ہے اور اگر "نور اور وجہ اللہ" کو اس کی حقیقت ثابت کر کے ہر جانب سجدہ کروانا مقصود ہوتا تو وہ ذات باری تعالیٰ فقط ایک سمت یعنی خانہ کعبہ کا تعین نہ کرتی۔ جو یہ ثابت کرتا ہے کہ "نور اور وجہ اللہ" سے مراد اس کی "حقیقت" نہیں۔

جیسا کہ حضرت امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ اپنی کتاب "طب جسمانی وطب روحانی" میں رقم طراز ہیں۔

"اے طالب! معلوم ہو کہ "حقیقت" کے بیان کرنے سے زبانیں عاجز ہیں
اس کی ہویت کے ادراک سے عقل قاصر ہے۔"

پھر کہتے ہیں۔

فلوجهها من وجهها قمر
و بعينها من عينها كحل

(وہ اپنے چہرہ کے لئے آپ ہی چاند ہے اور اپنی آنکھوں کے لئے آپ ہی سرمہ ہے)۔

یہی وجہ ہے کہ حضرت حلاج رحمۃ اللہ علیہ نے "انا الحق" کہتے وقت کبھی بھی خود کو

سجدہ کا اہل ثابت نہ کیا۔ کیونکہ وہ اس امر سے بخوبی واقفیت رکھتے تھے کہ وہ نور الٰہی (مطلقیت) کے حامل ہیں نہ کہ حقیقت الٰہی کے۔

اختصار کے ساتھ حضرت حلاج رحمۃ اللہ علیہ کا نظریہ درحقیقت وحدت الوجود ہی کی تفصیل ہے کہ جس کو احمقوں نے حلول کا نام دے دیا اور یہ حقیقت بعض حلقہ احباب کو چونکا دینے والی ہے۔ اس ضمن میں سب سے پہلے جو چیز وضاحت طلب ہے وہ یہ کہ "ذات" سے کیا مراد ہے؟ ذات دو چیزوں کے مجموعے کا نام ہے۔ ایک "حقیقت" اور دوسری "مطلقیت" غلط فہمی اسی مقام سے جنم لیتی ہے کہ جب لوگ ذات اور حقیقت کو ایک ہی معنوں میں تعبیر کرتے ہیں۔ کسی بھی جسم عنصری کی ذات سے اگر اس کی مطلقیت خارج کر دی جائے تو جو باقی بچے گا اسے میں بیان کرنے سے قاصر ہوں اور نہ کوئی دوسرا بیان کر سکتا ہے، سوائے اللہ جل شانہ کے۔ اور یہی میری حقیقت ہوگی۔ پھر جو قوت ادراک مجھ سے علیحدہ کی گئی وہ میری مطلقیت ہوگی۔ انسان کی حقیقت بلاشبہ نور الٰہی ہے جو کہ اس ذات تعالیٰ کی مطلقیت ہے اور اللہ کی مطلقیت بھی اس کی حقیقت (جس سے فقط وہی باخبر ہے) کی مانند لامحدود ہے اور لازماں ولامکاں سے تعلق رکھتی ہے۔ ممکن ہے آپ کہیں کہ اس کی مطلقیت کو تو ہم جا بجا مختلف صورتوں اور مورتوں میں دیکھتے ہیں۔ پھر وہ لامکاں ولازماں کیسے ہوئی۔ اس کی مکمل تفصیل "تصور ذات تعالیٰ" کے باب میں بیان ہوگی۔ لیکن یہاں فقط یہ مثال دوں گا کہ فرض کیجئے کہ ایک انسان کراماتی طور پر ایک ہی وقت میں اور پھر مختلف اوقات میں بھی کئی مقامات پر ظہور پذیر ہوتا ہے تو آپ یہ بیان کرنے سے عاری ہیں کہ اس کا اصل مکان کون سا ہے اور وہ کس زمانہ سے تعلق رکھتا ہے۔ جیسا کہ حضرت خضر علیہ السلام اور حضرت امام مہدی علیہ السلام۔ تو اس صورت میں آپ اسے لازماں ولامکاں سے تشبیہ دیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ باطن انسان کو بھی لامحدود کہا جاتا ہے۔ دوسری جانب اس ذات تعالیٰ کی حقیقت احاطہ بیان میں نہیں۔ اس سے متعلق جو چیز کسی بھی انداز میں قابل بیان ہے وہ مطلقیت ہے۔ اس کے لئے جو چیز احاطہ بیان سے باہر ہے تو اس کا نظریہ حلول میں

بھی آنا ناممکن ہے اور جو چیز قابل بیان ہے تو اس پر حلول کو لاگو کرنے میں بھی کوئی دریغ نہیں۔ صوفیاء اپنی ریاضت سے اپنی حقیقت کو فقط محسوس کر سکتے ہیں لیکن اسے بیان نہیں کر سکتے۔ جس طرح درد محسوس کی جاتی ہے لیکن اس کی کیفیت بیان سے باہر ہے۔ کیونکہ حقیقت فقط اس صورت میں جانی جاتی ہے کہ جب انسان اپنی تمام صفات سے بے خبر ہو جائے۔ اس بناء پر ہمیں یہ معلوم ہوا کہ انسان کی حقیقت ''نور'' ہے تو وہ صوفیاء کے بیان کی وجہ سے نہیں بلکہ خود اللہ تبارک وتعالیٰ کے بیان سے ہے۔

''پھر جب میں اسے ٹھیک بنالوں اور اس میں اپنی روح پھونکوں تو تم اس کے لئے سجدہ میں گرنا۔'' (ص:72)

یہاں روح سے مراد اس کا نور ہے جو کہ اس کی مطلقیت ہے اور یہ بھی حقیقت کی مانند مقام احدیت رکھتی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ حقیقت کو اس نے محشر تک کے لئے پنہاں رکھا اور ''مطلقیت'' کے لئے ریاضت ومجاہدہ کو کنجی بنا دیا۔ باقی حقائق کو بیان کرنا تو فقط اللہ کی صفت ہے۔ حضرت حلاج رحمۃ اللہ علیہ جو تصور پیش کرتے ہیں (فقط ضرورت مضمون کے تحت لفظ حلول کا استعمال کیا جا رہا ہے)۔ ان کی تعلیمات سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ حلول مطلقیت کی بات کرتے ہین نہ کہ حلول حقیقت کی۔ کم فہم لوگوں نے ان کے اس عقیدہ کو ''حقیقت'' سے وابستہ کر دیا ہے اور بغیر سوچے سمجھے اس کی تشہیر کی کہ جس بناء پر وہ تنقید کا نشانہ بنے۔ ورنہ اگر کوئی حلول حقیقت کی بات کرے تو وہ صریحاً شرک ہے اور حضرت حلاج رحمۃ اللہ علیہ کا حلول اس شرک سے مبراء ہے۔

مزید وضاحت کے لئے ملاحظہ ہو ارشاد ربانی۔

''خدا تو سارے آسمان اور زمین کا نور ہے اس کے نور کی مثال ایسی ہے جیسے ایک طاق ہے جس میں ایک روشن چراغ شیشے کی قندیل میں ہو۔ قندیل گویا ایک جگمگاتا ہوا روشن ستارہ۔'' (نور:۳۵)

پھر اسی آیت کے آخر میں ارشاد ہوتا ہے۔

''خدا اپنے نور کی طرف جسے چاہتا ہے ہدایت کرتا ہے۔''

پھر اس سے اگلی آیت نمبر ۳۶ میں آتا ہے۔

''(اور وہ قندیل) ان کے گھروں میں (روشن ہے)۔جنہیں بلند کرنے کا حکم اللہ نے دیا ہے''۔

مندرجہ بالا آیات میں غور طلب نقطہ یہ ہے کہ یہاں ''نور'' سے مراد اس ذات اقدس کی ''مطلقیت'' ہے نہ کہ ''حقیقت''۔ جیسا کہ بعض لوگ تصور کرتے ہیں اور یہ پہلی آیہ مبارکہ سے عیاں ہے کہ وہ ''مثل روشن چراغ'' ہے اور طاق میں ہے۔یعنی بند ہے۔ اس چراغ کی ''مطلقیت'' نور ہے۔ اگر کوئی پوچھے کہ شعلے کی حقیقت کیا ہے؟ تو ہم یہ بیان کرنے سے عاری ہیں کیونکہ ہم فقط اس کی مطلقیت سے اس کو پہچانتے ہیں کہ وہ روشن کرتا ہے یا گرم ہے۔لیکن اس کی ''حقیقت کیا ہے یہ احاطہ بیان میں نہیں۔ اس طرح اس ذات اقدس کے چراغ کی حقیقت کوئی نہیں بیان کر پایا۔ کیونکہ وہ ایک طاق میں ہے۔

جیسا کہ حضور خاتم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے۔

''میں اس کو اس حد تک نہ جان سکا کہ جس کا میں خواہش مند تھا۔''

یہی وجہ ہے کہ مندرجہ بالا آیات کے بیان کے بعد تمام سورہ اس ذات کی قدرت بیان کرتی ہے نہ کہ اس کی حقیقت۔ انسان جس چیز سے قریب تر ہوتا ہے وہ اس کی مطلقیت ہوتی ہے کہ جسے نور سے تعبیر کیا گیا۔ جیسا کہ دوسری آیت میں بیان ہے کہ ''خدا اپنے نور کی طرف'' یہ نہیں کہا کہ ''نور اپنے نور کی طرف۔'' پھر تیسری آیت میں صریحاً ارشاد ہے کہ ''وہ قندیل روشن ہے'' نہ کہ لفظ چراغ استعمال کیا گیا۔ کیونکہ انسان کی رسائی فقط اس ظاہر قندیل تک ممکن ہے کہ جس کے باطن میں حقیقت الٰہی (چراغ) جلوہ گر ہے۔ اس بنا پر حلول اس نور یا روشنی سے تو متعلق ہوسکتا ہے لیکن باطن قندیل سے حلول ناممکن ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جس وقت جبل طور پر پھٹ پڑا تو وہ درحقیقت اس ذات اقدس کی تجلی (نور) تھی نہ کہ اس کی حقیقت۔

جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے۔

''تو وہ موسیٰ سے اس سے بھی بڑا سوال کر چکے کہ بولے ہمیں اللہ کو علانیہ دکھا دو تو انہیں ایک زوردار بجلی نے آلیا''۔(نساء:153)

یا یوں کہہ لیجئے کہ اس ذات اقدس کی ''مطلقیت کل'' کہ جس کی ایک جھلک کے سامنے طور کی مطلقیت یعنی پختگی ریزہ ریزہ ہو کر رہ گئی۔ یہ اس طرح ہے کہ جس طرح ایک وزنی پتھر کو کنکر نما پر زور سے مارا جائے تو وہ ریزہ ریزہ ہو جائے گا۔ اس ضمن میں دوسری دلیل یہ ہے کہ اگر کہیں دو حقیقتوں کا حلول ممکن ہو تو اس کی مطلقیت کے ساتھ ساتھ حقیقت بھی ایک نیا روپ دھار کر سامنے آتی ہے۔ جیسے ہائیڈروجن (Hydrogen) اور آکسیجن (Oxygen) کو ملا دیا جائے تو پانی وجود میں آئے گا۔ جس کی مطلقیت تو بدل ہی گئی لیکن ساتھ ساتھ حقیقت بھی بدل گئی۔ اس طرح اگر حقیقت انسانی اور حقیقت الٰہی کا حلول ممکن ہوتا تو اس سے کوئی نئی ''ہیئت'' جنم لیتی کہ جس کی مطلقیت بھی ''مطلقیت انسانی والٰہی'' سے فرق ہوتی۔ اور یہ اس ذات اقدس کے معاملے میں ناممکن ہے۔ اس بناء پر جو ''انا الحق'' بلند ہوا تو وہ بھی اس بناء پر کہ حضرت حلاج رحمۃ اللہ علیہ نے اس ذات کی مکمل مطلقیت کا احاطہ یا اندازہ کر لیا اور یہ انعام ہر کسی کے حصے میں آنے سے قاصر ہے۔ کیونکہ یہ ایسا امر آہن ہے کہ پہاڑ کو سرمہ بنا ڈالے۔

نوٹ: (مطالعہ کتاب کے دوران جہاں بھی ''نور'' کا لفظ آئے تو اس سے مراد مطلقیت لیا جائے۔ علاوہ ازیں مندرجہ بالا مضمون کے پیش نظر ''ذات'' اور ''حقیقت'' کا فرق بھی ذہن نشین رہے)۔

ڈاکٹر نکلسن نے اپنی آخری عمر کی کتابوں میں سے ایک کتاب Idea of Personality In Sufism میں لکھا ہے۔

''اگرچہ حضرت حلاج رحمۃ اللہ علیہ نے ''انا الحق'' کا نعرہ لگایا جس کا مطلب یہ ہے کہ ''میں حق ہوں''۔ لیکن وہ بھی نہایت پرزور الفاظ میں اعلان کرتے ہیں

کہ اللہ تعالیٰ وراء الوریٰ ہے اور خالق اور مخلوق ایک نہیں ہو سکتے۔''

ڈاکٹر نکلسن مزید لکھتے ہیں۔

''حضرت حلاج رحمۃ اللہ علیہ کے ''انا الحق'' کا مطلب یہ نہ تھا کہ میں خدا ہوں بلکہ یہ تھا کہ میں حق ہوں، یعنی سچ (Ceartive Truth) ہوں۔ یہ نظریہ ہمہ اوست Pantheism کے سراسر خلاف ہے۔ کیونکہ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ انسان خدا کا مظہر ہے۔ یہ نظریہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ان کلمات کے تقریباً مطابق ہے جس میں آپ نے فرمایا کہ جس نے مجھے دیکھا باپ (خدا) کو دیکھا۔ لیکن یہ نظریہ جسے حلول Incamation کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اسلام میں جڑ نہ پکڑ سکا۔ اسے حضرت حلاج رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے مریدین نے ہی ختم کر دیا تھا۔ صوفیاء کا بیان ہے کہ حضرت حلاج رحمۃ اللہ علیہ کو اس لئے شہید نہیں کیا گیا کہ وہ حلولی تھے۔ بلکہ اس لئے کہ انہوں نے حق تعالیٰ کا راز فاش کر دیا۔''

بعض دفعہ جوش استغراق میں آ کر حضرت حلاج رحمۃ اللہ علیہ کی زبان سے ایسے فقرے نکل جاتے تھے جن سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ وہ اپنے آپ کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا دوست کہتے تھے۔ اس سے عیسائی مصنفین بہت خوش ہوتے ہیں اور فوراً یہ نظریہ قائم کر لیتے ہیں کہ انہوں نے عیسائیت سے تصوف حاصل کیا۔ لیکن یہ نادان یہ نہیں سمجھتے کہ حضرت حلاج رحمۃ اللہ علیہ نے تو شیطان اور فرعون کو بھی اپنا دوست کہا ہے۔ کیونکہ حضرت حلاج رحمۃ اللہ علیہ کی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام۔ فرعون اور ابلیس نے جان دے دی لیکن اپنی بات سے نہ ہٹے۔

ڈاکٹر نکلسن کتاب مذکور میں آگے چل کر حلاج رحمۃ اللہ علیہ کی پابندی شریعت بیان کرتے ہیں۔

''جب حسین بن منصور حلاج رحمۃ اللہ علیہ کو پھانسی دینے کے لئے لایا گیا تو

انہوں نے دار درسن کو دیکھ کر قہقہہ لگایا اور اس زور سے ہنسے کہ آنکھوں سے پانی بہنے لگا۔ اس کے بعد انہوں نے لوگوں کی طرف دیکھا اور اپنے پیر بھائی اور دوست حضرت ابوبکر شبلی رحمۃ اللہ علیہ کو دیکھ کر دریافت کیا کہ آپ کے پاس مصلیٰ ہے؟ انہوں نے جواب دیا ہاں یا شیخ۔ انہوں نے کہا اسے بچھا دو۔ اس کے بعد حضرت حلاج رحمۃ اللہ علیہ نے آگے بڑھ کر دو رکعت نماز ادا کی۔"

حضرت شبلی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں ان کے پاس کھڑا تھا۔ پہلی رکعت میں سورۂ فاتحہ کے بعد انہوں نے یہ آیت پڑھی "**کل نفس ذائقة الموت ...... الیٰ آخر**" دوسری رکعت میں بعد فاتحہ یہ آیت پڑھی وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ ...... **الیٰ آخر** "نماز کے بعد انہوں نے دعا مانگی جس کا مندرجہ ذیل حصہ مجھے یاد ہے۔

یا اللہ میری التجا ہے کہ تو نے مجھے اپنے رحم و کرم سے وہ دولت دیدار عطا فرمائی جو دوسرے لوگوں کی آنکھوں سے پوشیدہ ہے اور جو شکل و صورت سے پاک و مبراء ہے۔ تو نے مجھ پر اپنی ذات و صفات کے وہ اسرار و رموز حلال فرمائے جو دوسروں کی آنکھوں کے لئے حرام ہیں۔ یا اللہ اپنے ان بندوں کو معاف کر جو تیرے دین کی خاطر اور تیری خوشنودی حاصل کرنے کے لئے مجھے قتل کرنے کے ارادے سے جمع ہوئے ہیں۔ کیونکہ جو دولت تو نے مجھے عطا فرمائی ہے اگر ان کو عطا فرماتا تو وہ یہ کام نہ کرتے اور اگر تو مجھ سے وہ اسرار چھپا رکھتا جو ان سے چھپا رکھے ہیں تو میں اس ابتلاء میں گرفتار نہ ہوتا۔ "**سبحانک علیٰ ماتفعل و سبحانک علیٰ ما تشاء**"

اس کے بعد وہ خاموش ہو کر مراقب ہو گئے۔ حتیٰ کہ ابو حارث جلاد نے آگے بڑھ کر آپ کے منہ پر مکا مارا۔ اس سے آپ کی ناک ٹوٹ گئی اور خون کا فوارہ جاری ہو گیا۔ یہ دیکھ کر حضرت شبلی رحمۃ اللہ علیہ نے نعرہ مار کر اپنے کپڑے پھاڑ دیئے اور بے ہوش ہو کر گر پڑے۔ آپ کے شاگرد حضرت ابوالحسین واسطی رحمۃ اللہ علیہ اور دوسرے اکابر صوفیاء جو وہاں موجود تھے ان کا بھی یہی حال ہوا اور قریب تھا کہ ملک میں فساد پیدا ہو جائے۔

ایک اور موقع پر آپ کے وہی شاگرد کہتے ہیں کہ میں آپ کے دولت خانہ پر حاضر ہوا۔ آپ نے مجھے اندر آنے کا حکم دیا میں اندر جا کر آپ کے سامنے بیٹھ گیا۔ آپ نے فرمایا! اے میرے بیٹے کچھ لوگ یہ شہادت دیتے ہیں کہ میں ولی اللہ ہوں اور کچھ یہ شہادت دیتے ہیں کہ میں کافر ہوں۔ وہ لوگ جو مجھے کافر کہتے ہیں وہ مجھے اور اللہ کو ان لوگوں سے زیادہ عزیز ہیں جو مجھے ولی اللہ کہتے ہیں۔ کیونکہ وہ اسلام کی محبت کی وجہ سے مجھے کافر کہتے ہیں۔ لہٰذا جو شخص اسلام کی محبت کی وجہ سے مجھے کافر کہتا ہے وہ مجھے اور میرے رب کے نزدیک زیادہ عزیز ہے۔''

ڈاکٹر نکلسن کتاب مذکور میں آگے چل کر لکھتے ہیں کہ ایک دفعہ شیخ منصور ابن حلاج رحمۃ اللہ علیہ، خلیفہ منصور کی مسجد چلے گئے اور لوگوں کو پکار کر کہا کہ آؤ میں تمہیں ایک بات بتاتا ہوں۔ یہ سن کر بے شمار لوگ آپ کے اردگرد جمع ہو گئے۔ ان میں سے کچھ آپ سے محبت کرتے تھے اور کچھ آپ سے نفرت کرتے تھے۔ آپ نے فرمایا! اللہ تعالیٰ نے میرا خون تم پر حلال کیا ہے۔ پس مجھے قتل کر ڈالو۔ اس پر ایک بزرگ نے جن کا نام عبدالودود بن سعید بن عبدالغنی تھا آگے بڑھ کر کہا کہ یا شیخ! ہم ایسے شخص کو کس طرح قتل کر سکتے ہیں جو نماز پڑھتا ہے، روزے رکھتا ہے اور قرآن مجید کی تلاوت کرتا ہے۔ حضرت حلاج رحمۃ اللہ علیہ نے جواب دیا کہ نماز پڑھنے، روزے رکھنے اور تلاوت کلام پاک کرنے سے قتل ممنوع نہیں ہو جاتا۔ مجھے قتل کر دو تاکہ تم کو انعام ملے اور میں آرام کروں۔ اس سے تم غازی بن جاؤ گے اور میں شہید۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ مسلمان جو حضرت حلاج رحمۃ اللہ علیہ کو غیر شرعی کہتے ہیں اور وہ غیر مسلم جو الزام لگاتے ہیں کہ صوفیاء نے جب اسلام کو روحانیت سے خالی دیکھا تو دوسرے مذاہب سے اسے حاصل کر کے اسلام سے منحرف ہو گئے، سراسر لغو اور بے بنیاد ہے اور تعصب کا نتیجہ ہے۔ یہاں آپ نے خود دیکھ لیا کہ ڈاکٹر نکلسن جیسے محقق جو اوائل عمر میں مواد کی کمی کی وجہ سے تصوف پر اعتراضات کی بوچھاڑ کرنے میں پیش پیش تھے۔ اب کس طرح مزید ریسرچ کی بدولت اس حقیقت کا اعتراف کر رہے ہیں کہ حضرت حلاج

رحمۃ اللہ علیہ جیسے ''انا الحق'' کا نعرہ لگانے والے صوفی نے مرتے دم تک نماز، روزہ اور تلاوت کلام پاک کی سختی سے پابندی کی اور شریعت اسلامی کو قائم رکھا۔

ابن تیمیہ اور اعتراضات

عقیدہ حلول سے متعلق ہم نے جس غلط فہمی کا ذکر کیا اس کے اصل روح رواں ابن تیمیہ ہیں کہ جو خود کو ایک اصلاحی تحریک کا بانی قرار دیتے ہیں۔ لیکن حقیقت کچھ یہ ہے کہ جس کا ذکر Refomatory Theory اس شور وغل سے کرتے ہیں وہ محض بتان وہم وگمان ہے۔ کیونکہ Reformation کی بجائے ایک قسم کی Retributive Theory پر کاربند رہے۔ جس کے مدمقابل کئی صوفیاء نے حقیقی معنوں میں Preventive Theories پیش کیں۔ لیکن صورت حال کچھ ایسی ہو چکی تھی کہ جیسے پرسکون تالاب میں کوئی منچلا کنکر پھینکتا ہے تو اس سے چھوٹی چھوٹی لہریں پیدا ہوتی ہیں کہ جو پھیلتی پھیلتی کناروں سے جالگتی ہیں اور سوئے ہوئے مگرمچھوں کو کسی کی موجودگی کا احساس دلاتی ہیں اور اس طرح سے اس تالاب کا سکون غارت ہوتا ہے۔ ابن تیمیہ کے اس منچلے پن نے تاریخ کا سکون غارت کر دیا اور امت مسلمہ آج بھی اس کا خمیازہ بھگت رہی ہے اور کئی ایسے منچلے پیدا ہو چکے ہیں کہ جو اپنی حقیقت کی پہچان خواہ منفی اثرات ہی کیوں نہ رکھتی ہو پرسکون تالاب میں نقل فعل کرتے ہوئے منواتے ہیں۔ حضرت حلاج رحمۃ اللہ علیہ سے متعلق اعتراضات پیش کرنے سے قبل ابن بطوطہ جو ایک مشہور سیاح ہیں ان کی رائے سنتے جائیے۔

ابن بطوطہ لکھتے ہیں کہ جب میں دمشق پہنچا تو مجھے امام ابن تیمیہ کی خدمت میں حاضر ہونے کا شوق ہوا۔ چنانچہ میں آپ کی مسجد میں گیا جہاں آپ ممبر پر کھڑے تقریر کر رہے تھے۔ موضوع گفتگو یہ تھا کہ آخر شب اللہ تعالیٰ پہلے آسمان پر تشریف لا کر فرماتے ہیں کہ کوئی ہے جو مجھ سے کوئی چیز طلب کرے تا کہ میں اسے عطا کروں۔ اس پر ایک شخص نے سوال کیا کہ اللہ تعالیٰ کس طرح پہلے آسمان پر اتر آتے ہیں؟ امام صاحب نے ممبر سے نیچے اتر کر فرمایا کہ جس طرح میں اتر آیا ہوں اسی طرح وہ بھی اتر آتے ہیں۔ ابن بطوطہ کہتے

ہیں کہ یہ بات دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی اور میں سمجھ گیا کہ اللہ تعالیٰ نے امام صاحب کو عقل سے زیادہ علم دیا ہے کیونکہ داناؤں کا مقولہ ہے کہ یک من علم رادہ من عقل باید (ایک من علم کے لئے دس من عقل کی ضرورت ہوتی ہے)۔ بہرحال یہ رائے ابن بطوطہ کی ہے ہم تو چھوٹے منہ سے بڑی بات نہیں نکال سکتے۔ اسی طرح امام موصوف نے یہ آیہ ''الرحمٰن علیٰ العرش استویٰ'' (رحمٰن عرش پر مقیم ہے) کے وہ معنی نکالے جو قرآن مجید کی دس دوسری آیات کے خلاف ہیں اور ذات تعالیٰ کو زمان کا پابند کردیا (نعوذ باللہ)۔ یہ مفہوم امام صاحب نے اس لئے لیا کہ نظریہ حلول کی تردید ہو سکے جو بقول ان کے مسئلہ وحدت الوجود سے لازم آتا ہے۔ حالانکہ کئی صوفیاء اور ہم نے بھی یہ واضح کیا ہے کہ لفظ حلول تو امام صاحب کا خود کا تراشا ہوا ہے۔ ورنہ وہ تو مقام فناء تھا کہ جس پر حضرت حلاج رحمۃ اللہ علیہ فائز تھے۔

جیسا کہ خود حضرت ابن العربی رحمۃ اللہ علیہ بار بار کہہ چکے ہیں۔

العبد عبد و ان تعرج

و الرب رب و ان تنزل

((یعنی) عبد، عبد ہے خواہ کتنا عروج کرے اور رب، رب ہے خواہ وہ کتنا نزول کرے)۔

اگر امام موصوف ٹھنڈے دل سے غور کرتے اور حضرت ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ نے جو تصریحات اور تشریحات اپنی کتاب ''فتوحات مکیہ'' میں کی ہیں ان کا مطالعہ کرتے تو نظریہ حضرت ابن عربی اور نظریہ حضرت حلاج رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہما سے متعلق تمام غلط فہمیوں کا ازالہ آسان تھا۔ جس طرح ایک شاعر کا کلام یا ایک مصنف کی کتاب اس کی صفت شاعری اور صفت تصنیف کا مظہر ہے اسی طرح کائنات بھی حق تعالیٰ کی صفت خلق کی مظہر ہے۔ اگر آپ صفت اور موصوف کو ایک نہ سمجھیں تو کائنات حق تعالیٰ کی غیر ہے عین نہیں۔ بس حضرت حلاج رحمۃ اللہ علیہ سے بھی یہی مراد تھا۔ یہ نقطہ نگاہ یا اعتبار کا فرق ہے حقیقت میں

اس مسئلہ میں کوئی الجھن نہیں ہے۔ پھر جب حضرت حسین بن منصور حلاج رحمۃ اللہ علیہ نے نعرہ ''انا الحق'' لگایا اور حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ نے سبحانی ما اعظم شانی (میں پاک ہوں اور میری شان بلند ہے) تو امام صاحب کو خیال ہوا کہ یہ حلول ہے کیونکہ عیسائی مذہب کے لوگوں کا یہی عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ حضرت عیسیٰ علیہ السلام میں اتر آئے تھے۔ اسی طرح ہندوؤں کا بھی یہی عقیدہ ہے کہ رام اور کرشن اللہ تعالیٰ کے اوتار تھے۔ یہ صاف اور صریحی حلول ہے جو کفر ہے۔ لیکن حضرت حلاج رحمۃ اللہ علیہ نے جب ''انا الحق'' کہا اور حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ نے جب سبحانی کا نعرہ لگایا تو اس سے حلول مراد نہ تھا بلکہ ہوا یہ تھا کہ ان کو ذات حق میں فناء کا مقام حاصل ہو چکا تھا۔ فناء سے مراد حلول نہیں بلکہ یہ ہے کہ سالک اپنی ہستی کو ذات حق میں گم کر دیتا ہے اور محویت اور استغراق کے غلبہ سے مغلوب ہو کر اس کی زبان سے اس قسم کے کلمات نکل جاتے ہیں۔ چنانچہ جب حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کو ان کے مریدین بتاتے تھے کہ آپ نے عالم استغراق کے غلبہ سے مغلوب ہو کر یہ کلمات کہے تو آپ پشیمان ہوتے تھے۔ اس لئے آپ نے اپنے مریدین کو حکم دے دیا تھا کہ اگر میں پھر یہ کلمات کہوں تو مجھے قتل کر دینا۔ لیکن جب وہ ان کو قتل کرنا چاہتے تھے تو چھریاں خود ان کی اپنی طرف مڑ جاتی تھیں اور حضرت شیخ کو کوئی گزند نہ پہنچتا تھا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ کو خود اس بات کا احساس تھا کہ جو کچھ کہا ہے غلط اور غیر شرع ہے۔

امام موصوف کے ان شبہات کی بناء پر یورپ کے اکثر مصنفین نے حضرت حسین ابن منصور حلاج رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کے ان کلمات کے یہی معنی نکالے ہیں کہ وہ حلول کے قائل تھے اور چونکہ حلول عیسائی اور ہندو مذہب کا عقیدہ ہے۔ اس لئے وہ ان مذاہب کے خوشہ چیں تھے اور روحانیت انہوں نے ان مذاہب سے حاصل کی کیونکہ اسلام روحانیت سے خالی تھا۔ یہ غلط فہمی ان کلمات سکر سے پیدا ہوئی۔ غیر تو غیر خود مسلم مشائخ نے بھی اس قسم کے پیچیدہ کلام سے اپنے مریدین کو محفوظ رکھنے کی کوشش کی۔

حضرت شیخ شہاب الدین عمر سہروردی، حضرت ابن عربی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہما کے ہم عصر تھے۔ آپ کے اصحاب ومریدین نے جب حضرت شیخ سے حضرت ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق دریافت کیا تو آپ نے فرمایا! ''یہ مرد کافر ہے۔'' کچھ عرصہ کے بعد جب ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ کا وصال ہوا تو حضرت شیخ نے نعرہ مارا اور فرمایا کہ آہ آج زمانے کا قطب چل بسا۔ اس پر آپ کے اصحاب نے عرض کیا کہ حضور اگر آپ پہلے اس کو زندیق نہ کہتے تو ہم بھی ان کی خدمت میں حاضر ہوتے۔ آپ نے فرمایا کہ اسی لئے تو میں نے ان کو زندیق کہا تا کہ تم لوگ ان کے پاس نہ جاؤ کیونکہ ان کا کلام بہت اونچا اور پیچیدہ ہے، تم فتنہ میں گرفتار ہو جاتے۔ آپ جانتے ہیں کہ حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی رحمۃ اللہ علیہ کے اصحاب کون تھے۔ حضرت غوث بہاؤالدین ذکریا ملتانی، شیخ سعدی شیرازی اور مخدوم جلال الدین بخاری اوچی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہم۔ جب ان اکابر اولیاء کو حضرت شیخ نے اس قسم کے کلمات سننے کی اجازت نہ دی تو عوام الناس کا کیا حال ہوگا۔ اس بناء پر ابن تیمیہ بھی فتنے کا شکار ہوا کہ اس نے چاہا کہ مکان میں ہاتھیوں کا آنا جانا رہے لیکن اس کے لئے دروازے بلند نہ کر پایا۔ جس بناء پر ایمان کو بھی نیست و نابود کر بیٹھا۔

قرآن وحدیث میں کسی جگہ اللہ تعالیٰ کے لئے کوئی سمت یا مکان کی قید نہیں لگائی گئی۔ صرف ایک حدیث میں یہ پایا جاتا ہے کہ ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کے لئے اوپر کی جانب اشارہ فرمایا۔ اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا مطلب یہ ہوتا کہ اللہ تعالیٰ اوپر کی جانب ہیں تو یہ بات علوم وفنون اور روزانہ تجربہ کے خلاف ہوتی۔ لیکن پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کی کوئی بات سائنس اور علوم وفنون کے خلاف نہیں ہے بشرطیکہ وہ علوم وفنون غلط ثابت ہو چکے ہوں۔ لیکن زمین کا گول ہونا اور ہوا میں معلق ہونا تو اب پایہ ثبوت کو پہنچ گیا ہے۔ کیونکہ کئی ممالک کرہ ارض پر بالکل مخالف سمت میں واقع ہیں۔ اس لئے ایشیاء والوں کے لئے جو اوپر سمت ہوگی وہ امریکہ والوں کے لئے نیچے کی سمت ہوگی اور جو امریکہ والوں کے لئے اوپر کی سمت ہے وہ ایشیاء والوں کے لئے نیچے کی سمت ہے۔ اس لئے اگر آپ ایشیا

میں بیٹھ کر یہ کہیں کہ خدا تعالیٰ اوپر کی طرف عرش پر مقیم ہے تو امریکہ والوں کے لئے وہ نیچے کی طرف ہوگی اور امریکہ میں بیٹھ کر آپ کہیں کہ اللہ تعالیٰ اوپر کی جانب عرش پر مقیم ہے تو وہ ایشیاء والوں کے لئے نیچے کی سمت ہوگی۔ اس سے ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کے لئے کوئی سمت مقرر نہیں کی جاسکتی اور جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اوپر کی جانب اشارہ فرمایا تو اس کا مطلب اللہ تعالیٰ کی الوہیت اور بلندی و مرتبہ کا ظاہر کرنا تھا۔

امام ابن تیمیہ نے یہ حدیث اس لئے اپنے استدلال کے لئے چن لی کہ آپ کو کسی اور مطلب کے لئے اللہ تعالیٰ کو کائنات سے خارج کر کے اوپر کی جانب عرش پر بٹھانا مقصود تھا۔ وہ مقصد یہ تھا کہ جو صوفیاء وحدت الوجود کا دعویٰ کرتے ہیں۔ امام صاحب کے خیال میں اس سے حلول Incarmation لازم آتا ہے اور چونکہ حلول، شریعت کے خلاف ہے اس لئے اللہ تعالیٰ کائنات سے الگ تھلگ دکھایا جائے تاکہ مسئلہ وحدت الوجود کو غلط ثابت کر کے حلول کی بندش کی جائے۔ لیکن امام موصوف کی اس غلطی سے دس اور غلطیاں سرزد ہو جاتی ہیں۔ کیونکہ اگر اللہ تعالیٰ کی ہستی کو کائنات سے خارج کر کے الگ تھلگ اور عرش پر مکین دکھایا جائے تو اس سے وہ محدود ہو جاتا ہے۔ جس کا مطلب یہ نکلتا ہے کہ یہاں نہیں وہاں ہے۔ یہ محدود کرنا نہیں تو اور کیا ہے؟ لیکن قرآن و حدیث میں اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات کو ہر جگہ غیر محدود، لا انتہاء اور بے پایاں بتایا گیا ہے۔ اس لئے امام موصوف استویٰ علی العرش کا عقیدہ جو انہوں نے وحدت الوجود اور حلول کو رد کرنے کے لئے قائم کیا تھا، قرآن و حدیث کی رو سے غلط نکلا۔ لیکن اس کے باوجود بھی امام موصوف وحدت الوجود کی تردید اور اللہ کے عرش پر مقیم ہونے پر قائم رہے۔ جس سے اللہ تعالیٰ کے لئے تجسیم یعنی جسم ہونا لازم آ گیا۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ جسم سے پاک ہیں۔ نیز اس سے اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات کا محدود ہونا بھی لازم آ گیا۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ ذات وصفات میں لامحدود ہے۔ ذات لامحدود کو محدود کرنا کفر ہے۔ امام موصوف نے جب حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے روضہ اقدس کی زیارت کو حرام قرار دیا اور اللہ تعالیٰ کو جسم کے ساتھ عرش پر بٹھا کر محدود کر دیا تو

ساری اسلامی دنیا میں ایک ہیجان مچ گیا اور ہر خاص و عام ان کے خلاف برانگیختہ ہو گیا۔ چنانچہ بادشاہ وقت نے آپ کو قید کر دیا۔ اس کے بعد ان کے جانشینوں نے ان عقائد کی ترویج جاری رکھی اور اسلامی دنیا میں اس وجہ سے بے حد تشویش اور نفاق پیدا ہوا۔ حتیٰ کہ پچھلی صدی میں جب محمد ابن عبدالوہاب نجدی نے از سرنو ابن تیمیہ کی تعلیمات کو نئے جوش وخروش سے پھیلانے کی کوشش کی تو نوبت تصادم تک پہنچ گئی۔ جس سے اسلام اور مسلمانوں کو بہت نقصان پہنچا۔ حالانکہ محمد بن عبدالوہاب کے والد اور بھائی دونوں ان عقائد کے خلاف تھے۔ یہاں تک کہ ان کے بھائی نے ان کی تردید میں ایک کتاب بھی لکھی ہے۔ ابن تیمیہ نے اسلامی دنیا کا سکون برباد کر دیا اور اس وقت سے آج تک اسلامی دنیا اس ہیجان کا شکار ہے۔

باب دوم

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

تصورذات تعالیٰ

وجودحق

اس موضوع پر الفاظ تراشی سے قبل حقیقت باری تعالیٰ کی مختصراً تشریح کر لی جائے اور "مختصر" کا لفظ اس لئے مستعمل نہیں کہ لفظوں کی ترتیب اور جامعیت کے لحاظ سے قلم کی سیاہی کم صرف ہو گی۔ بلکہ اس سے مراد وہ عقل مختصر ہے کہ جو اس ذات باری تعالیٰ کی حقیقت کا ادراک کر سکتی ہے۔ میں اور میری بساط کیا کہ ذات باری تعالیٰ کی حقیقت کو آسان الفاظ میں بیان کرنے کے لئے قلم اٹھا بیٹھا اور جب قلم بھی اٹھایا تو اس وقت قلم نے مجھ سے انتہائی تجسس سے سوال کیا کہ اے عقل ناداں! کیا میری استطاعت پر بھروسہ کرلیا ہے؟ اس معاملہ میں تو میرا آغاز ہی میری انتہاء ہے۔ جس سوچ کی فصاحت کو کامل جان کر لکھ رہا ہوں وہ سوچ بھی ایک فکر بالا میں گم ہے کہ آج اس عقل کو کیا ہو گیا ہے کہ بہک کر اتباع کر بیٹھی۔ ہاتھ کی انگلیاں بھی بدنداند ہو کر ایک سوالیہ نشان لئے میرے سامنے احتجاج کرتی ہیں۔

مندرجہ بالا تمام کیفیات کے باوجود آج جب اپنے خدا کے سامنے دست دعا بلند کئے اور دعا کی کہ الٰہی مجھے میرے مقصد میں کامیاب فرما۔ اسی دوران مجھے میرے ضمیر کی آواز نے جھنجھوڑا اور ایک سوال مجھ سے کیا کہ مرتضیٰ تو نے بڑے نیک کام کے لئے قلم اٹھایا ہے لیکن کیا تجھ پر تیری اپنی حقیقت بھی واضح ہے کہ تو کون ہے؟ کیا ہے؟ اور ارادہ کیا ہے؟ اس سوچ کے ساتھ ہی میں نے گھبرا کر اپنے موضوع کو بدلا اور ارادہ کیا کہ فطرت بشری میں رب کو تلاش کیا جائے۔ اس سوچ سے میرے تمام اعضاء جو اس کاوش میں میرے معاون

تھے ان کو کچھ تسلی ہوئی۔

میں یہ واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ جو کیفیت مجھ پر آج طاری ہوئی وہ کوئی ایسی انوکھی بات نہیں۔ تاریخ گواہ ہے کہ زمانہ جاہلیت میں جب لوگ اس کائنات کی تخلیقات کو پوجا کرتے تھے تو ان میں کچھ ایسے بھی تھے کہ جو اس تمام فرسودہ سوچ سے تنگ آ گئے اور سوچنے لگے کہ آخر وہ کون ہے کہ جو اس کائنات کا نظام احسن طریقے سے چلاتا ہے اور اس ذات کی کیا حقیقت ہے؟ اور جب انہوں نے اس جستجو میں اپنی عقل کا سہارا لیا تو ان میں سے بعض اس سوچ کی گہرائی کو برداشت نہ کر پائے اور اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھے۔ بعض ایسے تھے کہ جو جنگلوں اور دشت کی طرف نکل گئے اور بعض ایسے بھی تھے کہ جنہوں نے فقط ایک ایک جملہ کہہ کر خودکشی کر لی کہ اگر ہم پر اس کی حقیقت آشکار ہو جاتی تو ایمان لے آتے۔ مثلاً عہد نبوت صلی اللہ علیہ وسلم سے کچھ عرصہ قبل ورقہ زید، عثمان بن حویرث اس بت پرستی سے تنگ آ کر جب اپنے رب کی تلاش میں نکلے تو ان میں زید نے دیوار سے ٹکرا ٹکرا کر جان دے دی اور ورقہ اور عثمان عیسائی ہو گئے۔

میں آپ کی توجہ ایک فطری عمل کی جانب مبذول کروانا چاہوں گا کہ جس سے عہد جہالت کی تاریکی میں وجود باری تعالیٰ کے پنپناتے تصور کو واضح کر سکوں۔ جیسا کہ آپ سب سمجھتے اور مشاہدہ کرتے ہیں کہ ہمارا دین ''دین فطرت'' ہے اور یہ اتنا ہی آسان ہے کہ جتنا انسانی عقل سے فطری اعمال کا فاصلہ اور یہ اتنا ہی خوبصورت ہے کہ جتنی فطرت کی خوبصورتی، بعثت پیغمبر آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم نے تو ہمارے لئے ایک راستہ متعین کر دیا اور پھر راستے میں ہمارے لئے نشانیاں بھی چھوڑ دیں تا کہ بھٹکے ہوئے کو راستہ مل جائے اور جو چیز ہمارے اختیار میں رہنے دی وہ فقط ''جستجو'' تھی جس کے بل پر ہمیں آگے بڑھنا تھا۔ اب جب جستجو کا لفظ آیا ہے تو لگے ہاتھوں حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کی زبان میں اس کی تعریف کرتا چلوں۔

آپ فرماتے ہیں کہ

''خدا کی جستجو عرش پر کی جاتی ہے آسمان والے زمین پر تلاش کرتے ہیں اور شکستہ دل بندے کو ڈھونڈتے ہیں کیونکہ خدا نے فرمایا کہ میں عرش پر چھا رہا ہوں اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا کہ مومن کا دل ہی عرش ہے۔ جوان بوڑھوں سے اور بوڑھے جوانوں سے، بدمعاش پرہیزگاروں اور پرہیزگار بدمعاشوں سے خدا کی بابت امید رکھتے ہیں کہ ان سے سراغ ہے۔''

چنانچہ اس ضمن میں جن لوگوں کو اپنی منزل مقصود تک پہنچانا تھا وہ اسلام کی روشنی میں فطرت کے اصولوں پر چلتے ہوئے انہی بدلتی رتوں میں رب کی تلاش میں کامیاب رہے۔ لیکن میں اہل تجسس کی توجہ ان امتوں کی جانب مبذول کروانا چاہوں گا کہ جن کی سوچ اور جستجو فقط فطرتی اعمال تک محدود ہو کر رہ گئی اور انہوں نے مزید آگے جانے کی جستجو نہ کی۔ ان لوگوں نے ان عناصر کو اپنا خدا ماننا شروع کر دیا کہ جو ان فطری اعمال کا باعث بنتے ہیں۔ مثلاً دن میں دھوپ کی گرمی اور روشنی کیوں ہے کیونکہ سورج چمکتا ہے، اس لئے سورج کو اپنا معبود مان لیا کہ وہ بہت طاقت رکھتا ہے۔ چاندنی راتوں میں آسمان خوبصورت کیوں لگتا ہے اور بھٹکے ہوئے لوگوں کو راستہ کیوں کر دکھاتا ہے کیونکہ چاند تارے موجود ہیں اس لئے وہی خدا ہے۔ غرضیکہ ہر وہ چیز کہ جو ان کی زندگیوں پر مثبت یا منفی اثر کرے وہ ان کے معبود کا درجہ رکھتی ہے۔ ان معبودوں کی درجہ بندی کا انحصار اس بات پر ہوتا ہے کہ کون سی چیز کا ان کی زندگی پر زیادہ اثر ہے یا پھر اس طرح سمجھ لیں کہ اس عہد جہالت میں انسان اشرف المخلوقات ہونے کے باوجود اپنے آپ کو باقی مخلوقات الٰہی سے کم درجے کا تصور کرتا ہے اور اس کے آگے عبودیت کا سر جھکاتا تھا۔

جیسا کہ فرمان رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔

''اے لوگو! یہ تمام چیزیں تمہاری آقا نہیں بلکہ تم ان کے آقا ہو وہ تمہارے لئے پیدا کی گئی ہیں تم ان کے لئے پیدا نہیں کئے گئے۔''

ان ادوار اور قوموں پر اللہ رب العزت اپنے پیغمبر علیہ السلام تو مبعوث فرماتا رہا اس

میں شائد کوئی حکمت خداوندی تھی کہ اس نے پیغمبر آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کی شان کو کائنات پر ظاہر کرنا تھا۔ اس لئے ایسے عوامل کا وجود بھی ساتھ ہی رہا کہ جس کی وجہ سے لوگوں کی صحیح تربیت نہ ہو پائی اور وہ وقت کے دھارے کے ساتھ بھٹک جاتے۔ ایک تو یہ کہ جن وقفوں کے ساتھ یہ پیغمبر علیہ السلام مبعوث ہوئے۔ ان میں زیادہ تر کافی طویل وقفے تھے۔ ان طویل وقفوں کے دوران لوگ تعلیمات پیغمبری سے بھٹک جاتے اور پھر سے انہی فطری اعمال میں گم ہو کر رہ جاتے۔

انسان کی فطرت ہی کچھ ایسی ہے کہ جب وہ اپنی ماں کی گود سے کچھ سیکھتا ہے اور اسی روش میں پلتا بڑھتا ہے تو یہ اس کا ''رویہ'' بن جاتا ہے جسے انگریزی میں Attitude کہتے ہیں اور نفسیات دانوں کے مطابق جس طرح وقت کے ساتھ ساتھ رویہ مضبوط ہوتا جاتا ہے تو اس طرح سے اس کو بدلنا بھی اتنا ہی مشکل ہو جاتا ہے۔ اور اگر زیادہ عرصہ بیت جائے تو یہ رویئے زمانہ کے رسم و رواج بن جاتے ہیں کہ جن کو بدلنا کسی عام بشر کے بس کی بات نہیں۔ کچھ ایسا ہی منظر ہمیں گزشتہ امتوں میں نظر آتا ہے کہ ایک پیغمبر آتا اور وہ لوگوں کے رویوں کو حکم الٰہی سے بدلتا۔ لیکن اس کے جانے کے بعد جب زیادہ عرصہ بیت جاتا تو لوگ تعلیمات کو ڈھال کر انہیں اپنی آسانی اور نفسانی خواہشات کے مطابق کر لیتے۔ اس عمل سے ایک بار پھر یہ ان کا رویہ بن جاتا۔ پھر دوسرا پیغمبر آتا وہ ایک نئے سرے اور زاویئے سے سارے عمل کو دہراتا پھر وہ چلا جاتا پھر تیسرا چوتھا اور اسی طرح یہ سلسلہ چلتا رہتا۔ ایک اہم عنصر جس پر مندرجہ بالا بحث کی بنیاد رکھنا چاہوں گا وہ یہ ہے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ جتنے بھی پیغمبر علیہ السلام آئے وہ اپنی امتوں کی ہٹ دھرمی سے عاجز آجاتے اور اپنی آسانی کے لئے ان کے لئے بد دعائیں کرتے جن کی وجہ سے خدائے رب العزت ان امتوں پر اپنا قہر نازل فرماتا۔ ان تمام پیغمبران کرام علیہم السلام کا اخلاق بے شک اعلیٰ و ارفع تھا اور ہمارے لئے ان تمام پر ایمان لانا واجب ہے۔ مگر ان سب نے اپنی اپنی اقوام کو معجزات کا عادی بنا دیا اور ان کو ذاتی جستجو کی تلقین نہ کی۔ بلکہ ان کی زندگیوں کو اس قدر سہل کر دیا کہ ان

کا کھانا، پینا، اٹھنا، بیٹھنا معجزات کی نذر کر دیا اور جب بعد میں آنے والی اقوام کو معجزات نہ ملتے تو وہ بددل ہو جاتے۔ یا پھر یوں سمجھ لیں کہ جب خدائے رب العزت نے ان قوموں کو آزمائش یا امتحان کی گھڑی میں ڈالنا چاہا تو ان کے پیغمبروں علیہم السلام نے ان کے لئے اپنے رب سے آسانی طلب کر لی۔ اس طرح سے ان کے دلوں میں ایمان کی پختگی کا اندازہ ہی نہیں لگایا جا سکا اور ان اقوام کے دلوں پر حقیقی اللہ کی واضح تصویر نقش نہ ہو سکی۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں بھی ان امتوں کی اس جاہلانہ روش پر اس طرح سے تنقید کی گئی ہے۔

''اور کہتے ہیں کہ یہ کیسا رسول ہے کہ کھاتا اور بازاروں میں چلتا ہے''۔ (فرقان:7)

پھر ان میں سے بعض قومیں ایسی بھی گزری ہیں کہ جو اگرچہ حقیقی اللہ کی حقیقت سے تو آشکار ہیں لیکن انہوں نے رب تک رسائی کا غلط راستہ اختیار کیا اور جزا و سزا کے منکر ہوئے۔ جیسا کہ قرآن حکیم میں آتا ہے۔

''ہم ان بتوں کو صرف اس لئے پوجتے ہیں کہ ہم کو خدا کے قریب کر دیں''۔ (زمر:3)

انہی لوگوں کی اس کند ذہنی اور ہٹ دھرمی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قرآن حکیم میں اللہ تبارک وتعالیٰ فرماتا ہے۔

''اگر ان لوگوں (کافروں) سے پوچھو کہ آسمان اور زمین کو کس نے پیدا کیا اور چاند اور سورج کو کس نے تابعدار بنا رکھا ہے تو بول اٹھیں گے اللہ...... پھر کدھر بہکے جا رہے ہیں پھر جب یہ کشتی میں سوار ہوتے ہیں تو خدا کو ہی خلوص کے ساتھ پکارتے ہیں پھر جب خدا ان کو نجات دے کر خشکی کی طرف پہنچا دیتا ہے تو شرک کرنے لگتے ہیں''۔ (عنکبوت:65-61)

ماضی کے عہد جہالت میں تصوراتی معبود کے اس جاہلانہ اور فرسودہ نظام سے اپنے قارئین کرام کو کچھ شناسائی دلانے کے بعد جب ہم عہد رسالت ماب صلی اللہ علیہ وسلم میں داخل ہوتے ہیں اور مصنف اپنا قلم احاطہ اسلام کی سرحد پر رکھتا ہے تو اس مقام پر قلم کی جنبش اس کو لفظ ''اللہ'' لکھنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ غور فرمائیں کہ نام اللہ اپنے اندر کتنی وسعت کو لئے

ہوئے ہے کہ مکاں سے لامکاں تک کی تمام حقیقتوں کو اپنے اندر سمیٹ لیتا ہے۔لفظ اللہ کی مکمل حقیقت کو آپ پر واضح کرنے کے لئے میں آپ کو ایک بار پھر سے ماضی کی طرف لیجانے کی اجازت چاہوں گا۔ مذاہب واخلاق کی انسائیکلوپیڈیا میں مشہور مستشرق نولدیکی کا جو قول نقل کیا ہے اس کے ایک اقتباس کا ترجمہ درج ذیل ہے۔

''اللہ جو صفہ کے کتبوں میں ھلہ لکھا ہوا ہے نباتی اور دیگر تعلیم باشندگان عرب شمالی کے نام کا ایک جز تھا۔ مثلاً زید اللہی۔ نباتی کتاب میں اللہ کا نام بطور ایک علیحدہ معبود کے نہیں ملتا۔ لیکن صفہ کی کتاب میں ملتا ہے۔ متاخرین مشرکین کا نام نہایت عام ہے۔ والہاسن نے عرب کے قدیم لٹریچر میں بہت سی عبارتیں نقل کی ہیں۔ جن میں اللہ بطور ایک معبود اعظم کے مستعمل ہوا ہے۔ نباتی کتبات میں ہم بار بار کسی دیوتا کا نام پکارتے ہیں جس کے ساتھ اللہ کا لقب شامل ہے اس سے والہاسن نے یہی نتیجہ نکالا ہے کہ اللہ کا لقب جو پہلے مختلف معبودوں کے لئے استعمال ہوتا تھا رفتہ رفتہ زمانہ بعید میں صرف ایک عظیم ترین معبود کے لئے بطور علم کے مخصوص ہو گیا۔''

مندرجہ بالا عبارت سے ہم یہ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ گزشتہ قوموں پر لفظ اللہ کی جامعیت واضح نہ تھی بلکہ وہ جس چیز میں بھی طاقت دیکھتے اس کے ساتھ اللہ کا نام لگا کر اس کو معبود کا درجہ دے دیتے یا پھر اس کو حقیقی اللہ تک پہنچنے کا وسیلہ بنا لیتے۔ جس عظیم دور کا ذکر مندرجہ بالا اقتباس کے آخر میں کیا گیا کہ اس میں اللہ اپنی تمام تر فضیلتوں اور صفات کے ساتھ ابھرتا ہے وہ دور بلا شبہ اسلام کا دور ہے اور نام اللہ کی حقیقت سے شناسائی دلانے والے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔

جیسا کہ حضرت داؤد علیہ السلام سے کسی نے سوال کیا کہ خدا کے نزدیک مقصد تخلیق کائنات لیا ہے۔ تو آپ نے فرمایا کہ خدائے بزرگ و برتر فرماتے ہیں۔

''میں ایک مخفی خزانہ تھا (یعنی جمیع کمالات حسن و جمال کا خزانہ تھا) مجھے اس کی

حب ہوئی کہ پہچانا جاؤں پس میں نے خلق کو پیدا کیا"۔

پھر اس مقام پر وہ ذات یزداں اپنی کتاب کے ذریعے انسان کو اپنی قدرت اور احسانات کا احساس دلاتی ہے۔ جیسا کہ قرآن کا آغاز ہی ان الفاظ سے ہوتا ہے۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ یہ وہ جملہ ہے جو دلوں میں خدا کی عظمت پیدا کرتا ہے اور اس کی عظم کو دلوں میں بٹھانے کے لئے خدا تعالیٰ کے احسانات کا بھی ذکر کرتا ہے اور اس طرح سے انسان کے دل میں نورِ معرفت پیدا کر کے انسان کو خدا کا محبّ بنا دیتا ہے۔

جیسے فرمایا" وہ لوگ جو ایمان لائے وہ اللہ سے بہت بڑھ کر محبت کرتے ہیں"۔
(بقرہ:164)

اور فرمایا:
"تو عنقریب اللہ ایسے لوگ لائے گا کہ وہ اللہ کے پیارے اور اللہ ان کا پیارا"۔
(مائدہ:54)

نیز فرمایا:
"اور کوئی آدمی اپنی جان بیچتا ہے اللہ کی رضا میں اور اللہ تعالیٰ ان لوگوں پر مہربان ہے۔" (بقرہ:207)

پھر فرمایا:
"اے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! اللہ تعالیٰ (تمام امور میں) تمہارا اور تمہارے متبعین کا کارساز ہے"۔(انفال:64)

نیز فرمایا:
"وہ جو خدا پر بھروسہ کرتے ہیں خدا ان کے لئے کافی ہے۔" (طلاق:3)

ان آیات میں اللہ تعالیٰ ایک جابر بادشاہ کی طرح نہیں بلکہ وہ رحیم و کریم اور ماں سے زیادہ مہربان نظر آتا ہے۔ آیت اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ میں اس حقیقت کو بیان کیا گیا ہے کہ تمام کائنات کو وجود میں لانے کا باعث خدا ہے۔ نیز تمام کائنات کے قیام اور ربوبیت کا

باعث بھی وہی ہے۔ کائنات کا موجد و خالق ہونے کے لئے بہت بڑی قدرت اور بہت بڑے علوم کا مالک ہونا ضروری ہے یہ کائنات جو اس نے پیدا کی ہے اس کی وسعت کی کوئی انتہا نہیں ہے اس کائنات میں بے حد تنوع ہے اور ہر نوع اور ہر قسم علیحدہ علیحدہ قدرت اور علیحدہ علیحدہ علوم کی بناء پر تخلیق کی گئی ہے اور ہر نوع کی نشو ونما کے لئے کامل اہتمام کرنا اس کی رسد رسائی کے لئے اسباب و ذخائر کا مہیا کرنا اللہ تعالیٰ کے علم و حکمت پر دلالت کرتا ہے۔ نیز یہ اس کی محکم تدبیر اور اس کی قدرت کاملہ اور صفات تامہ پر بھی دلالت کرتا ہے۔

یہاں ان امور کی تھوڑی سی تفصیل درج کرنا خالی از فائدہ نہ ہوگا۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ میں لفظ ''عالمین'' غور کے قابل ہے یہ لفظ جمع ہے اور اس کا واحد عالم ہے جو علم سے نکلا ہے۔ علم کے معنی نشان ہیں اور عالم وہ مخلوق ہے جس پر اس کے صانع کا نشان لگا ہوا ہو۔ ایک تتلی اور ایک گلاب کی پتی جس پر وہ تتلی بیٹھ کر لطف اندوز ہوتی ہے۔ دونوں پر ان کے صانع کا نشان لگا ہوا ہے، دونوں کی بے انداز خوبصورتی دل کو لبھاتی ہے اور حیرت زدہ کرتی ہے اور خدا کی صنعت کاری اور اس کی قدرت کا پتہ دیتی ہے۔ کیا انسان کی قدرت میں ہے کہ اس قسم کی تتلی یا اس قسم کی پھول کی پتی پیدا کر سکے؟ کبھی شہد کی مکھی پھولوں پر اترتی نظر آتی ہے وہ ان کا رس چوستی ہے اور اس کے اندرونے میں خدا نے ایک ایسی مشین بنا رکھی ہے جو پھول کے رس کو شہد میں تبدیل کر دیتی ہے۔ یہ سب سے پہلی شکر ہے جو جنگل کے باسی انسان کے لئے خدا نے پیدا کر رکھی تھی۔ کیا دنیا کے ڈاکٹر اور طبیب مل کر اس شہد کو پیدا کر سکتے ہیں؟

فرمایا:

''اور تمہارے رب نے شہد کی مکھی کو الہام کیا کہ پہاڑوں میں گھر بنا...... اس کے پیٹ میں سے ایک پینے کی چیز رنگ برنگی نکلتی ہے جس میں لوگوں کے لئے شفا ہے''۔(نحل:69-67)

اسی طرح سے اللہ تعالیٰ نے ایک کیڑے کو ہماری خاطر یہ حکم دے رکھا ہے کہ وہ

ہمارے لئے ریشم پیدا کرے۔فرانس اور جاپان میں ریشمی کپڑے کے تمام کارخانے اس کیڑے کے مرہون منت ہیں اس کے بغیر یہ کارخانے ریشم پیدا کرنے سے عاجز ہیں۔ لوگوں نے ہزار کوشش کے بعد مصنوعی ریشم تیار کیا لیکن ان دونوں کی صفات میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ مصنوعی ریشم کو اصلی ریشم سے کوئی نسبت نہیں ہے الغرض کیڑے اور پھول بھی عالم ہیں جن پر صانع کا نشان لگا ہوا ہے اور وہ صانع کا پتہ دیتے ہیں اور انسان کو حیرت میں ڈال دیتے ہیں۔گلاب کا پھول انسان کی نظر کے لئے اور قوت شامہ کے لئے لطف پیدا کر دیتا ہے اور اس کی خوشبو دل و دماغ کو فرحت بخشتی ہے۔ان صفات کے علاوہ ایک صفت اس کے اندر پوشیدہ بھی ہے، جس کو آنکھ، کان اور ناک وغیرہ محسوس نہیں کر سکتے۔ یہ اس کی وہ خاصیت ہے جو معدے اور قلب کی قوت کا باعث ہے۔خدا الغیب ہے تو اس کی مخلوق کے اندر بھی اس کی یہ شان جلوہ گر ہے۔گلاب کی اس چھپی ہوئی خاصیت پر ایمان لانا پڑتا ہے۔اسی طرح سے خدا بھی ان پھولوں اور ان کیڑوں کے اندر نہاں در نہاں موجود ہے۔اسی کی طرف یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ میں اشارہ کیا گیا ہے۔ خدا اگر الغیب ہے تو ہر وہ حالت بھی غیب ہے جہاں انسان کی آنکھ کی دسترس نہ ہو۔مومن اس حالت میں بھی خدا پر ایمان رکھتا ہے اور اس کو اپنے ساتھ یقین کرتا ہے۔ یہ ایمان کے اندر حقیقی تقویٰ پیدا کرتا ہے اور اس کو خدا کا محبوب بنا دیتا ہے۔کیڑا اور پھول کی پتی اس کائنات کا نہایت ہی چھوٹا سا جز ہیں۔ان کے علاوہ اور بھی عالم ہیں جن پر ان کے صانع کا نشان لگا ہوا ہے۔مثلاً فضا میں ستارے اور سیارے ہیں ان کی وسعت غیر محدود ہے۔

جیسا کہ فرمایا ہے:

”اور آسمان کو ہم نے ہاتھوں سے بنایا بیشک ہم وسعت دینے والے ہیں“۔

(بقرہ:47)

اور ان کی وسعت بے انداز ہے۔اس سے صانع کی قدرت کے کمالات اور اس کے عل کے کمالات کا اندازہ لگا لو اور اسی سے اس کے بے پایاں احسانات کا تخمینہ کر لو۔آسمان

کی وسعت اور اس کی بلندی کا اندازہ لگانا انسانی طاقت سے باہر ہے۔ انسان کے لئے تو زمین کی وسعت کا اندازہ لگانا بھی آسان نہیں ہے۔ حالانکہ آسمانوں کے مقابلہ پر زمین ایک ذرہ بے مقدار کی حیثیت رکھتی ہے۔ کئی لاکھ زمینوں کو ایک دوسرے کے اوپر تلے رکھیں تو سورج کے برابر ہوں اور خود سورج اس فضاء آسمانی میں ایک قرص کے برابر نظر آتا ہے۔ جب زمین جو آسمان کے مقابل پر نہایت ہی چھوٹا سا سیارہ ہے اس کی وسعت کا احاطہ کرنا بھی انسان کے لئے مشکل امر ہے تو ساری کائنات کا احاطہ کرنا اس کے لئے اور بھی محال ہے۔ اس میں کیڑے مکوڑے ہیں اور ان کا ایک عالم ہے۔ ان کیڑے مکوڑوں کی اقسام لا تعداد ہیں اور ہر نوع اور ہر قسم کی اس قدر کثرت ہے کہ ان کی تعداد کا علم نہیں ہوسکتا۔ جنگلات کے جنگلات ان سے بھرے پڑے ہیں اور باغات اور کھیتوں میں بھی یہ کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ وہ خدا جو اس عالم کا خالق و موجد ہے اس نے ان سب کے لئے خوراک بھی پیدا کر رکھی ہے۔ یہ ایک حقیر سا عالم ہے لیکن اس کا مطالعہ کرنے والے اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہیں کہ اس عالم کے اندر علم کا ایک دریا بہتا ہوا نظر آتا ہے۔ اس علم کا نام اینٹومالوجی (Entomology) ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس چھوٹے سے عالم کے اندر اگر علم پیدا کر رکھا ہے تو ان کے لئے بعض قوانین بھی مقرر کر رکھے ہیں جن کے ماتحت وہ اپنا کام کرتے ہیں۔ سائنسدان کے لئے یہ طبقہ مخلوق نہایت ہی دلچسپ اور خدا نما ہے۔ اس کے علاوہ پرندوں کا بھی ایک عالم ہے۔ اللہ تعالیٰ نے طرح طرح کے خوبصورت پرندوں سے جنگلات کے جنگلات کو بسا رکھا ہے۔ ان کی تعداد کا علم سوائے خدا کے اور کسی کو نہیں ہوسکتا۔ پرندوں کی ایک ایک نوع اپنی خوبصورتی اور اپنی عادات کا وسیع علم پیش کرتی ہے۔ رنگا رنگ کی چڑیاں اور رنگا رنگ کے مرغ اور مور جنگلوں کو سہانا بنانے میں مدد دیتے ہیں۔ جنگلوں کی سیر کرنے والے ایک ایک رنگیلی چڑیا کو دیکھ کر اور ایک ایک رنگین مرغ کو دیکھ کر حیرت زدہ ہو جاتے ہیں اور وہ جو جنگلوں میں نہیں جا سکتے وہ عجائب گھروں میں ان کو دیکھ کر خدا کی قدرت کے قائل ہوتے ہیں۔ ان پرندوں کی تخلیق خدا کے علم اور قدرت کا پتہ دیتی

ہے اور ان کی زندگی کے قیام کے لئے بڑے وسیع پیمانہ پر ان کی خوراک کا اہتمام کرنا اس کے احسانات بے پایاں پر مطلع کرتا ہے۔ یہ پرندے اپنی خوراک کسی جگہ جمع کر کے نہیں رکھتے ان کے پاس گودام نہیں ہیں یہ سب کے سب صبح کے وقت خالی پوٹے لے کر نکلتے ہیں اور شام کو پوٹے بھر کر واپس آ جاتے ہیں۔

فرمایا:

وَ كَاَيِّنْ مِّنْ دَآبَّةٍ لَّا تَحْمِلُ رِزْقَهَا ۖ اَللّٰهُ يَرْزُقُهَا وَ اِيَّاكُمْ

(العنکبوت:60)

اس پر حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لو انکم تتو کلون علی اللّٰہ حق تو کلہ لیر زقکم کما یرزق الطیر تغدو خماسا و تروح بطاناً (الحدیث)

اسی طرح سے جنگلوں میں بے شمار قسم کے وہ جاندار ہیں جو نباتات پر گزارہ کرتے ہیں اور ان درندوں کی تعداد بھی بہت ہے جن کا گزارہ صرف گوشت پر ہے۔ ان سب کا خدا خالق ہے اور سب کی خوراک کا انتظام کرتا ہے۔ اس کی رسدرسائی میں کبھی کمی واقع نہیں ہوئی۔

فرمایا:

وَ مَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا (ہود:6)

نیز فرمایا:

وَ جَعَلْنَا لَكُمْ فِيْهَا مَعَايِشَ وَ مَنْ لَّسْتُمْ لَهٗ بِرٰزِقِيْنَ (الحجر:20)

"(یعنی) اور تمہارے لئے اس میں روزیاں کر دیں اور وہ کر دیئے جن کو تم رزق دینے سے عاجز ہیں"۔

اسی طرح مویشیوں کی زندگی کے قیام کے لئے سامان ہیں۔ انسان ان مویشیوں کے بغیر زندگی بسر نہیں کر سکتا۔ گھوڑے، گائے، بھینس، اونٹ، بھیڑ اور بکری تمام کے تمام انسانیت کے ساتھ لازم و ملزوم ہیں اور یہ سب انسانوں کی خدمت کے لئے پیدا کئے گئے

ہیں۔ان کثیر التعداد جانداروں کے لئے بھی بہت بڑے پیمانہ پر خدا نے رزق پیدا کر رکھا ہے۔انسانوں کے رزق سے پہلے ان کا چارہ پیدا کیا جاتا ہے۔علاوہ ازیں جس طرح سے ان جانداروں کے لئے سامان معیشت پیدا کئے ہیں اسی طرح سے انسان کے لئے تمام زمین وآسمان اور تمام کی تمام کائنات اس کی خدمت میں لگا رکھی ہے۔

فرمایا:

''ہم نے تم کو زمین کی اشیاء پر تصرف عطا کر رکھا ہے اور تمام سامان معیشت دے رکھا ہے۔''(الاعراف ۷ آیت ۱۰)

زمین کی نسبت سمندر وسیع تر ہے اس کی مخلوق بھی زمین کی مخلوق کی نسبت بہت زیادہ ہے۔سمندر میں بڑے بڑے جسیم جانور بھی ہیں اور طرح طرح کی بڑی اور چھوٹی مچھلیاں بھی ہیں۔ان کی اقسام کی تعداد کا کون پتہ لگا سکتا ہے؟ بعض مچھلیاں ایسی بھی ہیں جن کے نقش ونگار جنگل کے رنگین پرندوں کی طرح دلکش ہیں اور بعض ایسی بھی ہیں جن کے گوشت کو غیر معمولی خصوصیت حاصل ہے۔جس طرح بعض جنگل کے خوبصورت مرغوں کے گوشت کو خصوصیت حاصل ہے۔اس سمندر میں وہ مچھلیاں بھی ہیں جن کے تیل انسانوں کو تقویت پہنچاتے ہیں اور امراض کو دور کرتے ہیں۔سمندروں میں خدا تعالیٰ نے انسانوں کی خاطر عنبر اور سچے موتی بھی پیدا کر رکھے ہیں۔جس طرح سے پہاڑوں کی چوٹیوں پر ایسے آہو پیدا کر رکھے ہیں جو اپنے بطن میں انسانوں کے لئے نافہ مشک لئے پھرتے ہیں۔ الغرض اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ وہ جملہ ہے جس میں خدا تعالیٰ کی قدرت کا ذکر ہے اور جس میں اس کے کمالات اور اس کے احسانات اور اس کی عظمت کو بیان کیا گیا ہے۔یہ سب کچھ معرفت پیدا کرنے کے لئے ہے اور دین کی بہت بڑی اور اہم اغراض میں سے خدا تعالیٰ کی سچی اور حقیقی شناخت اور معرفت کا حاصل کرنا ہی ہے۔

ین فطرت

انسان جہاں کہیں ہے وہاں اس کے ساتھ اس کی فطرت موجود ہے اور یہ فطرت انسانی

ہر جگہ ایک ہی ہے۔ فطرت پر نہ مشرق کا اثر ہے اور نہ ہی مغرب کا اثر ہے، فطرت پر رنگ و زبان کا اثر نہیں ہوتا، فطرت پر نسل و خاندان کا اثر نہیں ہوتا، فطرت انسانی بدلتی نہیں ہے۔ اس لئے ہر ملک اور ہر قوم میں راست گفتاری اور حق پرستی کی قدر ہوتی ہے اور ہر ملک اور ہر قوم میں بددیانتی اور ناراستی کی مذمت ہوتی ہے اور ہر ملک وملت میں بددیانت لوگوں کو برا سمجھا جاتا ہے اور ہر ملک وملت میں جھوٹ بولنے والوں اور مکاری اور فریب سے کام لینے والوں کو برا کہا جاتا ہے اور ان کو مناسب سزائیں دی جاتی ہیں۔ ہر ملک وملت کے لوگوں نے بدکردار لوگوں کو برا سمجھا اور ان کو سزائیں دیں، ہر ملک وملت کے لوگوں نے ظالم کا مقابلہ کیا اور ان کو سزائیں دیں، ہر ملک وملت کے لوگوں نے ڈاکوؤں کا انسداد کیا، ہر ملک و ملت کے لوگوں نے کمزوروں سے ہمدردی کی اور ان کی حفاظت کی، ہر ملک وملت کے لوگوں نے یتیموں، مسکینوں اور بیواؤں کی امداد کی اور ہر ملک وملت کے لوگوں نے سچائی کے لئے جان دینا اعلیٰ درجے کی نیکی کا کام سمجھا۔ الغرض انسانی فطرت میں نیکی سے محبت ہے اور بدی سے نفرت ہے۔ اسلام چونکہ فطرت کا مذہب ہے اس لئے جہاں کہیں جاتا ہے اس کو مقبولیت حاصل ہوتی ہے۔ اسلام کے اصول، فطرت پر مبنی ہیں اس لئے اسلام کو بے حد مضبوطی حاصل ہے۔ اسی لئے اس کو دین قیم کہا گیا ہے اور اسی لئے اس دین کی بنیادیں مضبوط ہیں۔

قرآن کریم میں ارشاد ہے:

فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا ؕ فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا ؕ لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ ۙ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ (الروم:30)

تمام دنیا کے لوگ جوا کھیلنے اور اپنے تئیں برباد کر لینے کو برا سمجھتے ہیں اور اسی طرح سے شراب کو بھی اکثر لوگ برا سمجھتے ہیں۔ پہلی جنگ عظیم میں شاہ انگلستان نے اعلان کیا تھا کہ ہم پبلک میں شراب نوشی نہیں کریں گے۔ اس اعلان کو استحسان کی نگاہ سے دیکھا گیا تھا۔ شاہ

انگلستان نے کیوں ایسا اعلان کیا؟ یہ صرف عوام کو شراب کے مضرات سے بچانے کے لئے کیا گیا تھا۔ اسی طرح سے امریکہ نے قانون پاس کر کے شراب نوشی کو ممنوع قرار دیا تھا لیکن بہت دیر تک اس پر عمل نہ ہو سکا۔ اس لئے کہ قوم کے اندر بد عادت راسخ ہو چکی تھی۔

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت بھی یہ بدعادت قوم کے اندر راسخ ہو چکی تھی لیکن حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک ہی آواز جب اس کے برخلاف نکلی تو ساری کی ساری قوم نے بیک وقت شراب نوشی کو ترک کر دیا۔ لوگوں نے خود بخود شراب کے برتن توڑ دیئے اور شراب مدینہ کی گلیوں میں پانی کی طرح بہتی ہوئی نظر آئی۔ اسلام نے ہر قسم کی بد دیانتی اور حرام خوری کو ناجائز قرار دے کر اس کا نام ونشان مٹا دیا۔ بدکرداری کی سخت سزائیں مقرر کیں اور قوم کے اندر اعلیٰ درجے اور کامل درجے کی عفت قائم کی۔ مال اور جان کی حرمت کی۔ اسلام نے صدقہ اور خیرات پر زور دیا اور ہمدردی خلائق کو دین کا جزو اعظم قرار دیا۔ اور یہ سب کچھ فطرت انسانی کے مطابق ہے۔ اسی لئے اس فطری اور طبعی دین کو مقبولیت عامہ حاصل ہے۔ پادری افریقہ میں تبلیغ کے لئے جاتے ہیں وہ وہاں جا کر حیران رہ جاتے ہیں کہ ان کے علم اور ان کی تہذیب کے باوجود ان کی بات کو لوگ کم سنتے ہیں اور باوجود اس کے کہ پادری گورنمنٹ کے سایہ میں کام کرتے ہیں اور ان کو بہت سی ترجیحی رعایات حاصل ہیں تاہم عیسائیت کے مقابل پر اسلام ان لوگوں کے ذریعے پھیل جاتا ہے جو اس کی تبلیغ کے لئے نہیں بلکہ محض تجارت کی غرض سے جاتے ہیں۔ پادری کو حیران نہ ہونا چاہئے۔ فطرت اس قسم کے مناظر ومشاہدے ہمیشہ پیش کرتی رہے گی۔

رسول عربی صلی اللہ علیہ وسلم نے جو مذہب دنیا کے سامنے پیش کیا ہے اس کا نام اللہ تعالیٰ نے خود الاسلام تجویز کیا اور یہ قرآن مجید میں مندرج ہے۔

فرمایا:

اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ (آل عمران:30)

پھر دوسری جگہ فرمایا:

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَ رَضِیْتُ لَکُمُ
الْاِسْلَامَ دِیْنًا (مائدہ:3)

اسلام کے معنی فرمانبرداری کرنا ہیں۔ یعنی خدا کے احکام کی فرمانبرداری کرنا اسلام ہے۔ خدا کے جاری کردہ قوانین جو فطرت میں کارفرما ہیں ان کی فرمانبرداری کرنا بھی اسلام ہے۔ چنانچہ ان ہردو معنوں کو ذیل کی آیت میں جمع کر دیا ہے۔

فرمایا:

اَفَغَیْرَ دِیْنِ اللّٰہِ یَبْغُوْنَ وَلَہٗۤ اَسْلَمَ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ
وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّ کَرْھًا وَّ اِلَیْہِ یُرْجَعُوْنَ (آل عمران:83)

یہاں اسلام یعنی فرمانبرداری اختیار کرنے کی ایک وجہ بھی بیان کی ہے اور وہ یہ ہے کہ جب ساری کائنات عملاً فرمانبرداری کر رہی ہے اور یہ فرمانبرداری بابرکت ہے تو انسان کیوں فرمانبرداری اختیار نہ کرے؟ نیز ذیل کی آیہ کریمہ میں اسلام یعنی فرمانبرداری کو سراہا ہے۔

فرمایا:

وَ مَنْ اَحْسَنُ دِیْنًا مِّمَّنْ اَسْلَمَ وَجْھَہٗ لِلّٰہِ وَ ھُوَ مُحْسِنٌ
(النساء:120)

(یعنی) اس شخص کی نسبت کس کا دین حسن وخوبی میں بڑھ سکتا ہے جو اپنے تمام قویٰ اور استعدادوں کو خدا تعالیٰ کے احکام کی فرمانبرداری میں لگا دے اور مزید برآں احسان کرنا شیوہ زندگی بنا لے یعنی اپنے اموال خدا کی رضا کیلئے اور اس کی مخلوق کی بہبود کے لئے صرف کرے۔

مذکورہ بالا آیات کے مطالعہ سے یہ امر بھی واضح ہو جاتا ہے کہ تمام کی تمام فطرت قوانین واحکام کی پابند ہے اور اسی پابندی کا ہی یہ نتیجہ ہے کہ انسان برکات سماوی وارضی سے مالا مال ہو رہے ہیں۔ اس لئے انسان کو بھی چاہئے کہ اپنے خالق ومحسن کی ہدایات و احکامات کا پابند ہو کر زندگی بسر کرے تاکہ وہ بھی ایک مفید اور بابرکت شخص ثابت ہو۔ اسلام

کالفظ بلندترین اور وسیع ترین اور مفید ترین معنی کا حامل ہے۔اس لفظ میں ایسی جامعیت اور وسعت ہے کہ جب سے یہ کائنات وجود میں آئی ہے اس وقت سے ہی یہ فرمانبرداری کا جامہ پہنے ہوئے چلی آرہی ہے اور جہاں کہیں اور جس کسی زمانے میں انسان پیدا ہوا اس کا دین بھی اس کے ساتھ پیدا ہوا۔اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام زمان و مکان کی حدود سے بالاتر ہے اس لفظ اسلام نے تاریخ مذاہب کو ایک نیا رنگ اور نیا فلسفہ عطا کیا ہے۔اس لئے تمام مذاہب اس کے مرہون منت ہیں۔یہ دین چونکہ انسان کی فطرت کے مطابق ہے اس لئے اس کو فوراً قبول کر لیتا ہے۔ہر شخص کی فطرت میں خدا کی فرمانبرداری پر خوشی کا اظہار کرنا مرکوز ہے اور اگر کسی ہندو یا عیسائی وغیرہ سے سوال کیا جائے کہ آیا وہ خدا کے احکام کی فرمانبرداری کرتا ہے تو وہ فوراً بول اٹھے گا کہ ہاں میں ایسا کرتا ہوں۔کیا کوئی ہندو یا یہودی یا عیسائی یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ اسلام کا لفظ قرآن کریم نے کسی دوسری کتاب سے مستعار لے کر یا سرقہ کر کے اپنے اندر درج کر لیا ہے۔کسی شخص کی ہمت ہے تو یہ لفظ اپنی آسمانی یا زمینی کتاب سے نکال کر پیش کرے۔لیکن کوئی شخص ایسا نہیں کر سکتا۔اگر قرآن کریم کے یہ نظریات کہ اللہ تعالیٰ رب العالمین ہے اور یہ کہ اس کی کتاب تنزیل من رب العالمین اور اس کا رسول رحمۃ اللعالمین ہے لاجواب ہیں تو وہ نظریہ بھی جو اسلام پیش کرتا ہے۔بے عدیل و بینظیر ہے۔**فللہ الحجۃ البالغۃ**

اسلام کے مقابل پر دنیا کے مذاہب نے جو نام اپنے لئے تجویز کر رکھے ہیں ان پر بھی غور کر لینا چاہئے۔ہندو مذہب کو لیجئے۔اس کا نام کوئی اعلیٰ درجے کے معنی پر دلالت نہیں کرتا اس کا مفہوم صرف اتنا ہے کہ یہ کشور ہند کا مذہب ہے۔اسی طرح بدھ مت کے یہ معنی ہیں کہ ایک انسان گوتم بدھا کا متبع ہے۔لیکن اس سے اس کے مذہب یا دین کے معانی ہمارے سامنے نہیں آتے۔بدھ مذہب گوتم بدھا کے وجود میں آنے سے پہلے موجود نہ تھا جب یہ موجود نہ تھا تو اس وقت اہل دنیا کا کیا مذہب تھا؟ پھر یہ مذہب تو ایک انسان کا ایجاد کردہ ہوا نہ کہ خدا کا جو حقیقی خالق و مالک ہے۔یعنی وہ خدا جو مذہب عطا کرنے کا مجاز ہے یہ اس کی

طرف سے نازل کردہ نہیں بلکہ ایک انسان کے دماغ کی اختراع ہے۔ ایسے الفاظ سے انسان کو کوئی تسلی حاصل نہیں ہوتی۔ یہی حال عیسائیت کا ہے۔ وہ خدا کا نہیں بلکہ عیسیٰ علیہ السلام کا دیا ہوا مذہب ہے۔ اس لفظ کو اسلام کی طرح ہمہ گیر اور عالمگیر معنی حاصل نہیں ہیں یہ صرف ایک شخص جس کو کرائسٹ کہتے ہیں اس کا مذہب ہے۔ کرسچین وہ ہے جو کرائسٹ کے پیچھے چلے اور یہ معنی محدود ہیں۔ کرسچین تو کرائسٹ کے مذہب پر چلتا ہے لیکن کرائسٹ خود کس کا متبع تھا؟ وہ تو خدا کا متبع یعنی مسلم تھا۔ قصہ کوتاہ اسلام کے مقابل پر کسی دوسرے مذہب کے اختراع کردہ اسماء اپنے اندر کوئی معقولیت اور دلربائی نہیں رکھتے اور نہ ہی وہ تمام انسانیت کے لئے دین ہو سکتے ہیں۔ اسلام تو خدا نے نام تجویز کیا اور اس کو قرآن کریم کی آیات بینات میں درج کیا۔ لیکن باقی دنیا کے مذاہب کے نام ان کی آسمانی کتابوں کے اندر موجود نہیں ہیں اور نہ ہی وہ خدا کے تجویز کردہ نام ہیں۔ خدا تعالیٰ کی طرف منسوب کئے جانے کی بجائے وہ کسی انسان کی طرف یا وطن کی طرف منسوب کئے جاتے ہیں۔ اسلئے ان میں وہ معقولیت و دلربائی نہیں ہے جس کا انسان طالب ہے۔ اسلام جیسا کہ اوپر بیان ہوا فطرت کا مذہب ہے۔ اس کی مزید تشریح وتصریح ذیل کی آیات بینات میں ملاحظہ ہو۔ ان آیات میں کسی جگہ لفظ اسلم آیا ہے اور کسی جگہ سجد یا یسجد آیا ہے۔ دونوں کے معنی فرمانبرداری اختیار کرنے کے ہیں۔

فرمایا:

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يَسْجُدُ لَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَنْ فِي الْاَرْضِ وَ الشَّمْسُ وَ الْقَمَرُ وَ النُّجُوْمُ وَ الْجِبَالُ وَ الشَّجَرُ وَالدَّوَآبُّ وَ كَثِيْرٌ مِّنَ النَّاسِ ؕ (الحج:18)

اس آیت میں تفصیل کے ساتھ آسمانوں اور زمینوں کی فرمانبرداری کے ذکر کے علاوہ حجر و شجر کی فرمانبرداری اور شمس و قمر اور نجوم کی فرمانبرداری اور مویشیوں اور انسانوں کی فرمانبرداری کا بھی ذکر ہے اور اس امر کا بھی بیان ہے کہ اس کائنات کی ہر شے پوری

فرمانبرداری کر رہی ہے۔ لیکن انسانوں میں سے بعض پوری فرمانبرداری نہیں کرتے۔ یہ اس لئے کہ انسان صاحب اختیار ہے اور وہ اپنے اس اختیار کو غلط طور پر بھی استعمال کر لیتا ہے لیکن سورج وقمر، حجر و شجر اور چرند و پرند کی فطرت میں اختیار کا حصہ نہیں رکھا گیا۔ ان کی فطرت میں صرف کائنات کے قوانین کی پوری فرمانبرداری کرنا ہی رکھا گیا ہے۔ اختیار تو فرشتوں کو بھی حاصل نہیں ہے۔ ان کی شان تو ''یفعلون ما یؤمرون'' بیان کی گئی ہے۔ خدا نے اختیار سے صرف انسان ہی کو نوازا ہے اور اس اختیار کے صحیح استعمال سے وہ کبھی فرشتوں سے بڑھ جاتا اور مسجود ملائک بن جاتا ہے اور کبھی اس اختیار کے غلط استعمال سے شیطان کا استاد بن جاتا ہے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور دوسرے پیغمبروں علیہم السلام نے نہ تو اپنے اپنے مذہب کا کوئی نام تجویز کیا اور نہ ہی انہوں نے اپنے متبعین کا کوئی نام رکھا۔ برخلاف اس کے رب العزت نے مذہب کا نام الاسلام اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نام مسلم رکھا۔ اور ان کے متبعین کا نام بھی خود ہی مسلمین تجویز کیا۔

جیسا کہ ذیل کی آیات سے ظاہر ہوتا ہے۔ فرمایا:

☆ اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ (آل عمران:19)

☆ وَاُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ (یونس:72)

☆ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِيْنَ (الانعام:163)

☆ هُوَ سَمّٰكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ (الحج:28)

☆ اِنَّ الْمُسْلِمِيْنَ وَالْمُسْلِمٰتِ (احزاب:35)

☆ وَاشْهَدْ بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ (آل عمران:52)

☆ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ (آل عمران:84)

مزید برآں دوسرے مذاہب نے اپنی الہامی کتاب کا بھی کوئی نام تجویز نہیں کیا اور نہ ہی ان کی کتب میں ان کے مذہب کا نام لکھا ہے اور نہ ہی ان میں ان کے دین کے متبعین

کے لئے کوئی نام تجویز کیا گیا ہے۔

خدا تعالیٰ نے جو استعدادیں انسان کو عطا کر رکھی ہیں۔ انہی کی تعلیم و تربیت ہو سکتی ہے اور جو استعدادیں اس میں موجود نہیں ہیں۔ ان کی تعلیم و تربیت پر توجہ دینا بے فائدہ ثابت ہوگا۔ بعض طالب علموں میں ریاضی سیکھنے کی طرف رجحان ہوتا ہے اور بعض میں فلسفہ کی طرف اور بعض طبیعتوں میں کیمسٹری اور فزکس کے لئے قطعاً کوئی مناسبت نہیں ہوتی۔ لیکن وہ فلسفہ کی تعلیم حاصل کرنے کی طرف توجہ کرتے ہیں تو اس میں وہ سب پر سبقت لے جاتے ہیں۔ ایک ایسے شخص کو جسے شعر و سخن سے کوئی مناسبت نہ ہو اس کو شعر کہنے کی تعلیم دینا عبث فعل ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے ہم ''بھیڑ یا بکری'' کے بچے کو نہایت احتیاط سے پالیں اور اس کو گھر کی رکھوالی اور چوکیداری کی تعلیم دینا شروع کر دیں۔ اس میں کبھی بھی کسی طرح کی کامیابی نصیب نہ ہوگی یا ہم گھوڑوں کی بجائے ایک رسالہ بیلوں کا تیار کریں کہ میدان جنگ میں دشمن پر ہلہ بولنے کے وقت یہ کام آئیں گے تو ایسی خام خیالی کا نتیجہ مایوسی کے سوا کچھ نہ ہوگا۔ باز کی بجائے کبوتر سے شکار کرنے کا کام نہیں لیا جا سکتا۔ بطخ کا بچہ پانی دیکھتے ہی اس میں کود پڑتا ہے لیکن اس کے ہم جولی مرغی کے بچہ کی جان پانی میں گرتے ہی ختم ہو جاتی ہے۔ ایک بھیڑ کے بچے کو اور چیتے کے بچے کو اکٹھا رکھ کر ان کی تربیت کیجئے گا چند مہینوں کے بعد کسی دن چیتے کے بچے کے دل میں خود بخود یہ خیال پیدا ہوگا کہ میرا ہم جولی تو میری غذا ہے۔ وہ اچانک اس پر کود پڑے گا اور اس کو پھاڑ کھائے گا۔ فطرت حیوانات میں بھی ہے، فطرت پرندوں میں بھی ہے، فطرت مچھلیوں میں بھی ہے۔ مچھلیوں کو خشکی پر پالنا ناممکن ہے اور اسی طرح مرغیوں کو پانی کے اندر رکھ دینا حماقت ہے۔ یہ فطرت نباتات میں بھی ہے۔ بکائن کے درخت سے آم اتارنے کی توقع نہیں کی جا سکتی، سیب کا درخت کبھی بھی ناشپاتی نہیں دیتا، انار سیب اور ناشپاتی کے درخت اکٹھے ایک ہی جگہ پر ایک ہی پانی سے پرورش کئے جاتے ہیں لیکن ان میں سے ہر ایک کو خدا تعالیٰ نے ایک فطرت عطا کر رکھی ہے۔ اس کی فطرت اس کی ضرورت کے موافق زمین سے ذرات فراہم کرتی ہے اور

دوسرے درخت کی ضروریات کے ذرات کو کبھی غلطی سے بھی جذب نہیں کرتی۔ الغرض نباتات اور حیوانات کو اللہ تعالیٰ نے ان کے مناسب حال ایک فطرت عطا کر رکھی ہے جس کے موافق اس کی نشو ونما کی جاسکتی ہے۔ اسی طرح انسان کو بھی فطرت عطا کی گئی ہے اس کے اندر استعدادیں رکھی گئی ہیں ان استعدادوں کو ملحوظ رکھ کر اس کی تربیت کرنا سودمند ثابت ہوتا ہے۔ اور اسی میں انسان کی فلاح اور اسی میں اس کے قلب کی راحت ہے۔ ان استعدادوں کو جگانے کے لئے اور ان کی یاددہانی کے لئے قرآن کریم کا نام الذکر رکھا گیا ہے۔ یہ کیسا معقول اور پسندیدہ اور خوش آئند نام ہے۔ اس کے اندر فلسفہ اور حکمت رکھ دی گئی ہے۔ ''ان هو الا ذکر للعلمین'' تمام قوموں کو خدا تعالیٰ نے باطنی استعدادیں عطا کی ہیں۔ چنانچہ ایک ہندی یا ایک سیاہ فام زنگی برطانیہ کی اور جرمنی کی یونیورسٹیوں میں اور اس طرح امریکہ کی یونیورسٹیوں میں ایسا چمکتا ہے کہ اس کے سامنے سفید اندام طالب علم ماند پڑ جاتے ہیں یہ اس لئے کہ خدا رب العالمین ہے اس نے تمام قوموں کو ذہانت وفہم اور ادراک وعقل کے زیورات سے آراستہ کر رکھا ہے۔ اسلام چونکہ تمام قوموں کی تعلیم وتربیت کے لئے آیا ہے۔ اس لئے وہ تمام قوموں کی استعدادوں کے مطابق تعلیم پیش کرنے کا دعویدار ہے۔

وہ ذات تعالیٰ کس قدر عاقل ہے اس بات کا ہم مشاہدہ ہی کر سکتے ہیں اندازہ نہیں لگا سکتے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ اکثر مقامات پر ارشاد فرماتا ہے کہ اس نے تم پر رسولوں کو ''ہدایت'' بنا کر بھیجا ہے۔ میں اپنے قارئین کرام کو اس فرمان کی گہرائی میں لے جانے کی جسارت کروں گا کہ خدائے رب العزت نے انسان کو اشرف المخلوقات بنایا اور اس کی وجہ فقط انسانی عقل ہے کہ جو کائنات کی باقی مخلوقات کے پاس نہیں ہے۔ باقی تمام مخلوقات سوچنے سمجھنے کی صلاحیت تو رکھتی ہے لیکن وہ عقل سے سوچنے سے عاری ہے تو انسان باقی مخلوقات کے لئے ایک بہت بڑا عاقل ٹھہرا۔ ہدایت کے لغوی معنی ہیں ''وہ عقل جو سرکش گھوڑے کو قابو کرے۔'' اگر میں اس مقام پر انسان کے عاقل ہونے کی بات کروں تو میں یہ کہنے میں

کوئی عار محسوس نہیں کروں گا کہ اللہ نے انسان کو دوسری مخلوقات کی ہدایت کے لئے اپنا خلیفہ بنا کر اس دنیا میں بھیجا ہے۔ یہ چرند، پرند، سورج، ستارے، سیارے، ہوا، پانی اور مٹی کو اس کے لئے تسخیر کر دیا ہے کہ وہ ان پر قابو پالے اور اپنے آپ کو عاقل ثابت کرے۔ تو اس حوالے سے انسان کتنا بڑا عاقل ٹھہرا۔ اور پھر جب اللہ نے فرمایا کہ ہم نے رسولوں کو تم پر ہدایت بنا کر بھیجا ہے تو ان رسولوں کی عقل کا اندازہ کون کر سکتا ہے کہ وہ انسانوں کے مقابلے میں کتنے بڑے عاقل ہیں۔ اب جبکہ ان تمام رسولوں کے اتنے بڑے عاقل ہونے میں کوئی شبہ باقی نہیں رہ گیا تو میں تمام عقائد کے حامل افراد سے یہ سوال کرتا ہوں کہ اس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عقل کی حقیقت کو مجھ ناقص العقل پر واضح کر دیں کہ جس کو اللہ تعالیٰ نے سید الانبیاء کہا ہے کہ اے رسول صلی اللہ علیہ وسلم تو ان سب رسولوں کی ہدایت فرما۔ اس مرحلے تک آنے کے بعد میں اپنے پڑھنے والوں کی توجہ اس عاقل (اللہ عزوجل) کی جانب دلوانا چاہتا ہوں کہ جس نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تمام کائنات کی ہدایت و راہنمائی کے لئے بھیجا ہے۔

ذات باری تعالیٰ کو پانے کی جستجو اللہ رب العزت نے انسان کی فطرت میں شامل کر رکھی ہے۔ جس طرح بچے کی پیدائش کے بعد ماں کی گود کی گرمی میں تسکین اس کی فطرت میں شامل کر دی جاتی ہے اور وہ جتنا زیادہ اس گرمی کو محسوس کرتا ہے اتنا ہی اس کی پرورش صحیح طریقے سے انجام پاتی ہے۔ اسی طرح جب انسان اپنے حواس میں آتا ہے تو اپنے آپ سے سوال کرتا ہے کہ میں کون ہوں؟ میری حقیقت کیا ہے؟ کوئی تو ہے جو اس نظام قدرت کو احسن طریق سے چلا رہا ہے اور وہی اس کی زندگی کو بھی سنوارنے اور بگاڑنے والا ہے۔ پس جب انسان تزکیہ نفس کے ساتھ اپنے رب کو پانے کی جستجو کرتا ہے تو اللہ کا ایسے لوگوں سے وعدہ ہے کہ وہ اپنے رب کو پالیں گے۔ اہل عقیدہ کے لئے میں ان کے ذہنوں میں ایک لمحہ فکریہ کو اجاگر کرنے کی کوشش کروں گا کہ اگر ان کو یقین کی منازل طے کرنے میں دقت ہے تو اللہ نے ایسے انسانوں کی انسانیت میں ہی یقین کی منازل کو پوشیدہ کر رکھا ہے۔ اب

جب اس حقیقت کو احاطہ تحریر میں لا چکا ہوں کہ اللہ پر یقین کی منازل انسانیت میں ہی پوشیدہ کردی گئی ہیں تو یہاں پر انسانیت کی تعریف کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ ''کہ جہاں جبر کے ساتھ اختیار آجائے پس وہی انسانیت ہے۔''

اس حقیقت کو مزید عیاں کرنے کے لئے اعضائے انسانیت کی مثال دینا ضروری سمجھوں گا۔ اللہ نے انسان کو آنکھ، کان اور زبان عطا کی تا کہ وہ علم دنیا کو تسخیر کرے لیکن اس کے باوجود ہمارے یہ تمام اعضاء کتنے مجبور اور بے بس نظر آتے ہیں۔ انسانی چشم کو ہی دیکھ لیجئے کہ وہ مجبور ہے کہ کالے کو کالا ہی دیکھے، گورے کو گورا ہی دیکھے، نیلے کو نیلا ہی دیکھے اور پیلے کو پیلا ہی دیکھے۔ وہ کالے کو گورا، گورے کو کالا نہیں دیکھ سکتی۔ اسی طرح کان لفظ ماں کو ماں ہی سنے گا یہ نہیں ہوسکتا کہ وہ ماں کو باپ سنے۔ انسان کی زبان میٹھے کو میٹھا ہی محسوس کرے گی اور کڑوے کو کڑوا۔ تو آپ نے ملاحظہ کیا کہ تمام اعضاء کس قدر مجبور ہیں۔ اب ذرا غور فرمائیے گا کہ اس مجبوری کے ساتھ اللہ نے بیک وقت ان کو اختیار بھی دے دیا ہے۔ مثلاً آنکھ کے اختیار میں ہے کہ وہ اس سے اچھائی دیکھے یا برائی، کان کے اختیار میں ہے کہ وہ اچھا سنے یا برا، زبان کے اختیار میں ہے کہ وہ اس سے کسی کا دل دکھائے یا کسی کو نصیحت کر کے اس کے زخموں پر مرہم رکھے۔ تو آپ نے ملاحظہ کیا کہ کس طرح سے انسانیت نے اپنے اندر موجود دونوں کیفیات کو واضح کیا۔ اس جگہ پہنچ کر میں قارئین کرام کی انتہائی توجہ چاہوں گا کہ اسی تاثیر انسانیت کو لئے جب انسان کھڑا ہوتا ہے تو وہ اس قدر مجبور ہوتا ہے کہ شیطان اس کی چاروں سمتوں دائیں بائیں، آگے پیچھے سے حملے کرسکتا ہے۔ تو یہ چار سمتیں انتہائی مجبور قرار پائیں۔ لیکن ابھی دو سمتیں باقی ہیں۔ ایک اوپر اور ایک نیچے۔ اب انسان کے اختیار کی طرف توجہ فرمائیے کہ اگر وہ اپنے دونوں ہاتھوں کو خدا کے حضور بلند کر دے تو خدا اپنے بندے کی ذمہ داری قبول کرتا ہے اور اگر سجدے میں چلا جائے تو یقین کی انتہائی منزل کو چھو لیتا ہے کہ جس میں شیطان کا عمل دخل قطعی ختم ہو جاتا ہے اور یقین بھی کیسا کہ جب بندہ اپنے رب کے حضور پہلی بار سجدے میں جاتا ہے تو اس بات کا یقین کرتا ہے کہ میں

اس مٹی سے تخلیق کیا گیا ہوں اور جب اللہ اکبر کہہ کر گھٹنوں کے بل بیٹھتا ہے تو یقین کرتا ہے کہ میں اپنے رب کے حکم سے اس دنیا میں بھیجا گیا ہوں اور جب دوبارہ سجدے میں جاتا ہے تو اس بات پر یقین کرتا ہے کہ میں نے پھر اسی مٹی میں جانا ہے۔ اب جب یہاں پر نماز کا ذکر چھیڑ دیا تو کیوں نہ حالت نماز میں بھی یقین کی منازل کا جائزہ لے لیں۔ صرف نماز پڑھ لینے سے ہی یقین کی منازل طے نہیں ہو سکتیں۔ ایک مسلمان جب دن میں پانچ مرتبہ نماز کو فرض جان کر اس کی ادائیگی کرتا ہے تو یہ نماز صرف قبلہ رخ ہونے کا نام ہے۔ حقیقی اور خالص عبادت وہ ہے کہ جس کا رخ تصور الٰہی کی جانب ہو۔

جیسا کہ سورۃ بقرہ میں ارشاد ہوتا ہے۔

"تم جس طرف بھی اپنا منہ پھیرو وہاں اللہ کی صورت پاؤ گے۔" (بقرہ:115)

رب العالمین اور احکم العالمین کے دربار میں حاضر ہونے کے لئے صرف باوضو ہونے کی شرط ہے۔ اس کے علاوہ نماز کی نیت باندھنے میں نہ کسی پیر فقیر سے اجازت حاصل کرنے کی ضرورت ہے نہ کسی حکومت کے قانون کی پابندی لازمی ہے نہ کسی دفتر سے پرمٹ بنوانا پڑتا ہے نہ کوئی ٹکٹ خریدنے کی شرط ہے نہ کوئی شناختی کارڈ دکھانا پڑتا ہے نہ کوئی PA راستے میں حائل ہے نہ کوئی دربان روکتا ہے۔ انسان کے اپنے نفس کے علاوہ عبد اور معبود کے اس راز و نیاز میں کوئی حجاب بیچ میں نہیں آتا۔

صوفیائے کرام نے یقین کی منازل کے لئے قبلوں کا تعین کیا ہے۔ ایک قبلہ وہ ہے جو مکے میں بستا ہے، دوسرا قبلہ رخ مرشد ہے، تیسرا حاجت مند کے اپنے دل میں بستا ہے اور چوتھا اس کی اپنی ذات کی حقیقت کی سچائی ہے۔ اس لئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ جب قبلہ چار ہیں تو پھر یقین کی منازل بھی چار ہی ہیں اور ان کو زینہ بہ زینہ ہی حاصل کرنا اصل میں مقصود ہے۔

شیخ ابوبکر رحمۃ اللہ علیہ عبادت کی حالت میں قبلے کی حقیقت کو بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:

"اصل مومن ایمان کی حالت میں ایک لامحدود قبلہ (تصور الٰہی) کی جانب منہ

پھیرتا ہے اور اگر وہ ایک محدود قبلے (کعبہ) کی طرف منہ پھیرتا ہے تو یہ کسی کفر سے کم نہیں ۔"

آپ یہ سوچتے ہوں گے کہ میں نے کیا بات کہہ ڈالی۔ اس کی تفصیل کو اس طرح واضح کروں گا کہ جب اللہ بزرگ و برتر نے حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا فرمایا تو تمام فرشتوں کو حکم دیا کہ آدم علیہ السلام کو سجدہ کرو۔ لیکن یہ سجدہ آدم کو نہیں کیا گیا بلکہ اللہ تعالیٰ کے حکم کو کیا گیا اور پھر اس حکم سے اس کی تخلیق کو کیا گیا۔ ظاہر میں آدم سامنے تھا لیکن تصور اس ذات گرامی کا تھا اس تصور کی پختگی کا دارومدار اس یقین پر تھا کہ جس کی بنیاد فقط اللہ کا حکم تھا اور اس حالتِ یقین میں تمام فرق مٹ گئے۔ جو چیز افضل تھی وہ ادنیٰ ہوگئی اور جو ادنیٰ تھی وہ افضل ہوگئی۔ آگ اگرچہ مٹی اور پانی پر حاوی ہے لیکن اس ذات کے یقین کی پختگی تھی کہ آگ کے فرشتوں نے مٹی اور پانی کی تخلیق کو بغیر کسی دلیل کے افضل جان لیا اور جس نے اس یقین میں ملاوٹ کی اور اللہ کے حکم کے خلاف مٹی اور پانی کو حقیر جانا تو وہ ابلیس ہوگیا۔ اب اس کیفیت کو ذرا زمین پر لا کر دیکھیں کہ میں نے جو کہا وہ ٹھیک ہے یا غلط۔ کعبے کی اصل حقیقت صرف اینٹیں اور مٹی ہے اور انسان میں اللہ نے اپنی روح پھونک رکھی ہے۔ دیکھا جائے تو انسان فطری تقاضوں میں حرم پاک پر افضل نظر آتا ہے۔ کیونکہ وہ اشرف المخلوقات بھی ہے لیکن ایمان اور یقین کی حالت میں مقابلہ اینٹوں اور روح کا نہیں۔ بلکہ سجدہ تو اس ذات باری تعالیٰ کے حکم کو کرنا ہے کہ انسان قبلہ رو ہو کر نماز ادا کرے اور اپنی بندگی کا ثبوت دے۔ تو اصل تصویر تو دل میں اللہ ہی کی رہی اور تصور اگر فقط اینٹوں کا ہی رہا تو پھر نماز کیسی بلکہ میں تو اس حالت کو کفر ہی کہوں گا۔ ابلیس بھی تو دل میں مٹی اور پانی کا ہی خیال لے کر منحرف ہوا تھا۔

اگر آپ نے اس حقیقت کو سمجھ لیا تو پھر محمدی صلی اللہ علیہ وسلم جام پی لیا۔ لیکن اگر ان یقین کی منازل کو طے نہیں کیا تو کسی بھی طرح اس کو حاصل کیجئے۔ آپ کو اپنے آپ میں گم ہو کر اپنی ذات کو مٹانا ہوگا تبھی اس کی طرف رغبت حاصل ہو سکتی ہے۔ عبادت کے دوران

حالت یقین کیسی ہونی چاہئے تو اس کے لئے یہی کہنا مناسب ہوگا کہ اگر آپ ایک آئینے سے نکلنے والی روشنی کی پوجا کرتے ہیں تو وہ عبادت اس روشنی کے لئے ہوگی نہ کہ آئینے کے لئے۔ اور یہ اس پوجا کرنے والے کے ایمان پر منحصر ہوگا کہ وہ اپنا سجدہ روشنی کے حضور کرتا ہے یا آئینے کے حضور۔ اس مقام پر آ کر اس ایک معمولی سے تصور کے فرق سے ایمان کی حالتیں بدل جاتی ہیں۔ ایک صاحب بصیرت تمام چیزوں کو آئینہ تصور کرتا ہے کہ جس میں سے اس ذات الٰہی کا نور پھوٹتا ہے۔ ایک مجذوب تھا کہ جس کو جو بھی چیز نظر آتی وہ اسے سجدہ کرتا تھا اور یہ بھی کہتا تھا۔

''اے اللہ! میں ان تمام چیزوں کے ساتھ شرک کرنے سے تیری پناہ مانگتا ہوں۔''

اس مجذوب کا بیٹا مسعود بیگ تھا اس نے جب یہ سب کچھ دیکھا تو اپنے بیٹے کو کہنے لگا کہ میرا باپ شرک کرنے کے ساتھ ساتھ اس ذات سے پناہ کا بھی امیدوار ہے تو اس مجذوب کے پوتے نے جواب دیا کہ ان کو مشرک مت کہیں کہ وہ ان چیزوں کے وجود سے بالاتر ہو کر ان چیزوں کی اصل حقیقت میں جھانکنے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور یہی منزل ایک بشر کے لئے یقین کی آخری حد ہوتی ہے۔ یہ عبادت یقین ایسی نماز ہوتی ہے کہ جس میں دوسری پانچ وقت کی نمازوں کی طرح توقف کی گنجائش نہیں ہوتی۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

''اور وہ جو اپنی عبادت کی حفاظت کرتے ہیں۔'' (معارج:34۔انعام:93)

نماز کی اپنی حقیقت بھی لفظ اللہ سے بھرپور ہے ایک طرف تو نماز کے دوران ادا ہونے والے کلمات ایک مومن کو یقین کی طرف رغبت دلاتے ہیں تو دوسری طرف نماز کے دوران کی جانے والی حرکات وسکنات بھی انسان کے یقین کو مضبوط کرتی ہیں۔ ایک شخص نے ایک خوشخط نویس جو کہ ایک بزرگ تھے سے دریافت کیا کہ آپ کو اپنے فن میں بڑا عبور حاصل ہے لیکن آپ ہمیں بغیر قلم، بغیر سیاہی اور بغیر کاغذ کے لفظ اللہ لکھ کر دکھائیں۔ تو بزرگ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے اور نماز کی تینوں حالتوں سے گزرے یعنی کہ جس وقت وہ

کھڑے تھے تو حالت ''الف'' کو ظاہر کرتی ہے رکوع کی حالت ''ل'' کو ظاہر کرتی ہے اور سجدے کی حالت ''ہ'' کو ظاہر کرتی ہے اور اس طرح لفظ اللہ مکمل ہوتا ہے اور پھر بعد میں سوال کرنے والے شخص کو مخاطب کر کے فرماتے ہیں:

''اے بھائی تصور کو معبود ہی جانو۔''

اسم اللہ ذاتی اپنے مسمی ہی کی طرح یکتا، بے مثل اور اپنی حیرت انگیز معنویت اور کمال کی وجہ سے ایک منفرد اسم ہے۔ اس اسم کی لفظی خصوصیت یہ ہے کہ اگر اس کے حروف کو بتدریج علیحدہ کر دیا جائے تو پھر بھی اس کے معنی میں کوئی تبدیلی نہیں آتی اور ہر صورت میں اسم ''اللہ ذات'' ہی رہتا ہے۔ اسم ذات کے شروع سے پہلا حرف ''ا'' ہٹا دیں تو ''للہ'' رہ جاتا ہے اور اس کے معنی ہیں اللہ کے لئے اور یہ بھی اسم ذات ہے۔

قرآن مجید میں ہے:

''اللہ ہی کے لئے ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے۔'' (معارج:34)

اور اگر اس اسم پاک کا پہلا ''ل'' ہٹا دیں تو ''لہ'' رہ جاتا ہے اور جس کے معنی ہیں اس کے لئے اور یہ بھی اسم ذات ہے۔

جیسے ارشاد ربانی ہے:

''اسی کے لئے بادشاہت اور حمد وستائش ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔'' (تغابن:1)

اور اگر دوسرا ''ل'' بھی ہٹا دیں تو ''ہ'' رہ جاتی ہے اور یہ بھی اسم ضمیر ہے اور اس کے معنی ہیں ''وہ'' اور یہ بھی اسم ذات ہے۔

ارشاد ہوتا ہے:

''وہی اللہ ہے اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔'' (بقرہ:284)

بعض اوقات یہ سوال کیا جاتا ہے کہ اگر ذات تعالیٰ اس قدر ظاہر ہے تو پھر نظر کیوں نہیں آتی؟ تو عرض یہ ہے کہ بھلا حق تعالیٰ جیسی عظیم الشان ہستی بھی آنکھوں سے چھپ سکتی ہے۔ وہ تو شان و شوکت سے ہر جگہ دھن دھنا کر موجود ہے۔ اس لئے عارفین فرماتے ہیں

کہ اللہ تعالیٰ کے نظر نہ آنے کی دو وجوہات ہیں۔ ایک یہ کہ وہ انتہائی اظہر ہے، دوسری وہ انتہائی اقرب ہے۔ اظہر کے معنی ہیں نہایت ہی سخت ظہور پذیر اور اقرب کے معنی ہیں نہایت ہی قریب۔ جب ایک ہزار Candle Power کے بلب کی طرف آپ نہیں دیکھ سکتے اور سورج کی روشنی سے آپ کی آنکھیں چندھیا جاتی ہیں۔ تو اس سورج جیسے لاکھوں سورج پیدا کرنے والی ہستی کو آپ کیسے دیکھ سکتے ہیں؟ سائنس کا انکشاف جو حقیقت پر مبنی ہے تو یہ ہے کہ روشنی نظر ہی نہیں آتی۔ روشنی کا احساس اس وقت ہوتا ہے جب مادی اشیاء پر پڑتی ہے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ جو اپنی مطلقیت میں مجسم نور ہے، آپ کو کیسے نظر آ سکتا ہے؟ نیز جو چیز قریب تر ہوتی ہے کم نظر آتی ہے۔ ناک اور پلکیں اس لئے نظر نہیں آتی کہ آنکھوں سے قریب ترین فاصلہ پر ہیں۔ آپ کسی تصویر کو آنکھ سے بالکل قریب کر دیں تو نظر نہیں آئے گی۔ اب چونکہ باری تعالیٰ انسان سے اس قدر قریب ہے کہ دنیا کی کوئی اور چیز اتنی قریب نہیں ہے۔ حتیٰ کہ اس کے اپنے وجود اور جان سے بھی اللہ تعالیٰ زیادہ قریب ہے۔

ارشاد ہوتا ہے:

''ہم انسان سے اس کی شہ رگ سے بھی قریب ہیں۔'' (قٓ:16)

جب یہ بات ہے تو آپ اسے کس طرح دیکھ سکتے ہیں؟ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ آپ کو اس کی خبر بھی نہیں ہوتی۔ ہر چیز اور ہر جاندار اس کے عشق اور اس کی تسبیح میں مشغول ہے، غافل ہے تو صرف عقل غافل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ عقل والوں کو توجہ کرنے کے لئے کہتا رہتا ہے۔ ہاں اگر عقل صالح ہو تو اس کو عشق کی بنیاد بنایا جا سکتا ہے اور حقیقت بھی کچھ ایسی ہی ہے۔ اسی لئے عرفاء کا قول ہے کہ ذات باری تعالیٰ کے ثبوت کی ضرورت عقل کو ہے عشق کو نہیں۔ اگر آپ شیطان سے وجود باری تعالیٰ پر دلائل کا سہارا لے کر بحث کریں تو وہ آپ کی ہر دلیل میں شکست دے گا۔ لیکن اگر آپ کہیں کہ میں نے اپنے رب کو بغیر دلیل کے مانا تو شیطان شکست خوردہ ہو جائے گا۔

اقبال نے کیا خوب کہا ہے:

(یعنی) اس کا قلب مومن اور دماغ کافر ہے۔

اب جب کہ ہم اس مرحلے پر پہنچ چکے ہیں اور منازل یقین کی ابتداء کی جانب رواں دواں ہیں تو ایمان سے یقین تک کے سفر میں جو عنصر ان دونوں میں باہمی ربط پیدا کرتا ہے اور جہد مسلسل سے بھرپور ہے وہ توکل سے متعلق ہے اور منازل یقین بیان کرنے سے قبل ضروری ہے کہ اس توکل سے متعلق چند بنیادی حقائق سے آگاہی حاصل کر لی جائے۔

توکل

وَ مَنْ یَّتَوَکَّلْ عَلَی اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بَالِغُ اَمْرِهٖ ؕ
قَدْ جَعَلَ اللّٰهُ لِكُلِّ شَیْءٍ قَدْرًا (طلاق:3)

''اور جو کوئی اللہ پر بھروسہ رکھے تو اس کو کافی ہے۔ بے شک جو خدا کو منظور ہوتا ہے وہ اس کو پورا کر کے رہتا ہے۔ اللہ نے ہر چیز کا اندازہ ٹھہرا رکھا ہے''۔

متوکل وہی ہے جو فال نہ لیتا ہو اور اپنے رب پر بھروسہ رکھتا ہو۔

''و علی اللّٰہ فتوکلوا ان کنتم مومنین''

(یعنی) خدا پر توکل کرو اگر ایمان والے ہو۔

اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِیْنَ (آل عمران:159)

(یعنی) توکل کرنے والوں کو خدا دوست رکھتا ہے۔

وَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَنُبَوِّئَنَّهُمْ مِّنَ الْجَنَّةِ
غُرَفًا تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا ؕ نِعْمَ اَجْرُ
الْعٰمِلِیْنَ ﴿۵۸﴾ الَّذِیْنَ صَبَرُوْا وَ عَلٰی رَبِّهِمْ یَتَوَكَّلُوْنَ

(العنکبوت:58-59)

'' (یعنی) اور جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل کئے ان کو ہم بہشت کے بالا خانوں میں جگہ دیں گے۔ جن کے تلے نہریں بہہ رہی ہیں اور وہ اس

میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔ نیک عمل کرنے والے جنہوں نے دنیا میں صبر کیا اور اپنے پروردگار پر بھروسہ رکھتے ہیں۔ان کا بھی اچھا آخیر ہے''۔

بقول حافظ شیرازرحمۃ اللہ علیہ

تکیہ بر تقویٰ و دانش در طریقت کافریست
مرد رہ گر صد ہنر دارد توکل بایدش

جو شخص معنیٰ ''نعم المولیٰ و نعم الوکیل'' بخوبی سمجھے اور ایمان لائے کہ دنیا میں جو کچھ ہوتا ہے خدا کے حکم سے ہوتا ہے اور اس کا فاعل کوئی دوسرا نہیں اور اس کے علم میں کسی قسم کا نقصان نہیں اور اس کی رحمت اور عنایت ایسی ہے، نہایت ہے کہ اس سے زیادہ ہونا ممکن نہیں۔ تب اس کا دل فضل الٰہی پر بھروسہ کر کے غلط تدبیر ترک کر کے سمجھے گا کہ روزی مقدر ہے اور وقت پر مجھے پہنچے گی اور میرے سب کام خدا کے فضل و کرم سے ٹھیک ہوں گے اور وہی حافظ ہے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''اگر تم توکل کرو گے تو حق تعالیٰ تم کو اسی طرح رزق دے گا جس طرح پرندوں کو دیتا ہے۔''

کیونکہ پرندے اپنے گھونسلوں میں کل کے لئے دانہ جمع نہیں کرتے۔کل کی فکر آج نہیں کرتے۔ اپنے کام خدا کے حوالے کر دیتے ہیں۔توکل دل کی حالت ہے جس کا ثمرہ یقین ہے۔توکل دو چیزوں کے معنی پر ہے۔ایک یہ کہ توحید پر ایمان لاؤ اور دوسرے اللہ کے لطف و رحمت پر ایمان لاؤ۔خدا بزرگ و برتر نے سب بندوں کو توکل کا حکم کر کے ایمان کی شرط پر ٹھہرایا ہے۔

اور فرمایا:

وَمَنْ یَّتَوَکَّلْ عَلَی اللّٰہِ فَھُوَ حَسْبُہٗ (طلاق:3)

''(یعنی) جو شخص خدا پر بھروسہ کرے اللہ اس کو بہت ہے''۔

حضرت داؤد علیہ السلام پر وحی آئی کہ اے داؤد علیہ السلام! جب کوئی بندہ سب کو چھوڑ کر میری پناہ لے گا گو کہ آسمان زمین کی خلقت فکر و فریب سے اس پر حملہ کریں تو میں اس کی مشکل آسان کروں گا۔ اور حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ایک راہب سے دریافت کیا تو روزی کہاں سے کماتا ہے؟ بولا تو روزی دینے والے سے پوچھ کہ کہاں سے پہنچاتا ہے۔ مجھ کو اس بات کا علم نہیں۔ ایک دفعہ ایک بزرگ سے کسی نے دریافت کیا کہ تو ہمیشہ عبادت میں رہتا ہے تو پھر روزی کس طرح حاصل کرتا ہے؟ اس نے دانتوں کی طرف اشارہ کیا۔ یعنی جس نے چکی پیدا کی ہے اناج پہنچاتا ہے۔

حذیفہ مرعشی سے نقل ہے کہ لوگوں نے ان سے دریافت کیا کہ تو نے حضرت ابراہیم علیہ السلام میں کیا دیکھا کہ اس کی خدمت بجالایا؟ کہا ایک دفعہ ہم بھوک سے بے تاب ہوئے تو انہوں نے کہا کہ قلم، دوات اور کاغذ لا۔ میں نے حاضر کیا تو انہوں نے عبارت لکھی۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم اور کہا ثنا اور ذکر و شکر اس کا جو میرا حق ہے اور اس میں ان تینوں کا ضامن ہوں۔ پھر کہا جو کپڑا اور پانی تجھ سے متعلق ہے تو ان کا ضامن نہیں۔ بعد میں یہ رقعہ مجھے دے کر کہا کہ باہر جا اور دل کسی سے مت لگا اور جو شخص تمہیں پہلے ملے اس کو یہ رقعہ دے دینا۔ پھر جب میں باہر گیا تو ایک شخص کو دیکھا جو اونٹ پر سوار تھا۔ میں نے اس کو دے دیا۔ مکتوب کو دیکھ کر وہ رو پڑا اور کہنے لگا کہ اس رقعہ کا کاتب کہاں ہے؟ میں نے کہا مسجد میں۔ اس نے چھ سو دینار کی تھیلی مجھے دی۔ میں نے لوگوں سے دریافت کیا کہ یہ شخص کون تھا؟ انہوں نے بتایا کہ نصرانی ہے۔ میں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس جا کر سب ماجرا بیان کیا۔ کہا اس تھیلی کو ہاتھ مت لگانا کیونکہ کسی دم میں تھیلی کا مالک آتا ہی ہوگا۔ فی الفور وہ نصرانی آیا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قدم پر بوسہ دے کر ایمان سے مشرف ہوا۔

عیال دار آدمی اس پر سزاوار نہیں کہ صحرا اور بیابان میں پھرے اور کسب سے دست بردار ہو اور توکل کا سب کا ہے۔ جیسا حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کرتے تھے اور جو دونوں صفتوں سے موصوف ہو توکل اس کو سزاوار ہے۔ یعنی اک یہ کہ بھوک میں صبر کرے

اور جتنا ملتا ہو خواہ مولی اور شلجم ہی ہو یا جنگل کے پھل یا ساگ وغیرہ کی سبزی ہو اس پر قناعت کرے اور دوسرا وہ شخص جو سمجھے کہ روزی میرے مقدر کی ضرور ملے گی۔ لیکن اہل و عیال کو اس امر پر لانا دشوار ہے بلکہ اس کا نفس بھی عیال کا حکم رکھتا ہے جو بھوک پر صبر نہیں کرتا اور بے قرار ہوتا ہے۔ ایسے شخص کو لائق نہیں کہ کسب سے دستبردار ہو کر توکل کرے۔ اگر بیوی اور بچے صبر کی طاقت رکھتے ہیں۔ جیسے گھرانہ علی علیہ السلام تو کسب کا ترک کرنا روا ہے۔ لیکن جبراً زن و فرزند کو بھوک کی تکلیف دینا اور صبر پر مجبور کرنا روا نہیں اور جب کسی کا ایمان کامل ہو اور زہد و تقویٰ میں مشغول ہو اور اس کے باوجود کسب نہ کرے۔ جیسا کہ بچہ ماں کے شکم میں کسب کرنے سے عاجز ہے۔ خدا تعالیٰ اس کی روزی ناف کی راہ سے پہنچاتا ہے۔ جب بچہ پیدا ہوتا ہے ماں کی چھاتی سے اس کو رزق دیتا ہے۔ جب کھانا کھانے کی نوبت پہنچتی ہے تو اس کے دانت دیتا ہے اور پھر اگر وہ ذات تعالیٰ ماں باپ کو اٹھالے اور وہ یتیم ہو جائے تو دوسرے کے دل پر اس کے حقوق مہر و محبت غالب کر دیتا ہے اور وہ اس یتیم کے حال کی پرداخت کرتے ہیں اور پھر اگر تقویٰ کی جانب متوجہ ہو تو پھر بندوں کے دل میں اس کی شفقت پیدا کرتا ہے اب سب لوگ اس کو یتیم کی مانند ہی پیار کرتے ہیں۔ لیکن پھر اب وہ کسب کی قدرت رکھتا ہو اور سستی و بیکاری اختیار کرے تو خلائق کے دل میں اس کے لئے شفقت پیدا نہ ہوگی۔ ایسے کا توکل اور ترک کسب قبول نہیں۔ کیونکہ جب اپنے نفس کے ساتھ مشغول ہے تو چاہئے کہ اپنی غم خواری کرے اور اگر اپنے سے غافل ہو تو خدا کی طرف متوجہ ہے تو خدا تعالیٰ بہتوں کے دلوں کو اس پر مہربان کرے گا۔ یہی وجہ ہے کہ ہمیں کوئی ایسا زہد و متقی نظر نہیں آتا کہ جو بھوک سے ہلاک ہوا ہو۔ جو شخص ضرورت کے وقت اتنا کھائے کہ جس سے پیٹ پر ہو یا اتنا کپڑا پہنے کہ جس سے بدن ڈھک جائے اور پھر اس پر قناعت کرے تو اس نے توکل کو پورا کیا۔ توکل کی اصل حقیقت یہی ہے کہ امید کو کوتاہ کرے۔ متوکل اگر اپنے گھر کے دروازے بند کر کے مقفل کر دے تا کہ چور مال نہ لے جائے تو اس سے اس کا توکل باطل نہ ہوگا۔ اسی طرح اگر دشمن سے بچنے کے لئے تلوار ہمراہ

رکھے گا یا سردی سے بچاؤ کی خاطر جبہ ساتھ رکھے گا تو اس سے اس کا توکل باطل نہ ہوگا اور اگر متوکل کا مال چور لے جائے تو وہ غمگین نہیں ہوتا بلکہ تقدیر الٰہی پر راضی رہتا ہے۔ اگر متوکل نے شکایت کی اور چور کے نہ ملنے پر مبالغہ کیا اور بے تاب ہو گیا تو صبر کے درجے سے گر گیا پھر وہ نہ صابرین میں شامل ہے اور نہ متوکلین میں۔ اور متوکل اس بات پر ایمان لائے کہ حقیقت میں اللہ تعالیٰ وہی کام جو اس کے حق میں بہتر ہو انجام پذیر کرتا ہے اور بندہ اس سے ناواقف ہے کہ اس کی بھلائی کس میں ہے۔ جب گھر سے باہر جائے تو دل میں نیت کرے کہ اگر اس مال کو چور لے جائیں تو اسے بخش دیا کہ شائد وہ پردرد اور مفلس ہو اور میرے مال سے اس کی حاجت برآئے۔

روایت ہے کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کا ایک اونٹ چوری ہو گیا۔ بہت تلاش کیا مگر لاحاصل۔ بالآخر تھک ہار کر کہا فی سبیل اللہ اور مسجد میں آ کر نماز پڑھنے لگے۔ ایک شخص نے آ کر کہا کہ آپ کا اونٹ فلاں جگہ پر موجود ہے۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ اس کو ڈھونڈنے کی خاطر اٹھے اور جوتی پہنی۔ پھر استغفار کیا اور بیٹھ گئے اور کہا کہ میں نے فی سبیل اللہ کہا تھا اس لئے اب اس کا نام نہ لوں گا۔

ایک اور روایت میں ہے کہ ربیع ابن حیثم کا گھوڑا جو بہت بیش قیمت تھا اسے چور لے گیا۔ انہوں نے کہا کہ جب چور لے جا رہا تھا تو میں اسے دیکھ رہا تھا۔ کسی نے متجسس ہو کر دریافت کیا کہ کیوں چھوڑ دیا؟ کہا کہ وہ شغل جس میں میں اس وقت مصروف تھا وہ اس چور کو پکڑنے سے زیادہ بہتر تھا یعنی میں اس وقت حالت نماز میں تھا۔ لوگوں نے چور کو بددعا دی آپ نے کہا چپ رہو کہ میں نے اپنا گھوڑا چور کو بخش دیا۔ جس پر مردان راہ خدا چور پر غمگین ہوئے اور کہتے تھے کہ اس سے ایک معصیت ہوئی ہے وہ اس عذاب میں گرفتار ہوا۔

دوسری جانب اگر آگ کہیں لگی ہو تو اس کا علاج یہ ہے کہ اس پر پانی ڈالا جائے۔ اس قسم کے علاجوں سے دستبردار ہونا توکل کے لئے جائز نہیں بلکہ حرام ہے۔ اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''اے بندگان خدا دوا کیا کرو اور موت کے سوا کوئی بیماری ایسی نہیں جس کی دوا نہ ہو۔''

اصحاب رضی اللہ عنہم نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ کیا دوا اور افسوس تقدیر کو پھیر سکتی ہے؟

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''تدبیر بھی تقدیر الٰہی سے ہے۔ میں نے فرشتوں کی ایک جماعت پر گزر کیا۔ انہوں نے مجھ سے کہا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کو حجامت کا حکم کرو اور کہا کہ مہینے کی سترہویں اور انیسویں کو حجامت کرو اور فرمایا کہ اس منگل کو جو مہینے کی سترہویں تاریخ کو آوے۔ حجامت بنوانا ایک سال کی بیماری دور کرتی ہے۔''

اسی طرح حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم کی آنکھیں آشوب میں مبتلا تھیں تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو فرمایا! خرمات کھاؤ اور چقندر جو کے پانی میں پکاؤ۔ اور حضرت صہیب رضی اللہ عنہ کو فرمایا کہ تو کھجور کھاتا ہے حالانکہ تجھے جسم پر درد ہے اور اس ضمن میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا خود کا طریق یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہر شب سرمہ لگاتے تھے اور ہر مہینے میں حجامت بنواتے اور ہر سال دوا کھاتے اور سر پر مہندی لگاتے اور جب کسی عضو پر زخم لگتا اس پر مہندی لگاتے۔ اکثر زخم پر مٹی ڈالتے تھے۔ اس سلسلے میں مزید اگر کچھ جاننا ہے تو طب نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ایک کتاب ہے جسے علماء نے ترتیب دیا ہے اس سے رابطہ کریں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ایک بیماری ہوئی تو بنی اسرائیل نے کہا دوا کھائیے۔ آپ نے کہا دوا نہ کھاؤں گا جس سے بیماری رفع نہ ہوئی۔ حق تعالیٰ نے وحی بھیجی کہ جب تک تو دوا نہ کھائے گا شفا نہ بخشوں گا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دوا کھائی مزاج درست ہوا لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام غمگین ہو گئے۔ تب وحی نازل ہوئی کہ تو اپنے توکل سے میری حکمت کو باطل کرنا چاہتا ہے، دوا کی تاثیر اور فائدہ میرے ہی حکم سے ہے۔

حدیث شریف میں آتا ہے۔

''حضرت موسیٰ علیہ السلام نے خدا سے پوچھا کہ بیماری کس سے ہے اور شفاء کس سے؟ حق تعالیٰ نے فرمایا! بیماری اور صحت دونوں میرے حکم سے ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ پھر طبیب کی کیا ضرورت ہے؟ حکم ہوا اطباء اس واسطے ہیں کہ علاج کے سبب سے روزی کمائیں اور میرے بندوں کا دل خوش کریں۔''

پس توکل اسباب میں بھی علم اور احوال سے درست ہوگا۔ یعنی خدا جو موثر حقیقی ہے پر بھروسہ کرے نہ کہ دوا پر۔ اور دوا بھی شفایابی کے لئے اللہ سے اجازت طلب کرتی ہے۔ جیسا وہاں سے حکم ہوتا ہے ویسا اثر کرتی ہے۔ کسی کے لئے تریاق کا حکم ہوتا ہے اور کسی کے لئے زہر کا۔

ایک حکایت میں ہے کہ ایک بزرگ کہتے ہیں میں ایک روز بازار میں گیا وہاں ایک چڑی مار کو دیکھا کہ دو ہدہد گرفتار کئے ہوئے ہے اور وہ ہدہد آپس میں کہتے ہیں ''لا یرحم لا یرحم ''یعنی جو کسی پر رحم نہیں کرتا اللہ اس پر رحم نہیں کرتا۔ اور اپنی آزادی کیلئے خدا سے دعا کرتے ہیں اور پھڑک رہے ہیں۔ مجھے ان پر رحم آیا اور چڑی مار سے ان کی رہائی کے لئے کہا۔ اس نے دو درہم ان کی قیمت کہی اور میرے پاس اس وقت صرف دو ہی درہم تھے۔ اس لئے میری عقل نے روکا اور رخصت نہیں دیتی تھی اور دل ان سے بے قرار رہتا۔ پس اپنے اوپر میں نے توکل کیا اور ان کو خریدا اور شہر سے باہر لے جا کر چھوڑ دیا۔ انہوں نے ایک دیوار پر بیٹھ کر مجھ کو آواز دی اور عذر کر کے کہنے لگے کہ اس وقت ہم اس احسان کا بدلہ نہیں دے سکتے لیکن اس دیوار کے نیچے ایک صندوقچہ جواہر کا موجود ہے۔ تم زمین کھود کر اس کو نکال لو۔ مجھے ان کے کہنے سے بہت تعجب ہوا کہ عجب معاملہ ہے کہ تم نے زمین کے نیچے کا خزانہ معلوم کر لیا اور جال جو زمین پر تھا نہ دیکھا۔ انہوں نے جواب دیا کہ جب مصیبت آتی ہے تو عقل جاتی رہتی ہے۔ اور میں نے زمین کھود کر وہ جواہر کا صندوقچہ نکال لیا

جس کی وجہ سے اب میں فارغ البالی سے زندگی بسر کرتا ہوں۔

پس چونکہ انہوں نے توکل کیا تھا اس لئے اللہ نے ان کو اس توکل کا کیا اچھا صلہ دیا اور ہدہد اپنی بولی میں کہتا رہا" لا یرحم لا یرحم"

جانور ذکر الٰہی میں رہے
آدمی افسوس! اس سے چپ رہے
جس کے ذاکر اس قدر حیوان ہیں
اس سے غافل کس قدر انسان ہیں
کاش ہم ان سے سبق حاصل کریں
یاد حق میں کاش ہم بھی تو رہیں

اگر انسان نے حضرت انساں بننا ہے تو وہ یہ اعتقاد رکھے کہ جو کچھ قسمت کا ہے وہ پہنچے گا۔ اگرچہ سارا جہان اس کے رفع کرنے میں کوشش کرے اور جو قسمت میں نہیں وہ میری کیا سارے جہان کی کوشش سے بھی نہیں پہنچے گا۔

قُلْ لَّنْ يُّصِيْبَنَآ اِلَّا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَنَا ۚ هُوَ مَوْلٰنَا ۚ وَ عَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ (توبہ:51)

"اے پیغمبر! (تم ان لوگوں سے کہہ دو) کہ جو کچھ خدا تعالیٰ نے ہمارے واسطے لکھ دیا ہے اس کے سوا (کوئی اور) مصیبت تو ہم کو پہنچ سکتی نہیں۔ وہی ہمارا کارساز ہے اور مسلمانوں کو چاہئے کہ بس اللہ ہی پر بھروسہ رکھیں"۔

ایک روایت کے مطابق حلب کے بادشاہ کے دولڑکے تھے۔ عنفوان جوانی میں ہمت کے پست کھیل میں رات دن مست رہتے۔ بادشاہ نے ان کا یہ رنگ دیکھ کر دوراندیشی سے ایک درویش خدا کو جس سے بادشاہ کو حسن عقیدت تھی کے مکان کی زمین میں زر و جواہر خفیہ طور پر دفن کروایا اور فقیر سے کہہ دیا کہ اگر میرے مرنے کے بعد دولت دنیا ان سے منہ موڑ لے تو مناسب جان کر تم ان کو دفینہ کی اطلاع دینا کہ جس سے یہ اس وقت آہن میں ہوشیار

ہوکر زر کی قدر پہچانیں اور فضول خرچی سے باز آئیں۔ اس کے سوا بادشاہ نے شہزادوں کو دھوکا دینے کے لئے محل سرائے میں بھی کنواں کھدوایا اور یہ ظاہر کیا کہ اس میں خزانہ دفن کرتا ہوں اور بیٹوں سے کہا کہ جب تم پر وقت پڑے اور نہایت احتیاج ہو تو اس خزانہ کو کھود کر اپنی حاجت روائی کرنا۔ چند روز بعد حکم الٰہی سے بادشاہ اور درویش دونوں رحلت فرما گئے اور دونوں بھائی بادشاہت کے اوپر جھگڑنے لگے۔ انجام یہ ہوا کہ بڑا بھائی غالب آیا اور اس نے ملک وخزانہ کو اپنے قبضہ میں کرلیا۔ دوسری جانب چھوٹے بھائی نے فقیری اختیار کر کے اسی درویش کے مکان میں رہنا شروع کر دیا۔ اتفاقاً چھوٹا شہزادہ فقیری کے عالم میں کچھ زمین مکان درست کرنے کی خاطر کھودنے لگا۔ دفعتاً خزانہ شاہی نکل آیا اور اس نے سجدہ شکر ادا کیا اور کچھ زر نکال کر بتدریج خرچ کرنے لگا۔ توکل کو اس نے ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ جب کچھ دن بڑے شہزادہ کو تخت نشین ہوئے گزر گئے تو عیاشی اور آرام کی جانب اس کی طبیعت مائل ہوئی۔ رعیت اور لشکر سے بے پروا ہوکر جو کچھ اس کی وراثت میں ملا تھا اس نے اڑا دیا۔ اس کی بے پروائی سے ملک کی حالت بدتر ہوگئی۔ ہمسایہ ملک کے بادشاہ نے حالات دیکھے تو اس نے چڑہائی کر دی۔ اس وقت کے لئے بڑے شہزادے نے مایوس ہوکر سلطنت غنیم سے صف آرائی کی۔ بدقسمتی سے پہلی ہی لڑائی میں دونوں بادشاہ مارے گئے۔ طرفین کے وزیروں نے آپس میں صلاح اور امن رکھنے کے لئے مناسب جان کر چھوٹے شہزادہ کو جو فقیری بھیس میں متوکلانہ رہتا تھا تخت نشین کر دیا۔ اس حکایت سے حاصل یہی ہے کہ چھوٹے شہزادہ کے ساتھ ابتداء میں آبائی تخت جاتا رہا تھا مگر توکل کی برکت سے آخر کار غنیم کا تخت بھی مل گیا اور اپنا آبائی تخت وخزانہ بھی۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کو جو اللہ تعالیٰ پر توکل کرے تو اللہ تعالیٰ کافی ہے۔

نقل ہے کہ حضرت حبیب عجمی رحمۃ اللہ علیہ کا حجرہ بصرہ کے بازار کے چوراہے پر تھا۔ کبھی کبھی کسی مصلحت کے واسطے وہاں بھی بیٹھتے تھے۔ ایک مرتبہ پوستین چھوڑ کر وضو کو چلے گئے۔ ناگاہ حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ آ گئے پوستین پڑا دیکھ کر کھڑے ہوگئے اور کہا کہ

حضرت حبیب عجمی کو بعض وقت کچھ خیال نہیں ہوتا اور پوستین چوراہے میں ڈال کر چلے گئے۔ یہ خیال نہ کیا کہ کوئی لے جائے گا۔ اچانک وہ بھی آ گئے اور ایک دوسرے سے سلام کیا۔ حضرت حبیب عجمی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ سے کہا اے امام وقت! تم کہاں؟ کہا تمہاری پوستین اور حجرہ کی نگہبانی کرتا تھا اور سخت تعجب ہے کہ چوراہے میں سب سامان کس کے بھروسہ پر چھوڑ کر چلے گئے؟ کہا اس کے بھروسہ پر جس نے تم کو نگہبانی کے واسطے بھیج دیا۔

ایک اور روایت اس ضمن میں بیان ہے کہ حضرت سلمان رازی رحمۃ اللہ علیہ سے نقل ہے کہ میں ایک مرتبہ واسطے زیارت قبور انبیاء علیہ السلام کے بیت المقدس کو جا رہا تھا۔ ناگاہ ایک لڑکی راہ میں ملی۔ لڑکی نے دریافت کیا اے شیخ! کہاں جاتے ہو؟ میں نے کہا بیت المقدس کو جاتا ہوں۔ کہا آؤ مصافحہ کرو اور آنکھیں بند کرلو۔ میں نے مصافحہ کر کے بعد لمحے کے آنکھیں کھول دیں۔ دیکھا تو بیت المقدس میں موجود تھا۔ یہ ماجرا دیکھ کر □ ہو گیا دو تین درہم میرے پاس تھے وہ اس کو دینے لگا اور معذرت کرنے لگا۔ وہ مسکرا کر کہنے لگی کہ مجھ کو حاجت نہیں۔ ناگاہ دیکھا کہ اس کے دونوں ہاتھوں میں سرخ دینار تھے کہنے لگی کیا تمہارا اللہ پر بھروسہ نہ تھا جو گھر سے خرچ کرنے نکلے۔

خدا خود میر سامان است اسباب توکل را

مقام توکل کو قرآن و حدیث اور حکایات بزرگان دین کے آئینے میں مختصراً عکس بند کرنے کے بعد اب اس ضمن میں کچھ ذاتی تجربات بیان کرنے کی جسارت چاہوں گا تاکہ زمانہ حال کے مطابق توکل کے پنپناتے تصور کو روزمرہ کے معمولات زندگی کے مطابق واضح کرسکوں۔ اس ضمن میں چند واقعات درج ذیل ہیں۔

میرے زمانہ طالب علمی میں کہ جب میں گورنمنٹ کالج لاہور میں بی اے کا طالب علم تھا۔ میں اپنے کالج کے ٹینس کلب (Tennis Club) کا ممبر بھی تھا تاکہ اپنی استعداد حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ جسمانی ورزش بھی ہوتی رہے۔ ایک روز کھیل سے فراغت

کے بعد میں اور میرے کچھ دوست ایک کمرے میں جا کر بیٹھ گئے اور گفتگو کا سلسلہ چل نکلا۔ ان باتوں کا موضوع تو ٹینس تھا مگر آہستہ آہستہ اپنی ذاتی مشکلات کا ذکر چل نکلا۔ ان میں سے خاص طور پر ایک دوست بڑا دل گرفتہ سا دکھائی دے رہا تھا اور ہم سب اسے اس غرض سے کلب میں لائے تھے کہ کھیل میں اس کی طبیعت بہل جائے اور اس کے دل کا بوجھ قدرے ہلکا ہو جائے اب جبکہ سب کھیل سے فارغ ہو چکے تھے تو ہم اسے طرح طرح کی تجویزیں پیش کرر ہے تھے۔ آخر میں نے تجاویز سے بالاتر ہو کر عملی طور پر اس کی مشکل میں امداد کا فیصلہ کیا کیونکہ مجھے خود بھی کم سنی میں اپنے والد بزرگوار کی رحلت میں بعد زندگی میں بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ مگر ان مسائل کا کوئی نہ کوئی فائدہ مند حل نکال ہی لیتا تھا۔ میں اٹھ کھڑا ہوا اور اپنے مغموم دوست کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہنے لگا (ح)! میرے خیال میں مری باتوں کو تم وعظ نہ سمجھنا یہ وعظ نہیں ہے۔ مگر ان میں ایک راز ضرور پوشیدہ ہے جس کی مدد سے میں اپنی مشکلات پر قابو پانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ اگر تم ان پر عمل پیرا ہونے کی کوشش کرو گے تو یہ ضرور تمہاری مدد کر سکتی ہیں۔ میں تم سے ایک بات کہنا چاہتا ہوں کہ تم اس طاقت پر بھروسہ کیوں نہیں کرتے؟

میں نے اپنے مغموم دوست کے کندھے کو تھپتھپایا اور اسے اپنی جانب سے ہر قسم کی امداد کی یقین دہانی کرائی۔ وہ کہنے لگا کہ جو کچھ تم نے کہا ہے میں اس کا مطلب سمجھتا ہوں میں جانتا ہوں کہ وہ بڑی طاقت کون سی ہے۔ مگر اس بڑی طاقت سے مستفید ہونا مجھے نہیں آتا، مجھے اس کی سخت ضرورت ہے۔ لیکن آہستہ آہستہ تھوڑے ہی عرصے میں اسے عظیم طاقت سے مستفید ہونے کا طریقہ معلوم ہو گیا اور اس انکشاف نے اس کی زندگی میں انقلاب برپا کر دیا۔ اب وہ ایک خوش اور صحت مند انسان ہے۔ میں نے جو اسے نصیحت کی تھی وہ خالص نیت سے واقعتاً حکمت و دانائی پر مبنی تھی۔ موجودہ زمانے میں آپ کو بہت سے ایسے لوگ ملیں گے جو اپنے سے یا اپنے حالات سے خوش نہیں ہیں۔ وہ اپنی مرضی کے خلاف اس قسم کی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہیں ان کی کامیابی اور خوشی کا راز فقط اس امر میں

پوشیدہ ہے کہ وہ اس عظیم طاقت پر بھروسہ کریں اس سے مستفید ہونے کی کوشش کریں۔ مگر اس عظیم طاقت سے مستفید کس طرح ہوا جا سکتا ہے۔

مجھے ایک ذاتی تجربہ پیش کرنے کی اجازت دیجئے۔ میرے والد بزرگوار کے وصال کے بعد اپنے ایام جوانی میں جب مجھے کسی اجلاس یا مجمع کے سامنے کچھ تھوڑا بہت کہنا پڑتا تھا تو میں اپنے ذہن پر بڑا بوجھ محسوس کرتا تھا۔ میں کچھ تحریروں کو بڑی محنت سے تیار کرتا تھا مگر اسے اچھی طرح ادا نہیں کر سکتا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ میں خود کو بڑا تھکا تھکا محسوس کرتا۔ جیسے میرے جسم میں جان نہ رہی ہو۔ میں بچپن میں اپنے دادا صاحبزادہ سید پیر فیض الحسن شاہ رحمۃ اللہ علیہ کے دست حق پرست پر بیعت ہوا تھا۔ لیکن پھر ان کے اور میرے والد بزرگوار کے وصال کے بعد مجھے ایک اور ہستی کی صحبت اختیار کرنے کا موقع میسر آیا اور انہوں نے میری زندگی پر اس قدر اثر کیا کہ میں نے ان کے دست اقدس پر بیعت کر لی اور فی زمانہ شائد میں ہی ان کا واحد مرید ہوں (مجھے یہ حکم نہیں کہ میں ان کا اسم ظاہر کروں)۔ بہرکیف جب میری تکلیف بڑھنے لگی تو میں اپنے مرشد بزرگوار کے پاس گیا اور انہیں ساری حقیقت و کیفیت بیان کی۔ وہ میری بات سن کر قدرے مسکرائے اور کہنے لگے۔ ''میرے خیال میں تم اپنے ذہن پر بہت بوجھ ڈالتے ہو'' پھر وہ مجھ سے کہنے لگے کہ اپنی آنکھیں بند کر لو اور اپنے جسم اور ذہن کو ڈھیلا چھوڑ کر حالت آرام میں آنے کی کوشش کرو اور جو کچھ میں تمہیں بیان کروں انہیں اپنی سماعت سے دل میں اتارنے کی کوشش کرو۔ میں نے ان کے کہنے پر عمل کیا۔

پھر وہ کہنے لگے۔

''ان الفاظ کو اپنے تحت الشعور میں سمونے کی کوشش کرو اور کیا تم نہیں جانتے؟ کیا تم نے یہ نہیں سنا کہ خدا ابدی ذات کا مالک، اس دنیا کا تخلیق کرنے والا کبھی نہیں تھکتا؟ اس کے لامتناہی سلسلوں کو کوئی نہیں سمجھ سکتا۔ وہ کمزوروں کو چلنے پھرنے کی طاقت عطا فرماتا ہے جو لوگ اس کی ذات پر توکل رکھتے ہیں وہ زندگی

کی دوڑ میں کبھی تھکان محسوس نہیں کرتے۔ وہ زندگی کے کڑے کوسوں میں ان کے ساتھ ہوتا ہے۔ اس کی پرواز شاہین جیسی ہوتی ہے۔ خدا کی ذات پر بھروسہ رکھنے کی عادت ڈالو وہ تمہیں تعمیری قوتوں سے مالا مال کر دے گا۔"

پھر وہ مجھ سے مخاطب ہو کر کہنے لگے۔

"اپنا کام جی لگا کر کرو۔ مگر ذہن پر کسی قسم کا بوجھ نہ محسوس ہونے دو۔ ہر چیز متحمل مزاجی سے کرو۔ یوں کرنے سے تمہارا کام بھی پایۂ تکمیل کو پہنچ جائے گا اور تم زندگی میں کسی قسم کی تھکان وغیرہ بھی محسوس نہیں کرو گے۔"

یہ اخلاقی باتیں بلاشبہ میں پہلے سے بھی جانتا تھا۔ لیکن جس انداز سے اور جس زبان سے یہ الفاظ ادا ہوئے انہوں نے میری زندگی کا رخ ہی تبدیل کر دیا اس موقع کو ایک مدت ہو چکی ہے مگر ہر وقت ان کے الفاظ میرے ذہن میں محو گردش رہتے ہیں۔ انہوں نے مجھے اس عظیم طاقت سے مستفید ہونا سکھا دیا تھا اور یقین کیجئے اس نصیحت نے اپنا پورا کام کیا ہے۔ میری زندگی گزشتہ کچھ سالوں سے کافی مصروف ہے۔ مگر اس کے باوجود میں نے کبھی تھکاوٹ محسوس نہیں کی۔ میرے الفاظ میں لوگ سوز کی شدت کو محسوس کرتے ہیں اور میری تحریر میں پختگی پیدا ہونے لگی اور یہ سب کچھ میرے مرشد بزرگوار کی وجہ سے ہے کہ جنہوں نے مجھے توکل کی دولت سے مستفید ہونا سکھا دیا۔ اس عظیم طاقت سے مستفید ہونے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ ہر مسئلہ کی طرف آپ کا رویہ بڑا رجائی اور پر امید ہونا چاہئے۔ آپ میں جس قدر اعتماد ہو گا اس قدر اس مسئلہ کو حل کرنے کے لئے آپ میں قوت پیدا ہو گی۔ اس عظیم طاقت کے وجود سے آپ انکار نہیں کر سکتے یہی عظیم طاقت آپ کے لئے سب کچھ کر سکتی ہے۔ جب آپ اس عظیم طاقت سے مستفید ہو سکتے ہیں تو زندگی میں کسی شکست کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ خدا کی بارگاہ میں اپنی مشکل کو پیش کر دیں۔ اس سے جواب کی امید رکھیں۔ اس بات پر یقین رکھیں کہ آپ خدا کی مدد سے اپنی مشکلات پر قابو پا رہے ہیں۔

ایک دفعہ ایک میاں بیوی جو واقعی بڑی تکلیف میں تھے میرے پاس آئے۔ میاں ادبی

حلقے میں خاصہ مقبول تھا اور اس کی بڑی عزت کی جاتی تھی۔ مگر اس کی بیوی کی صحت خراب ہونے کی وجہ سے وہ لوگ شہر چھوڑ کر گاؤں میں چلے آئے تھے۔ جہاں وہ ایک قسم کی نیم تنہائی میں رہ رہے تھے۔ اس شخص نے مجھے بتایا کہ پچھلے دنوں اسے دو مرتبہ اختلاج قلب کے دورے پڑ چکے ہیں۔ ایک تو ان میں کافی شدید تھا۔ ادھر اس کی بیوی کی صحت بھی دن بدن خراب ہو رہی تھی۔ اس کی وجہ سے وہ اور بھی فکر مند رہا کرتا تھا۔ وہ مجھ سے پوچھنے لگا کہ کیا ہم میں کسی طرح اتنی طاقت آ سکتی ہے کہ ہم اپنی جسمانی بیماریوں کا ہمت کے ساتھ مقابلہ کر سکیں اور ہمارے اندر نئی امیدیں پیدا ہو جائیں؟ جیسا کہ اس نے بتایا کہ اس کے حالات اب تک مایوسیوں کا پلندہ ہیں۔ اس کی نازک مزاجی اور نفاست پسندی سے میں نے اندازہ لگایا کہ جو اعتماد میں اس کے اندر پیدا کرنا چاہتا ہوں اسے وہ بمشکل اپنے دل میں جگہ دینے کو تیار ہوگا۔ مجھے شک تھا کہ مذہب نے جو اعتماد کا درس دیا ہے یہ فیشن زدہ شخص شائد ہی اسے قبول کر سکے۔ لیکن اس نے مجھے یقین دلایا کہ وہ میری ہر بات پر عمل کرنے کو تیار ہے۔ اس کے خلوص نیت کو دیکھ کر میرے دل میں اس کے لئے ہمدردی کے جذبات امڈ آئے۔ میں نے اسے ایک سادہ نسخہ بتایا۔ میں نے اسے ہر روز کلام الٰہی کے مطالعہ کرنے کو کہا تاکہ اس کا ذہن ان احکامات سے گھل مل جائے۔ میں نے اسے آئتیں یاد کرنے کو کہا۔ ساتھ ساتھ میں اسے یہ بھی تجویز کرتا گیا کہ وہ اپنے آپ کو خدا کے ہاتھوں میں چھوڑ دے اور اس بات پر یقین رکھے کہ خدا کی ذات اسے اور اس کی بیوی کو اپنی طاقت عطا کر رہی ہے اور زندگی کے ہر پر پیچ مسئلہ میں خدا ان کی رہنمائی کر رہا ہے۔ ان سے بڑھ کر میں نے کلام الٰہی کا شیدائی کسی کو نہیں دیکھا۔ وہ اکثر میرے ہاں آیا کرتے اور کلام پاک کی منتخب آیات مجھے سنایا کرتے تھے۔ میں ان لوگوں کے ساتھ بیٹھنے میں فخر محسوس کرنے لگا تھا۔ ایک روز اس کی بیوی کہنے لگی کہ اس سے قبل میں نے کبھی اتنا خوبصورت موسم بہار نہیں دیکھا اور اس بار تو پھول پورے اپنے جوبن پر ہیں، شفق کے رنگ تو اور زیادہ نکھر گئے ہیں، پرندوں کے نغموں میں ایک قسم کا رس اتر آیا ہے۔ یہ الفاظ کہتے وقت اس کا چہرہ خوشی سے

دمک رہا تھا جیسے روحانی طور پر وہ دوبارہ زندہ ہوگئی ہو۔ اس کی صحت آہستہ آہستہ سنبھلنے لگی۔ تھوڑے ہی عرصہ میں وہ ایک نئی زندگی سے ہمکنار ہوگئی۔ جہاں تک اس کے شوہر کے اختلاج قلب کا تعلق تھا وہ بھی ختم ہو گیا۔ وہ جسمانی، روحانی اور ذہنی طور پر خود کو بڑا تندرست محسوس کرنے لگا۔ وہ لوگ دوبارہ شہر واپس چلے آئے۔ ان کی زندگی پھر پہلے کی طرح مصروف ہوگئی جو بھی ان سے ملتا بس انہی کا ہو کر رہ جاتا۔

انسانی زندگی میں یہ عظیم طاقت ایک بہت بڑی حقیقت ہے۔ میں نے بہت مرتبہ کئی شکستہ دل، مصیبت زدہ اور پریشان حال لوگوں کو اس طاقت سے مستفید ہو کر نئی زندگی پاتے دیکھا ہے۔ یہ طاقت آپ کو ہر وقت میسر ہو سکتی ہے۔ اگر آپ اپنے دل و ذہن کو کشادہ رکھیں تو یہ ایک منہ زور موج کی طرح ان میں داخل ہو جائے گی۔ انسان ہر قسم کے حالات میں اسے حاصل کر سکتا ہے۔ اس طاقت کی موج کا اتنا زور ہوتا ہے کہ یہ پست خیالات کو تنکوں کی مانند اپنی زد میں بہا کر لے جاتی ہے اور ان کی جگہ محبت، خوشی اور اچھائی کے عناصر دل و ذہن میں بھر دیتی ہے۔

کسی شرابی انسان کا بنیادی اصول یہ ہوتا ہے کہ اسے اس حقیقت کا علم ہوتا ہے کہ وہ شرابی ہے اور اپنی کوئی مدد نہیں کر سکتا۔ یعنی اس کی شخصیت بالکل شکست خوردہ ہوتی ہے۔ جب وہ اس عظیم طاقت کے نظریہ کو قبول کرے تو جان جائیے کہ اس کا علاج کسی حد تک ممکن ہو سکتا ہے۔ اس کی بے بسی ہی اس کی راہ نجات بن سکتی ہے۔ ایسا شخص اس عظیم طاقت کو جلدی قبول کر سکتا ہے۔ پھر یہ دیکھنا کہ اس عظیم طاقت پر بھروسہ کرنے میں وہ کس حد تک رضامند ہے۔ انسانی زندگی میں اس طاقت کا ظہور ایک بہت دلچسپ اور دلولہ انگیز تجربہ ہے۔ دنیا کی اور کوئی طاقت اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ مادی طاقتیں حاصل کر لینا کوئی بڑی بات نہیں۔ انسانی مشین کو بغیر کسی خرابی کے چلائے رکھنا بڑی مشکل بات ہے۔ اس کے لئے ہنرمندی کی ضرورت ہے اور یہ ہنرمندی صرف اس عظیم طاقت سے ہی حاصل ہو سکتی ہے۔

ایک دفعہ ایک شرابی مجھے اپنی داستان حیات سنا رہا تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ اس نے

اٹھارہ سال کی عمر میں شراب پینا شروع کی تھی۔ تیس برس کی عمر میں وہ عادی شرابی بن گیا۔ اسے اپنی بیوی، ماں اور ساس سے اتنی نفرت ہوگئی تھی کہ وہ انہیں قتل کرنے پر آمادہ ہو چکا تھا۔ کیونکہ وہ اسے ہر وقت لعنت ملامت کرتی رہتی تھیں۔ بہتر یہی ہے کہ میں اس کی کہانی اسی کے الفاظ میں آپ کو سناؤں۔ وہ کہتا ہے کہ میں اپنے اس ارادے کو عملی جامہ پہنانے کی غرض سے ایک شراب خانے میں چلا گیا۔ تاکہ تھوڑی سی شراب پینے سے میرے اندر اور طاقت آجائے اور میں ان کو قتل کرنے میں کامیاب ہو جاؤں۔ جب میں شراب خانے میں داخل ہوا تو ایک شخص جس سے مجھے نفرت تھی وہاں بیٹھا کافی پی رہا تھا۔ اسے شراب خانے میں کافی پیتے ہوئے دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی کیونکہ وہ تو مہینے میں ہزاروں روپے شراب میں بہا دیا کرتا تھا۔ مگر اس وقت اس کے چہرہ پر ایک عجیب سی روشنی کھیل رہی تھی۔ اسے اس حال میں دیکھ کر میرا دل اس سے باتیں کرنے کو چاہنے لگا۔ چنانچہ میں اس کی میز پر جا بیٹھا اور اس سے متجسس ہو کر دریافت کیا کہ آپ پر ایسی کیا افتاد آپڑی کہ شراب چھوڑ کر کافی پینا شروع کر دی۔ اس نے کہا آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ میں نے ایک سال سے شراب چھوڑ رکھی ہے۔ مجھے یہ سن کر سخت تعجب ہوا کیونکہ اس کا شراب چھوڑ دینا میرے خیال میں ایک ناممکن بات تھی۔ اگرچہ میں اس سے نفرت کرتا تھا مگر اس واقعہ نے مجھے بڑا متاثر کیا۔ میں خاموشی سے اس کی باتیں سنتا رہا پھر وہ مجھ سے مخاطب ہو کر کہنے لگا کہ آپ نے کبھی شراب نوشی ترک کرنے کا ارادہ کیا ہے؟ میں نے جواب دیا کیوں نہیں میں تو ہزار مرتبہ ارادہ کر چکا ہوں۔ وہ مسکرایا اور کہنے لگا مذاق رہنے دیجئے۔ اگر آپ واقعی اس لعنت سے نجات پانا چاہتے ہیں تو آج شام کو فلاں جگہ ایک مذہبی تقریر ہو رہی ہے وہاں ضرور تشریف لائیں۔ میں نے اسے بتایا کہ مذہب پر میرا بالکل اعتقاد نہیں۔ ہوسکتا ہے کہ میں آپ کی خاطر ویسے ہی وہاں چلا آؤں۔ مجھ پر اس کی باتوں کا کوئی اثر نہیں ہوا تھا مگر اس کا پر نور چہرہ میری آنکھوں کے سامنے برابر گھوم رہا تھا۔ اس نے مجھے وہاں آنے پر مجبور نہیں کیا تھا اس نے صرف یہی کہا تھا کہ اگر میں اس مصیبت سے نجات پانا چاہتا ہوں تو وہ اور اس کے ساتھی

اس سلسلے میں میری مدد کر سکتے ہیں۔ وہ اٹھ کر چلا گیا میں نے شراب کا آرڈر دے دیا۔ مگر اب پہلے کی طرح شراب پینے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔ لہٰذا مزید شراب پئے بغیر میں اپنے گھر چلا آیا مگر بوتل اپنے ساتھ لیتا آیا۔

میری شادی ایک بڑی شریف خصلت لڑکی سے ہوئی تھی۔ مگر میری بری عادتوں سے تنگ آ کر اس نے مجھ سے طلاق لینے کا ارادہ کر لیا تھا۔ اس کے باعث گھر میں بڑی افراتفری پھیلی ہوئی تھی۔ گھر آ کر میں نے بوتل کو میز پر رکھ دیا اور خود ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ میرا شراب پینے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔ مجھے بار بار اس شخص کا خیال آ رہا تھا۔ اگلے روز میں اس کے مکان پر گیا اور اس سے رات کی ساری کیفیت کہہ سنائی اور درخواست کی کہ اگر میری یہ عادت چھوٹ جائے تو میں تمام عمر اس کا احسان مند رہوں گا۔ کیونکہ اب میں اپنے گھر کی بگڑی ہوئی حالت کو اور زیادہ برداشت نہیں کر سکتا تھا اور اتنی اچھی بیوی کو کھونا نہیں چاہتا تھا۔ وہ مجھ سے کہنے لگا اگر تم میری ایک چھوٹی سی نصیحت پر عمل کرو تو اس لعنت سے نجات پانا کوئی مشکل کام نہیں۔ جب کبھی تم کسی شراب خانے کے قریب سے گزرو تو خدا سے دعا مانگو کہ وہ تمہیں وہاں سے صحیح سلامت گزار دے۔ کیونکہ یہ بھی توکل کی ایک حالت ہے۔ یوں کرنے سے تم خدا کی ذات کے ساتھ موافقت کرو گے وہ تمہاری ضرور مدد کرے گا اور ہاں آج شام کو فلاں جگہ ایک اور تقریر ہو رہی ہے وہاں ضرور آنا۔ میں نے اس کی نصیحت پر عمل پیرا ہونے کا مصمم ارادہ کر لیا۔ شام کو جب میں تقریر سننے گھر سے نکلا تو ابھی کافی وقت تھا۔ لہٰذا ادھر ادھر گھومنے لگا۔ راستے میں ایک دو جگہ شراب خانے بھی آئے، شراب پینے کو جی بھی چاہ رہا تھا مگر نامعلوم میں نے خود پر کسی طرح ضبط کر لیا اور بالآخر کسی نہ کسی طرح تقریر پر پہنچ ہی گیا۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ کوئی طاقت مجھے وہاں کھینچ کر لے آئی ہے۔ ہال کے دروازے پر وہی شخص لوگوں کے استقبال کے لئے کھڑا تھا۔ اس نے بڑی گرم جوشی سے میرا ہاتھ دبایا۔ حیرانی کی بات یہ ہے کہ کہاں تو میں اس شخص سے اتنی نفرت کیا کرتا تھا اور اب مجھے اس سے پیار ہو رہا تھا۔ وہاں زندگی کے ہر شعبے کے لوگ موجود تھے۔ ان میں

سے کچھ لوگوں کو میں جانتا تھا جن کے ساتھ مجھے شراب پینے کا اتفاق بھی ہوا تھا۔ مگر اس شام وہ بڑے ہوشیار اور خوش خوش دکھائی دے رہے تھے۔ اس تقریر کا مجھ پر کچھ اثر ہوا اس کا بیان کرنا ذرا مشکل ہے۔ میں خود کو خوش خوش محسوس کر رہا تھا اور گزشتہ پانچ برس میں پہلی مرتبہ میں چین کی نیند سویا تھا۔ دوسری صبح بیدار ہونے پر مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ کوئی آواز صاف طور پر مجھے کہہ رہی تھی۔ ''تم سے بڑھ کر بھی کوئی عظیم طاقت ہے۔ اگر تم خدا کی حفاظت میں خود کو چھوڑ دو گے تو وہ تمہیں ہر مشکل سے مقابلہ کرنے کی قوت دے گا۔'' اگلا دن جمعتہ المبارک کا تھا۔ میں نے جمعتہ المبارک کی نماز میں شرکت کرنے کا ارادہ کر لیا۔ خطبے کے دوران میں مجھ پر ایک قسم کی وجدان کی کیفیت طاری رہی۔ کہاں تو میں ان خطبوں سے نفرت کرتا تھا اور کہاں مجھے ان سے دلی لگاؤ ہو گیا تھا۔

میں اس شخص کو گزشتہ چند سالوں سے جانتا ہوں۔ شراب نوشی ترک کرنے کے بعد اگرچہ اسے چند مالی اور دوسرے مسائل کا سامنا کرنا پڑا۔ مگر یہ مسائل اس کی ہمت کو کبھی نہ کمزور کر سکے۔ اس سے باتیں کرنے کا مجھ پر عجب اثر ہوا حالانکہ وہ کوئی مشہور شخصیت نہیں ہے۔ بلکہ ایک معمولی شخص ہے مگر اس عظیم طاقت نے اسے اندرونی طور پر بڑا مقدس بنا رکھا ہے۔

اس مثال کا صرف شراب نوشی سے ہی تعلق نہیں ہے بلکہ اس عظیم طاقت کی مدد سے اس قسم کے اور ذاتی مسائل کو بھی حل کیا جا سکتا ہے۔ اگر آپ کو اس عظیم طاقت پر بھروسہ ہے تو میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ آپ ہر قسم کی ذاتی شکست پر حاوی ہو سکتے ہیں۔

میں آپ کے سامنے ایک اور تجربہ پیش کرنا چاہتا ہوں۔ اس مثال کا بھی لب لباب یہی ہے کہ اس عظیم طاقت پر اعتقاد ہونے سے انسان کس طرح بنیادی مشکلات کو سرنگوں کر سکتا ہے۔ کچھ عرصہ ہوا مجھے ایک شخص ملنے آیا۔ وہ پکا شرابی تھا مگر وہ اس کے باوجود اپنے کاروبار کو بڑی کامیابی کے ساتھ چلا رہا تھا۔ لیکن اس کو اپنی شراب نوشی پر ذرا بھی قابو نہ تھا جس کے باعث اس کی صحت دن بدن خراب ہوتی جا رہی تھی۔ ایک میگزین میں میرا مضمون پڑھنے

کے بعد وہ میرے پاس آیا۔ مگر مجھ سے ملنے سے پہلے وہ اپنے ایک پرانے شرابی دوست کے ہتھے چڑھ گیا۔ جو اسے ایک شراب خانے میں لے گیا اور وہ دونوں بڑی دیر تک وہاں بیٹھے شراب پیتے رہے۔ شراب پیتے پیتے اس کی حالت اتنی غیر ہوگئی کہ اسے کار میں ڈال کر ہسپتال لایا گیا۔ وہاں ایک ہفتہ رہنے کے بعد اس کی طبیعت قدرے سنبھل گئی۔ تھوڑے دنوں بعد وہ مجھ سے ملنے آیا اور اپنا تمام ماجرا کہہ سنایا۔ پھر وہ درخواست کرنے لگا کہ اس موذی عادت سے نجات حاصل کرنے کے لئے اسے کوئی ترکیب بتائی جائے۔ میں نے اس پر وہی نسخہ آزمایا کہ جو میرے مرشد بزرگوار نے ایک وقت میں مجھ پر آزمایا تھا اور جس کا میں گزشتہ صفحات پر ذکر کر چکا ہوں۔ میں نے اسے کہا کہ وہ اپنے ذہن و جسم کو ڈھیلا چھوڑے اور عالم غنودگی میں اپنے قلب کی جانب توجہ کرے اور اپنی آنکھیں بند رکھے۔ پھر میں نے کلام پاک کھول کر چند جگہوں سے اسے چند آئتیں سنائیں اور ساتھ ساتھ اردو میں ان کا ترجمہ بھی کرنے لگا۔ ان آیات میں بتایا گیا تھا کہ انسان کس طرح خود اعتمادی اور اس عظیم قوت پر توکل کرنے سے اپنی کمزوریوں پر قابو پا سکتا ہے۔ تھوڑی دیر بعد جب وہ اٹھا تو اس کے چہرے پر سکون کے تاثرات پھیلے ہوئے تھے۔ اس کی پریشانی اور گھبراہٹ جاتی رہی تھی۔ میرے پاس کچھ دنوں تک وہ شخص برابر آتا رہا اور میں اس پر یہی عمل دہراتا رہا اور ساتھ ساتھ نفسیاتی طور پر یہ بات اس کے لاشعور میں سموتا رہا کہ صرف وہی عظیم طاقت تمہاری نجات کا وسیلہ ہو سکتی ہے۔ اس کی حالت آہستہ آہستہ سنبھلنے لگی۔ ایک روز وہ خوش خوش میرے پاس آیا اور کہنے لگا کہ اسے شراب سے نفرت ہوگئی ہے جو چیز پہلے اسے زندگی میں سب سے پیاری تھی اب وہ اتنا پر اعتماد ہو گیا ہے کہ اسے چھوڑ سکے۔ اس کے بعد وہ اکثر مجھے ملتا ہے۔ مگر اس نے کبھی شراب کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا اس کا کاروبار اب روز بروز ترقی کر رہا ہے۔

میں نے اس باب میں ایسے واقعات کا ذکر کیا ہے کہ جن سے یہ واضح ہو سکے کہ عصر حاضر میں بھی انسان اس عظیم طاقت پر توکل سے کس طرح خود اعتمادی سے مستفید ہو سکتا

ہے۔ وہ عظیم طاقت جس کا کچھ نہ کچھ عنصر آپ کے اندر موجود ہے اور جس کے استعمال کرنے سے آپ اپنی مشکلات پر قابو پا سکتے ہیں۔ یہ دنیا کوئی ایسی مشکل نہیں کہ جسے اعتقادیا تعمیری سوچ سے سرنگوں نہ کیا جا سکے۔ لیکن اس کے لئے ضروری ہے کہ آپ توکل الٰہی سے زیادہ سے زیادہ فیضیاب ہونے کی کوشش کریں۔ خدا کی ذات تو ہر وقت آپ کی مدد کرنے کو تیار ہے۔

اب جبکہ ہم توکل کے عنصر کو دین و دنیا کے حوالوں سے پرکھ چکے اور منازل یقین کی ابتداء میں اس کے کردار کی اہمیت سے آگاہی حاصل کر چکے ہیں تو اب ضروری ہے کہ ہم یقین کی معرفت الٰہیہ کے آئینہ میں عکس بند کریں۔

معرفت الٰہیہ

اس ضمن میں جو اول شرط ہے وہ یہی ہے کہ اس چیز کا دل سے اقرار کرے کہ قادر مطلق تو وہی ہے کہ جو ممکن کو ناممکن کر دے اور ناممکن کو ممکن کر دے اور لوگ جس کو قسمت یا نصیب کہتے ہیں اہل ایمان، یقین کی انتہا پر اس کو اللہ کہتے ہیں۔

جیسا کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم فرماتے ہیں:

''میں نے اپنے رب کو اپنی آرزوں، ارادوں کے ٹوٹنے سے پہچانا ہے۔''

جہاں تک سوال ہے کہ یہ قسمت، نصیب جیسی اصطلاحیں اور تقدیر پرستی نے کب سے زور پکڑا۔ حالانکہ دور نبوت و خلافت راشدہ میں ہمیں ان اصطلاحوں کا کوئی تذکرہ نہیں ملتا۔ تو اس کے بارے میں علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ اپنی کتاب ''تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ'' میں فرماتے ہیں۔

> ''دمشق کے موقع شناس اموی فرمانرواؤں کو جو عملاً مادہ پرستی اختیار کر چکے تھے، کسی ایسے عذر کی ضرورت تھی جس سے وہ کربلا کے مظالم پر پردہ ڈال دیں تاکہ اس طرح عوام کو موقع نہ ملے کہ ان کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں اور انہیں امیر معاویہ کی بغاوت کے ثمرات سے محروم کر دیں۔ چنانچہ کہا جاتا ہے کہ جب معبد

نے حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ سے کہا اموی مسلمانوں کو قتل کرتے ہیں اور اس کے ساتھ یہ بھی کہتے ہیں کہ اللہ کی مرضی (یعنی تقدیر پرستی) یونہی تھی۔ تو حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نے کہا! یہ اللہ کے دشمن جھوٹ کہتے ہیں۔ یہ وجہ تھی جن کی بناء پر علمائے اسلام کے کھلم کھلا احتجاج کے باوجود عالم اسلام نے ایک بڑی ذلت خیز تقدیر پرستی اختیار کر لی۔'' (صفحہ نمبر 167)

بعض لوگ ایمان اور یقین کے بارے میں ایک ہی تصور رکھتے ہیں کہ یہ دونوں ایک ہی حقیقت کے دو نام ہیں۔ حالانکہ حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔ اللہ پر ایمان اور یقین ایک تسلسل کی دو کڑیاں ہیں جس میں ایمان کو انسان پہلے پاتا ہے اور پھر بعد میں یقین کی منزل کو پاتا ہے یا پھر یوں کہئے کہ ایک بشر (رسول نہیں) کے لئے یقین کی منزل کو پانے کے لئے پہلے اللہ پر ایمان لانا ضروری ہے۔ اللہ پر ایمان لانے کا مفہوم کچھ اس طرح بیان کروں گا کہ ''بندہ اپنے رب کی اطاعت اس پیغمبر کی وساطت سے کرے کہ جس نے اس کو اللہ کا پیغام لا کر سنایا۔''

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

''تم (اے محمد ﷺ) تو ڈر سنانے والے ہو اور ہر قوم کے ہادی۔'' (رعد:7)

ایک اور جگہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

''اور ہم نے غیب بتانے والے (رسول) اگلوں میں بھیجے۔'' (زخرف:6)

بندہ جب اس طریقے سے اپنے رب پر ایمان لاتا ہے تو مومن کہلاتا ہے۔ اب جبکہ رسول نے بندے کو اللہ کے تمام احکامات سے آگاہ کر دیا تو آگے کا کام بندے کا ہے کہ وہ ان احکامات کی پیروی کرتے ہوئے یقین کی منزل کو پالے اور اس منزل کو حاصل کرنے کے لئے معجزات کا سہارا لینا بے سود ہے۔ (جس طرح سے پہلی امتوں میں ہوا) بلکہ اس کو حاصل کرنے کا واحد طریقہ اپنے اللہ کی عبادت ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"اور اپنے رب کی عبادت اتنی کر کہ تجھ کو یقین آ جائے۔"(الحجر:99)

یعنی کہ تیرا اللہ پر یقین پختہ ہو چکا ہے۔اس یقین کی منزل کو پا لینے سے پہلے یہ بات یقین کی بنیاد کی حیثیت رکھتی ہے کہ انسان فقط مسلمان نہیں بلکہ احکامات الٰہی اور احکامات رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے تحت رہ کر پکا اور سچا مسلمان ہو۔فقط کلمہ پڑھ لینے سے وہ مسلمان نہیں ہو سکتا بلکہ اب اس کی ذمہ داریوں میں اضافہ کر دیا گیا ہے کہ جسے "راہ حق میں دین و دنیا کی جستجو" کہہ سکتے ہیں۔

جیسا کہ ایک دفعہ لوگوں نے ایک آتش پرست کو کہا کہ حضرت سلطان بایزید رحمۃ اللہ علیہ کی حقانیت کو دیکھتے ہو پھر مسلمان کیوں نہیں ہو جاتے؟ جواب دیا۔"ان کی مسلمانی کی طاقت مجھ میں نہیں اور تمہاری مسلمانی سے مجھے رغبت نہیں۔"

حضرت علی علیہ السلام ایک مومن کے لئے جو نسخہ بتاتے ہیں وہ یہ ہے کہ

"خدا کی اطاعت اپنی جان پر جبر کرنے کے بغیر حاصل نہیں ہوتی۔"

جب مومن کو یقین کی منزل حاصل ہو جاتی ہے تو وہ اپنے رب کو اپنی ذات میں اور اس کائنات کی ذات میں تلاش کرنا شروع کر دیتا ہے اور متلاشی رہتا ہے۔جب بالآخر اس کو اپنے رب کا کچھ "علم" حاصل ہوتا ہے تو اس پر خوف الٰہی کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔

اس علم کی حقیقت کو واضح کرتے ہوئے حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

"خدا تعالیٰ اپنے بندوں سے دو علم چاہتا ہے۔ایک یہ کہ وہ اپنی عبودیت کو جانیں، دوسرا خدا کی ربوبیت کو پہنچانیں۔"

یہی علم کی منزل ولی کامل کو حاصل ہوتی ہے۔اسی لئے تو فرمایا گیا ہے کہ

"اے ایمان والو! اللہ کا ذکر کثرت سے کیا کرو۔"(احزاب:41)

اور پھر فرمایا کہ

"ذکر الٰہی سے دلوں کو سکون ملتا ہے۔"(رعد:28)

یہ خوف الٰہی کی منزل بھی بڑی عجیب ہوتی ہے اور حقیقت میں یہ خوف الٰہی نہیں ہوتا

بلکہ یہ محبت الٰہی ہوتی ہے۔ یعنی بندہ اپنے یقین کو مزید پختہ بنانے کے لئے اس کی عبادت کرتا ہے اور اس کا متلاشی رہتا ہے کہ اس کو پالینے کے بعد اس باری تعالیٰ کی ذات کو اس قدر خوبصورت پاتا ہے کہ اس کی محبت میں کھو جاتا ہے اور اللہ کو اپنا حقیقی معبود مان لیتا ہے۔ اب جبکہ بندہ اللہ کو اپنا معبود تصور کر لیتا ہے تو اس پر یہ خوف طاری ہو جاتا ہے کہ اس کی چھوٹی سے چھوٹی کوتاہی کی وجہ سے اس کا محبوب روٹھ نہ جائے تو اس کو خوف الٰہی کہتے ہیں۔

اسی بناء پر حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم ارشاد فرماتے ہیں:

''جب تجھے خالق کا خوف آئے تو بھاگ کر اس کی بارگاہ میں پناہ لے لے اور جب مخلوق کا ڈر ہو تو ان سے دور بھاگ جا۔''

ایک اور مقام پر فرماتے ہیں کہ

''اللہ تعالیٰ کے عذاب کا اتنا بڑا خوف رکھ کہ تو اس کے باعث اس کی رحمت سے ناامید نہ ہو جائے اور اس کی رحمت کی امید ایسی رکھ کہ اس کی وجہ سے اس کے عذاب کا ڈر نہ بھول جائے۔''

حضرت غوث الاعظم رحمۃ اللہ علیہ ایمان کو خوف الٰہی میں ٹٹولتے ہوئے فرماتے ہیں:

''جب تک سطح زمین پر ایک شخص بھی ایسا رہے کہ جس کا تیرے دل میں خوف ہو یا اس سے کسی قسم کی توقع ہو اس وقت تک تیرا ایمان کامل نہیں ہو سکتا۔''

ایک مومن کے دل کو حقیقی خوشی اس وقت حاصل ہوتی ہے جب اس کے دل میں تصور الٰہی حقیقی معنوں میں اجاگر ہوتا ہے۔

جیسا کہ ایک دفعہ حضرت عبدالحسن رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت جنید بغدادی رحمۃ الہ علیہ سے پوچھا کہ انسان کا دل کس وقت مطمئن ہوتا ہے تو حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ نے جواب دیا۔

''دل اس وقت مطمئن ہوتا ہے کہ جب دل اپنے دل سے مطمئن ہوتا ہے۔''

شیخ الاسلام رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

''ہمارا دل اس وقت مطمئن ہوتا ہے کہ جب انسان جستجو کرتا ہے اور اس جستجو میں وہ اپنے رب کو پالیتا ہے۔''

اب تک جتنی بحث اوپر کی جا چکی ہے اور جو کچھ نچوڑ ہمیں حاصل ہوا ہے وہ ایک بشر کو ولائت کی منزل پر بٹھاتا ہے۔ اب اگر اس یقین کی انتہا کیفیت کو لے لیں کہ وہ ایک ولی کامل کی منزل ہوتی ہے اور پھر اس کی عکس بندی ''نبوت'' میں کریں تو اس یقین کو ہم نبوت کے آغاز میں پائیں گے۔ نبوت کی پہلی منزل یقین کی ہوتی ہے، ایمان کی نہیں (لیکن خیال رہے کہ نبوت بھی ولائت کی کاملیت پر عطا ہوتی ہے)۔ ایمان کی حقیقت تو صرف بشر کے لئے ہے۔ اللہ رب العزت نے اپنے پیغمبروں کو یقین دلانے کے لئے حضرت جبرائیل علیہ السلام مقرر فرمائے کہ جو ان پر وحی لے کر آئے اور جب ان کو یقین آ جاتا تو وہ نبوت کے مرتبے پر فائز ہوتے۔ نبوت اور ولائت کے فرق کو اس طرح سے بھی واضح کر سکتا ہوں کہ ولائت میں جستجو پہلے آتی ہے اور یہ عبادت و ریاضت سے حاصل ہوتی ہے لیکن نبوت رضائے خداوندی سے عطا ہوتی ہے اور اس میں عبادت اور ریاضت کا کوئی دخل نہیں بلکہ اس میں جستجو بعد میں ہوتی ہے۔ (نبوت اور ولائت کا فرق'' منازل سلوک'' کے باب میں واضح کیا گیا ہے)۔

اللہ تبارک وتعالیٰ اپنے ایک نبی کو یقین کی منزل تو آغاز میں بغیر عبادت و ریاضت کے عطا کر دیتا ہے لیکن پھر بعد کی آزمائشوں سے اس کے یقین کی پختگی کا امتحان بھی لیتا رہتا ہے۔ یہی وہ اللہ پر یقین محکم تھا کہ جس کو لے کر حضرت ابراہیم علیہ السلام آتش نمرود میں بے دھڑک کود پڑے، یہی وہ یقین تھا کہ جس کے بل پر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے لخت جگر کی گردن پر چھری چلائی، یہی وہ یقین تھا کہ جس کے بل پر حضرت اسماعیل علیہ السلام نے باپ کے حکم کے سامنے اف تک نہ کی، یہی وہ یقین تھا کہ جس کے بل آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کفار عرب کے مظالم سہے، یہی وہ یقین تھا کہ جس کے بل پر نبی آخر

الزماں صلی اللہ علیہ وسلم اپنے چچا حضرت ابوطالب سے یہ کہتے ہوئے نظر آتے ہیں کہ

"خدا کی قسم اگر قریش مکہ میرے ایک ہاتھ پر سورج اور دوسرے ہاتھ پر چاند لا کر رکھ دیں تو تب بھی میں راہ حق سے نہ ہٹوں گا۔"

یہی وہ یقین تھا کہ جس کے بل پر حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم بستر رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر بے خوف و خطر خواب آور ہوتے ہیں، یہی وہ یقین تھا کہ جس کے بل پر حضرت صدیق رضی اللہ عنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ رخت سفر رہتے ہیں، یہی وہ یقین تھا کہ جس کے بل پر امام عالی مقام جناب حسین علیہ السلام کربلا کے میدان میں اپنے خون جگر سے اسلام کی کھیتی کو سیراب کرتے ہیں۔

حضرت مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ یقین و ایمان کو اس طرح بیان کرتے ہیں:

"یقین کے لئے مدارج ہیں۔ علم الیقین، عین الیقین اور حق الیقین۔ جو لوگ خدا کی ذات پر اپنی توجہ جمائے بیٹھے ہیں ان کی کیفیت کے متعلق ایمان کی اصطلاح استعمال نہیں کی جا سکتی۔ ایمان، ایمان بالغیب ہوتا ہے یا تقلیدی یا استدلالی۔ یہ تینوں کیفیتیں اس خدا رسید کے قرب و دیدار الٰہی کے مقابلے میں ادنیٰ ہیں۔ جس کا قبلہ توجہ خاص ذات حق ہیں۔ جہاں حضور ہے وہاں غیب کا کیا سوال کہ جس پر یقین کرنا، ایمان کہلاتا ہے۔ فرماتے ہیں کہ اگر کوئی شخص سلطان کا ہم نشین اور اس کی پوشش کا مہتمم یعنی توشہ خانہ کا منتظم ہو وہ فقیروں کی طرح اس کے دروازے پر کیوں بیٹھنے لگا جس کو سلطان کی دست بوسی نصیب ہے اس کو بادشاہ کے قدموں میں گر کر قدم بوسی کی کیا ضرورت۔ قدم بوسی اگرچہ تعظیم کی علامت ہے لیکن دست بوسی کے مقابلے میں ادنیٰ ہے۔ عرض ہے کہ یہ حضوری اور قرب تقلیدی، ایمان اور ایمان بالغیب کے مقابلے میں بہت افضل ہیں۔"

حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ کو جب یقین کی منزل عطا ہوئی تو ان کی نظر اس دنیا کی مادیت سے بے نیاز ہوگئی اور وہ فرماتے ہیں۔

''اگر کل قیامت کو خدا تعالیٰ مجھے حکم کرے کہ مجھ کو دیکھ۔ میں جواب دوں گا کہ
آنکھ دوستی میں غیر ہے۔ دنیا میں اس کے بغیر ہی دیکھتا تھا۔''

یقین کی ان کیفیات کو واضح کرنے کے بعد ذات باری تعالیٰ کو ایک نئے انداز سے واضح کرنے کی اجازت چاہوں گا۔ کائنات کی کسی بھی تخلیق کی جانب سوال کر کے دیکھیں تو وہ خود ہی اس بات کی گواہی دے گی کہ اس کے وجود کی بڑی وجہ ہی فقط مرضی خداوندی ہے۔ ہر لفظ کی اصل حقیقت ''الف'' سے شروع ہوتی ہے اور ''الف'' کی حقیقت ایک نقطے سے ہے اور نقطے کی حقیقت سیاہی ہے سیاہی کی حقیقت خاک سے ہے اور خاک کی حقیقت ایک بوٹی (Sesamen) سے ہے اور اس بوٹی کی حقیقت ان اجزاء سے ہے جو خدا نے نباتات میں پوشیدہ کر رکھے ہیں اور ان اجزاء کی حقیقت نور خدا میں پوشیدہ ہے۔ اب اس کو مزید واضح کرنے کے لئے اس نور خدا کو معرفت خدا کے حوالے سے دیکھتے ہیں۔ چونکہ معرفت خدا کی وضاحت ایک پیچیدہ مرحلہ ہے اس لئے اس کو تفصیل سے واضح کرنا ضروری سمجھوں گا اور اس ضمن میں چند دلائل کا سہارا بھی لیا جائے گا۔ چنانچہ معرفت خدا کی بہترین وضاحت ہمیں حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم کے اس فرمان سے ملتی ہے۔

''اس نے احساس شعور کے مرکزوں کو ایجاد کیا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ خود
احساس وآلات شعور نہیں رکھتا۔''

میں اب موضوع کی وضاحت کے لئے آپ کی خصوصی توجہ چاہوں گا اور اس کے لئے ادراک کے مراکز اور حواس کی خاصیتوں کا جائزہ لینا ضروری سمجھوں گا۔ جہاں ادراک کے مراکز کا تعلق ہے تو روح و نفس انسان ایسا موجود ہے جو مادی نہیں ہے بلکہ مادہ سے مجرد ہے۔ اگر نفس و روح عالم مادہ سے رابطہ پیدا کرنا اور عالم مادہ کی اطلاعات حاصل کرنا چاہیں تو یہ رابطہ مخصوص حواس کے ذریعے قائم ہو سکتا ہے۔ جیسے باصرہ، قوت ساحرہ کا مرکز آنکھ ہے۔ چیزوں کا عکس پہلے آنکھ کی پتلی پر پڑتا ہے اور پھر اعصاب چشم کے ذریعے انسان کے دماغ میں منتقل ہو جاتا ہے۔ ہونے کا یہ منظم عمل مقدمہ بنتا ہے تاکہ نفس انسان دیکھی جانے

والی چیزوں کو دیکھ سکے۔اسی طرح سنی جانے والی آوازیں لہروں کی شکل میں ہوا میں بکھرتی ہیں اور قوت سامعہ کے ذریعہ مرکز کان سے دماغ تک منتقل ہو جاتی ہیں اور انسان ان آوازوں کو سن لیتا ہے۔ چیزوں کی خوشبو، بدبو قوت شامہ کے ذریعہ، لذتیں قوت ذائقہ کے سہارے، نرمی، سختی، حرارت، برودت اس وقت لامسہ کے سبب جو تمام بدن میں موجود ہے منتقل ہو کر دماغ میں پہنچتی ہے اور مذکورہ بالا چیزوں کا ادراک ہو جاتا ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ یہ حواس (لامسہ، باصرہ، سامعہ، ذائقہ اور شامہ) خود ادراک نہیں کرتے بلکہ یہ ادراک کا مقدمہ ہیں۔ جس طرح کیمرہ ادراک نہیں رکھتا اس طرح آنکھوں کی قوت بصارت بھی ادراک نہیں رکھتی۔ ادراک اس وقت ہوتا ہے جب چیزوں کا عکس آنکھوں پر پڑنے کے بعد منتقل ہو کر دماغ تک پہنچے۔ دراصل دماغ (مغز) بھی ادراک نہیں کرتا اس لئے کہ وہ جسم ہے ادراک کرنے والا تو انسان کا نفس مجرد ہے جو اس کے پس پشت موجود ہے۔ لیکن یہ "نفس مجرد عالم مادہ" سے رابطہ پیدا کرنے کے لئے حواس خمسہ ظاہری کا محتاج ہے یہ حواس خمسہ خبر رساں آلات ہیں۔ نفس ان ہی کے سہارے عالم مادہ سے رابطہ قائم کرتا ہے۔ بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ ابتدائی مرحلوں کو انجام دینے کے بعد قوت باصرہ کا کیمرہ اس تصویر کو دماغ میں منتقل کر دیتا ہے۔ اس وقت انسان کا نفس اپنے اندر ایک تخلیقی قوت کے سہارے باہر آنے والی صورت جیسی ایک صورت تخلیق کرتا ہے اور اسی صورت کا نفس ادراک کرتا ہے جس کو اس نے پیدا کیا ہے۔ باہر کے سارے آلات نفس کی تصویر کشی کے لئے مقدمہ بن جاتے ہیں تا کہ نفس اپنی دنیا میں باہر کی تصویر کے مشابہ تصویر بناتا رہے اور وہی تصویر براہ راست قابل توجہ ہوتی ہے جو نفس میں بنتی ہے۔ اس تصویر کو مدرک بالذات اور خارج میں پائی جانے والی تصویر کو مدرک بالعرض کہتے ہیں۔ مدرک بالذات وہ ہے جس کی ذات کو ہم براہ راست درک کرتے ہیں اور اس کے درک کے نتیجہ میں خارج میں پائی جانے والی چیز درک ہوتی ہے۔ بہرحال ان پانچوں (آنکھ، کان، ناک، زبان اور تمام بدن) حواس ظاہری کو جو انسان کے اعضاء و جوارح میں پائے جاتے ہیں، مشاعر خمسہ کہتے ہیں۔ مشعر

اسم مکان ہے۔ یعنی یہ حواس عمل شعور ہیں یا یوں کہا جائے کہ یہ حواس مواصلاتی مسائل ہیں جن کے ذریعے سے نفس انسان عالم خارج کا شعور وادراک حاصل کرتا ہے۔ رہ گیا یہ سوال کہ انسان براہ راست بغیر حواس کی مدد کے عالم خارج کو کیوں نہیں درک کر سکتا؟ تو اس کا سبب یہ ہے کہ انسان چونکہ ایک کمزور وجود ہے۔ اگر چہ نفس انسان مجرد ہے مگر ایسا ضعیف مجرد ہے جو حواس اور درک کرنے والے آلات کا محتاج ہے وہ ان ہی آلات کے سہارے باہر کی دنیا سے رابطہ کرتا ہے۔ کیمرہ کے بغیر تصویر نہیں کھینچی جا سکتی یہ انسان کی مجبوری اور کمزوری ہے۔ جہاں تک حواس کی خاصیتوں کا تعلق ہے تو وہ چار ہیں۔

☆ آپ چیزوں کے ادراک کے لئے حواس کے محتاج ہیں۔

☆ حواس میں اثر قبول کرنے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ یعنی جو عکس آنکھوں کے سامنے آتا ہے آنکھیں اسے قبول کر کے محفوظ رکھتی ہیں۔

☆ چونکہ ان حواس کے مختلف شعبے ہیں اس لئے آپ کا علم کثرت کا حامل ہے۔

☆ مرکز شعور اجسام ہیں۔ قوت باصرہ خود بخود کسی چیز کو نہیں دیکھتی بلکہ آنکھوں کی مدد سے دیکھتی ہے۔ اسی طرح قوت سامعہ سننے میں کانوں کی محتاج ہے اور یہ سب جسم ہیں۔ اسی طرح دوسری قوتیں بھی ہیں۔

یہ چاروں خاصیتیں نقص پر دلالت کرتی ہیں اور خداوند عالم نقص سے دور ہے۔ لہٰذا حضرت کے جملہ کا مفہوم واضح ہو گیا اور وہ اس طرح کہ خدا نے ہمارے لئے مراکز شعور پیدا کئے ہیں اس سے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ خدا ہماری طرح کا شعور نہیں رکھتا۔ یعنی خدا کا ادراک ایسا نہیں ہے کہ وہ آنکھ، کان، قوت شامہ یا قوت لامسہ رکھتا ہو۔ اس جملہ سے کیسے استدلال کیا جا سکتا ہے کہ خدا ہماری طرح کا شعور نہیں رکھتا؟ چونکہ خدا نے پانچ مراکز شعور ہم کو عطا کئے ہیں۔ ان حواس خمسہ میں غور وفکر کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ ان میں چار حالتیں پائی جاتی ہیں اور ہر حالت نقص پر دلالت کرتی ہے اور خدا میں کسی قسم کا نقص نہیں پایا جاتا۔ یہی وجہ ہے کہ جب ہم خدا کو سمیع وبصیر کہتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس کی سماعت

اور بصارت عین ذات ہے۔ ان میں سے کوئی چیز زائد برذات نہیں ہے۔ خدا سمیع و بصیر ہے مگر آنکھوں اور کانوں کی مدد سے نہیں بلکہ خدا تمام دیکھی اور سنی جانے والی چیزوں کا علم رکھتا ہے وہ ہماری طرح محتاج نہیں ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ وہ کان رکھتا ہو اور ہوا کی لہریں آواز کو اس کے کانوں تک پہنچا دیں۔ یہ تمام ذرائع ادراک دراصل جسم ہیں اور خدا جسم نہیں رکھتا۔ اگر معاذ اللہ وہ بھی مواصلاتی آلات کے ذریعے اطلاعات حاصل کرتا تو اس کا لازمہ یہ تھا کہ اس کی ذات محتاج و مرکب ہوتی اور اس میں تاثر و منفعل ہونے کی حالت پیدا ہوتی اور وہ جسم والا ہوتا۔ لیکن یہ چاروں صفتیں خدا کی ذات میں نہیں پائی جاتیں۔ بہر حال یہ بحث بہت ہی عمیق ہے جو حضرات مزید معلومات حاصل کرنا چاہتے ہوں وہ بزرگوں کی بیان کردہ توضیحات کا بغور مطالعہ فرمائیں۔ مختصر یہ کہ اگر خدا مراکز حواس کا حامل ہوتا تو اس کا لازمہ یہ تھا کہ وہ جسم ہوتا اور یہ ممکن نہیں کہ وہ جسم بھی ہو اور خالق جسم بھی۔ ہم اس بات کو ثابت کرنے کے لئے ذیل میں دو دلیلیں قائم کر رہے ہیں۔

پہلی دلیل

پہلی دلیل یہ ہے کہ جسم کسی چیز کو عدم سے وجود میں نہیں لا سکتا۔ اس لئے کہ جسم کی فاعلیت صرف فاعلیت حرکت ہے۔ اس لئے جسم موثر ہونے میں ایک مخصوص وضع و محاذات کا محتاج ہے۔ جب وہ خاص وضع و محاذات حاصل کر لیتا ہے تب موثر ہوتا ہے۔ جیسے اگر کسی چیز کو جلانا ہو تو اس کو اس شئے سے نزدیک ہونا پڑے گا تب اس شے کو آگ جلا سکتی ہے۔ جسم اگر کسی چیز پر اثر ڈالنا چاہے تو اس کو مخصوص وضع و محاذات کی ضرورت ہوتی ہے۔ جب آگ کا کسی چیز کو جلانا، یہ اس جسم میں حرکت پیدا کرنے کے سوا اور کچھ نہیں ہے اس لئے کہ آگ اس شے کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے راکھ کے ڈھیر میں تبدیل کر دیتی ہے۔ تو اگر اس معنی کو خدا کے بارے میں فرض کیا جائے تو یوں کہا جا سکتا ہے کہ خلقت عالم سے پہلے اگر خدا جسم تھا اور اس نے عالم کو پیدا کرنا چاہا تو چونکہ کوئی چیز موجود نہ تھی۔ عدم ہی عدم تھا اور عدم محض میں وضع و محاذات کی گنجائش نہیں اور جسم کے اثر کے لئے وضع و محاذات ضروری ہے۔ بفرض محال اگر

ہم یہ مان بھی لیں کہ خدا جسم ہے تو وہ عالم کا خالق نہیں ہوسکتا۔ اس لئے کہ معدوم عالم کی ساتھ وضع ومحاذات کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا پھر وہ اسے خلق کیسے کرسکتا ہے؟ اسے لباس وجود کیسے عطا کرسکتا ہے؟ اس لئے ہم کہتے ہیں کہ اجسام، اجسام ہی میں اثر ڈالتے ہیں۔ البتہ وہ ان کو عدم سے وجود میں نہیں لا سکتے بلکہ صرف اجسام کی صورت بدل دیتے ہیں۔ جو حضرات لوہے کو پہیہ کی شکل میں ڈھالنا چاہتے ہیں وہ لوہے کو اپنے قریب کر کے ہتھوڑے یا دوسرے وسائل کو کام میں لاتے ہیں اس عمل سے لوہا۔ پہیہ میں ڈھل جاتا ہے۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ جسم کی فاعلیت وضع ومحاذات کی محتاج ہے اس لئے محال ہے کہ خدا جسم ہو۔ آئمہ کرام سے بہت سی روایتیں اس سلسلہ میں پائی جاتی ہیں کہ خدا جسم ہے اس کا جسم ہونا محال ہے۔ چونکہ آئمہ کے ذہن میں بہت سے ظاہر بین افراد ایسے تھے جو آیہ ''الرحمن علی العرش استویٰ'' کے سلسلے میں یہ خیال رکھتے تھے کہ خدا جسم ہے اور عرش پر بیٹھا ہے یا یہ کہتے تھے کہ خدا آسمان اول پر آتا ہے اور سب کو دیکھتا ہے وغیرہ۔ اس لئے آئمہ سے ایسی روایتیں وارد ہوئی ہیں۔ انہوں نے چاہا کہ ایسے افراد کو سمجھا دیا جائے کہ تم خدا کے بارے میں غلط خیال رکھتے ہو خدا جسم نہیں ہوسکتا۔

دوسری دلیل

دوسری دلیل یہ ہے کہ طبیعت خود اس طبیعت کی علت نہیں ہوسکتی۔ لہٰذا جسموں کا خلق کرنے والے ''جسم'' نہیں ہوسکتا ورنہ جسم، جسم کی علت ہو جائے گی اور یہ ممکن نہیں ہے کہ جسم، جسم کی علت ہو۔ کوئی آگ، آگ کی علت نہیں ہوسکتی، کوئی آگ، آگ کو عدم سے وجود میں نہیں لاسکتی بلکہ آگ کو وجود میں لانے کے لئے آگ کو کسی وجود کی ضرورت پڑے گی کہ جس کو جلا کر وہ خود تخلیق پا سکے۔ بہرحال علت و معلول ایک نہیں ہوسکتے، ان کو الگ الگ ہونا چاہئے۔ اگر یہ کہا جائے کہ ایک آگ دوسری آگ کے لئے علت ہے تو میں پوچھوں گا کہ یہ آگ اس آگ کے لئے علت کیوں ہے؟ اس آگ کی وجہ سے علیت اور موثریت کیا ہے؟ اگر یہ کہا جائے کہ اس آگ کا آگ ہونا علت ہے تو میں کہوں گا کہ اس

دوسری آگ میں بھی جلانے کی قوت ہے۔ لہٰذا اس (دوسری) آگ کو بھی علت ہونا چاہیئے۔ اگر آگ ہونا (ناریت) آگ کے لئے مؤثر اور مبدء فاعلیت ہے تو معلول (جو آگ ہے) کو بھی مبدء فاعلیت ہونا چاہیئے۔ اس طرح دونوں علت ہوں گے۔ لہٰذا اگر یہ نظر آئے کہ ایک آگ دوسری آگ کے لئے علت بنی ہے تو پھر واضح ہے کہ آگ ہونا (ناریت) منشاء علت نہیں ہے۔ بلکہ اس میں کوئی دوسری ہی جہت ہے جو اس چیز میں اثر انداز ہو رہی ہے اور وہی دوسری جہت ''منشاء علیت'' ہے۔

''اس نے چیزوں کو متضاد پیدا کیا اس سے سمجھ میں آتا ہے کہ وہ ضد نہیں رکھتا۔''

ضد کے دو معنی ہیں۔ ایک ضد اصطلاحی ہے جو فلسفہ میں آتی ہے دوسرا ضد عرضی ہے جو عام ہے۔

☆ جہاں تک تضاد فلسفی کا تعلق ہے تو فلسفیوں کی اصطلاح میں کہا جاتا ہے کہ ضدین دو صفت اور دو امر وجودی ہیں جو ایک جسم پر دوسرے کے بعد وارد ہوتی ہیں اور ان میں آپس میں بہت اختلاف ہے۔ مثلاً ایک سفید چیز اگر سیاہ ہو جائے یا ایک شجاع اور بہادر انسان اگر بزدل ہو جائے۔ تو سفیدی اور سیاہی یا شجاعت اور بزدلی دو حالت وجودی ہیں جو ایک ہی شے پر ایک دوسرے کے بعد وارد ہو رہی ہیں۔ ایک ختم ہوتی ہے تو دوسری آجاتی ہے۔ مثلاً کسی انسان کا رنگ اگر سرخ وسفید ہے تو خوف کی موقع پر اچانک اس کا رنگ زرد ہو جاتا ہے جبکہ سرخی اور زردی کے درمیان بہت ہی تضاد اور اختلاف پایا جاتا ہے مگر دونوں رنگ ہی ہیں جنس کے (رنگ ہونے) اعتبار سے دونوں ایک ہیں۔ اسی طرح شجاعت اور بزدلی دونوں انسانی کیفیتیں ہیں دونوں جنس میں ایک دوسرے سے قریب ہیں۔ لیکن پھر بھی ان دونوں میں بڑا فرق ہے۔ فلسفہ کی اصطلاح میں اس کو ضدین کہتے ہیں۔

☆ عرف میں تضاد ایک عام معنی کا حامل ہے۔ چاہے دو امر وجودی آپس میں اختلاف رکھتے ہوں یا ایک امر وجودی ہو اور دوسرا عدمی ہو۔ عرف عام میں ان کو ضدین کہا جاتا

ہے۔جیسے کسی شے کا ''ہونا'' اور ''نہ ہونا''۔آج کا فلسفہ ان دونوں کو ضدین کہتا ہے۔ اس میں اک وجود ہے اور دوسرا عدم۔ حالانکہ فلسفہ قدیم میں ضدین ان دو وجودی چیزوں کو کہا جاتا ہے جن میں آپس میں اختلاف پایا جائے۔مثال کے لئے آپ نور و ظلمت کو لے لیں۔ یہ عرف عام میں ضدین کہی جاتیں ہیں۔حالانکہ نور اور روشنی امر وجودی اور ظلمت اور تاریکی امر عدی ہیں۔مگر تاریکی وہ امر عدی ہے جس میں روشن ہونے کی صلاحیت تو پائی جاتی ہے لیکن فی الحال روشن نہیں بلکہ تاریک ہے۔''الظلمة عدم النور فیما من شانه ان یکون منورا'' (یعنی) نور رکھنے والی چیز کا نور نہ رکھنا ظلمت ہے۔

یہ امر عدمی تو ہے مگر عدم محض نہیں ہے بلکہ اس میں منور ہونے کی صلاحیت پائی جاتی ہے۔لہٰذا معلوم ہوا کہ فلسفیوں کی اصطلاح میں ضدین دو امر وجودی ہیں اور عوارض میں سے ہیں۔لیکن عرف عام میں ضدان دو چیزوں کو کہتے ہیں جو آپس میں مشترک نہ ہوں جمع کے قائل نہ ہوں۔ان میں آپس میں بیر ہو تو عرف ان دونوں کو ضدین کہتا ہے۔جیسے پانی اور آگ۔

اب چاہے ضد کے عرفی معنی لئے جائیں یا فلسفی، دونوں صورتوں میں حضرت علی علیہ السلام کے جملہ کی تفسیر اس طرح ہوگی کہ خدا نے پانی اور آگ، سرخی اور زردی، شجاعت اور بزدلی کو پیدا کیا ہے جو ایک دوسرے کی ضد ہیں۔اشیاء کے درمیان ضد قرار دینے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی ضد نہیں ہوسکتی۔چاہے وہ ''تضاد فلسفی'' ہو یا ''تضاد عرفی'' اس لئے کہ زائد بر ذات دو خاصیتوں کا نام ضدین ہے۔ یہ دو ''عرض'' ہیں اگر یہ کسی چیز پر عارض ہوں گی تو اس کے لئے ایک معروض کا ہونا لازمی ہے اور خدا پر کوئی چیز عارض نہیں ہوتی۔ممکن ہے عیاذ اًباللہ کوئی کہے کہ ''خدا خود عرض ہے'' تو ایسی صورت میں وہ معروض کا محتاج ہوگا اور اس کا محتاج ہونا محال ہے۔اس لئے ہم نے کہا تھا کہ صفات خدا، زائد بر ذات نہیں ہیں بلکہ عین ذات کا حصہ ہیں۔

دوضد کا موازنہ کرنے کے بعد یہ معلوم ہوتا ہے کہ ذات باری تعالیٰ عرض کی قسم میں سے نہیں ہوسکتی۔ اس لئے کہ خدا کا کوئی ''دوسرا'' فرض نہیں کیا جاسکتا جس سے وہ باہم مخالف اور عناد رکھتے ہوں۔ اس لئے کہ خداوند عالم کی حقیقت غیر متناہی ہے اور غیر متناہی دو نہیں ہوسکتا۔ اگر دو ہو جائیں تو دونوں محدود ہوں گے (ایک اپنی مخصوص حد میں ہوگا اور دوسرا اپنی مخصوص حد میں) اور محدود ہونے کے بعد دونوں متناہی ہو جائیں گے۔ لیکن ذات باری تعالیٰ ہستی غیر متناہی ہے جس کے لئے کسی قسم کی نیستی اور دوئی نہیں ہے۔ اگر ہم خدا کے لئے ضد و معاند فرض کرلیں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم نے دو مستقل حقیقتیں فرض کر لیں۔ ایسی صورت میں دونوں محدود اور محتاج ہو جائیں گے۔ لیکن خدا محدود ہے اور نہ محتاج بلکہ وہ بے نیاز ہے۔

اس مختصر گفتگو میں یہ بات واضح ہوگئی کہ یہ ممکن ہی نہیں کہ کوئی شے خدا کی ضد ہو۔ اس لئے کہ جمع نہ ہونا ضد کی خاصیت ہے اور جمع نہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ضدین ایک دوسرے کی نفی کر رہے ہیں اور نفی کرنے کالازمہ محدودیت ہے اور خدا محدود نہیں ہے۔ اگر ''تضاد فلسفی'' فرض کیا جائے تو تضاد فلسفی از قبیل اعراض ہے۔ اس طرح خدا ''عرض'' ہونے کے بعد محل کا محتاج ہو جائے گا۔ مگر خدا کو کسی چیز کی احتیاج نہیں ہے در اصل سارا عالم خدا کے وجود کا پرتو اور جلوہ ہے اور کسی چیز کا جلوہ اس سے جدا نہیں ہوتا جس کی بناء پر تضاد لازم آئے۔

پروفیسر اڈنگٹن (Adington) اپنی تصنیف "Space Time and Gravitation" میں طبیعات کی ''دوامی وجود'' میں تلاش کی ناکامی ان الفاظ میں کرتا ہے۔

> ''انسان مختلف نسبتوں کے ریاضاتی مطالعہ کے بعد عالم مدرک کی کسی ایک صفت کو اس کا دوامی جوہر قرار دے دیتا ہے اور پھر زمان مدرک اور مکان مدرک کی تقسیم سے اس کے لئے کوئی دوامی جگہ پیدا کرلے اور اسی خیالاتی روش کی بناء پر چارو ناچار ہم قوانین کشش ثقل اور قوانین میکانیات و ہندسہ کی پابندی پر مجبور ہو

جاتے ہیں اور دوامی کی یہی جستجو ہے جس کے ماتحت ذہن انسانی نے طبیعات کی دنیا پیدا کی۔ لیکن علمائے طبیعات کو ابھی اپنے منہاجات کی رو سے معلوم کرنا باقی ہے کہ طبیعات کے اس بظاہر دوامی عالم کی یہ گزرتی ہوئی نمائش جس کو ذہن انسانی نے اپنی جستجو ثبات میں پیدا کر رکھا ہے، کیا واقعی کسی زیادہ دوامی وجود (اللہ) سے وابستہ ہے۔''؟

اس مقام پر اب ہم جوہری ارتقاء کے مناظر میں جوہر کی حقیقت جاننے کی کوشش کرتے ہیں کہ آیا وہ کوئی دوامی وجود رکھتا ہے اور جو کہ فی زمانہ سائنس کی ترقی کی انتہاء ہے، لیکن ابھی بھی ناممکن ہے۔ اس ضمن میں ہم ''اشاعرہ'' کے جوہری نظریات کے مقابل اپنے موضوع کو ثابت کریں گے۔

جوہری ارتقاء اور ذات الٰہیہ

اشاعرہ کے نزدیک کائنات کی ترکیب جواہر (Atoms) سے ہوئی جن کا مزید تجریہ ناممکن ہے۔ لیکن خالق کائنات کی تخلیقی فعالیت کا سلسلہ چونکہ برابر جاری ہے۔ اس لئے جواہر کی تعداد بھی لامتناہی ہے۔ کیونکہ ہر لمحہ نئے نئے جواہر پیدا کئے جا رہے ہیں اور اس لئے کائنات میں برابر اضافہ ہو رہا ہے۔

قرآن مجید فرقان حمید کا بھی یہی ارشاد ہے۔

يَزِيْدُ فِي الْخَلْقِ مَا يَشَآءُ ؕ (فاطر:1)

لیکن یاد رکھنا چاہئے جواہر کی حقیقت کا دارومدار ان کی ہستی پر نہیں۔ ہستی تو وہ صفت ہے جو اللہ تعالیٰ جواہر کو عطا کرتا ہے۔ جب تک یہ صفت عطا نہیں ہوتی تو جواہر قدرت الٰہیہ کے پردے میں مخفی رہتے ہیں۔ وہ ہستی میں آتے ہیں تو اس وقت جب یہ قدرت کوئی ظاہری شکل اختیار کرتی ہے۔ لہٰذا بہ اعتبار ماہیت جوہر کو مکمل طور پر ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ گو یوں کہئے اس کا ایک محل بھی ہے لیکن مکان سے بے نیاز۔ کیونکہ یہ صرف جواہر کا اجتماع ہے جن سے ان میں کوئی ظاہری ہیئت کسی استعداد کے ساتھ اپنی صفت کو ظاہر کرتی ہے اور

مکان کا ظہور ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ابن حزم نے اس نظریئے کی تنقید کرتے ہوئے نہایت صحیح کہا ہے کہ اصطلاحاً قرآنی عمل تخلیق اور مخلوق بطور شے میں کوئی فرق نہیں۔ ہم جسے شے کہتے ہیں وہ صرف ان اعمال کا مجموعہ ہے جن کا اظہار جواہر کی شکل میں ہو رہا ہے یا یہ سوال کہ اس جوہری عمل کا تصور کس طرح ممکن ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ ہم اس سے متعلق کوئی تصویر اپنے ذہن میں نہیں لا سکتے۔ مگر پھر جدید طبیعات میں بھی تو عالم طبعی کی ہر مقدار کے اصل جواہر کا تصور بطور عمل کے ہی کیا جاتا ہے۔ بقول شاعر اڈنگٹن (Adington) ''نظریہ عمل مقدار'' کی ٹھیک ٹھیک تشکیل ابھی باقی ہے۔ گو خیال یہی ہے کہ اس میں جوہریت عمل ہی کا قانون کارفرما ہے اور اس لئے برقیوں کا ظہور بھی کسی نہ کسی طرح اس قانون سے وابستہ ہے۔ لیکن جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے کہ جوہر کا ایک محل تو ہوگا لیکن مکان سے آزاد۔ لہٰذا سوال پیدا ہوتا ہے کہ اندریں صورت ہمیں حرکت کے بارے میں کیا رائے قائم کرنی چاہیئے۔ بالفاظ دیگر یہ کہ حرکت کا وجود حقیقی ہے یا باطل۔ کیونکہ حرکت کے معنی ہیں جوہر کا سرور فی المکان۔ لیکن اشاعرہ کے نزدیک مکان چونکہ بجائے خود نتیجہ ہے جواہر کے اجتماع کا۔ لہٰذا وہ حرکت کی تعریف یوں تو کر نہیں سکتے تھے کہ اس کا مطلب ہے کسی جسم کا ان سب نقطہ ہائے مکانی سے گزر کرنا جو کسی مقام کی ابتداء سے انتہا تک واقع ہوں اور جس سے بالآخر یہ ماننا لازم آتا ہے کہ خدا ایک قائم بالذات حقیقت ہے (مگر جس کے اشاعرہ قائل نہیں تھے)۔ یہ مشکل تھی جس کے حل میں ''نظام'' نے ''جست'' کا تصور قائم کیا۔ نظام کا کہنا یہ تھا کہ جب کوئی جسم حرکت کرتا ہے تو ہمیں یہ نہیں سمجھنا چاہیئے کہ وہ ایک نقطہ مکانی سے دوسرے نقطہ مکانی تک، جو ظاہر ہے اس سے منفصل ہوگا، گزر کرتا ہوا آگے بڑھتا ہے۔ بلکہ ہمیں یہ کہنا چاہیئے کہ وہ اس سے کود جاتا ہے۔ یعنی اجزائے مکانی کے حائل ہوئے بغیر ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہو۔ گویا حرکت کی رفتار خواہ تیز ہو یا سست ہمیشہ یکساں رہتی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اگر نقاط سکون زیادہ ہیں تو حرکت بھی سست رہے گی۔ لیکن نظام کا پیش کردہ تصور ہماری مشکل کا کوئی حل نہیں۔ لیکن پھر جدید طبیعات

کے نظریہ جواہر میں بھی اس مشکل کا کچھ ایسا ہی حل تجویز کیا گیا ہے۔ چنانچہ پلانک (Plank) کے" نظریہ مقادیر" کے تحت جو تجربات کئے گئے ان کی رو سے اب یہ کہنا ناممکن ہے کہ جوہر مکان میں بہ تسلسل اپنا راستے طے کرتا رہتا ہے۔

اپنی تصنیف "Science and the Modern World" میں پروفیسر وائٹ ہیڈ (White Head) نے لکھا ہے۔

(ترجمہ) ہم اس امر کی توجیہ شاید یہ فرض کرتے ہوئے زیادہ کامیابی سے کر سکتے ہیں کہ جوہر مکان بسیط میں ایک مدت زمانی کے بعد دوسری مدت زمانی کے دوران میں علی التواتر مختلف جگہوں پر ظاہر ہوتا رہے۔ مگر جس کی مثال کچھ یوں ہو گی جیسے کوئی موٹر گاڑی جو تیس میل فی گھنٹہ کی رفتار سے چل رہی ہے، برابر کسی سڑک پر تو چلتی نہ رہے۔ بلکہ ایک سنگ میل کے بعد دوسرے سنگ میل پر باری باری سے ظاہر ہو کر دو دو منٹ کے لئے رکی رہے۔

اشاعرہ کے نظریہ تخلیق کا دوسرا اہم پہلو (یعنی حقیقت اور ہستی کے بعد) وہ ہے جس میں اعراض کا مسئلہ زیر بحث آ جاتا ہے۔ اشاعرہ کا خیال تھا کو جوہر کی ہستی قائم رہتی ہے تو اعراض کی مسلسل تخلیق سے یا یوں کہئے کہ اگر اللہ تعالیٰ اعراض کا سلسلہ تخلیق روک لے تو جوہر کی ہستی بطور جوہر ختم ہو جائے گی۔ اب ہر جوہر کو اپنی جگہ کچھ صفات چاہئے ہیں خواہ یہ صفات مثبت ہوں یا منفی۔ کیونکہ اگر ہستی ہے تو پھر اس کی کوئی صفت بھی ہو گی جن کا اظہار ہمیشہ دو دو کے مجموعوں کی شکل میں ہوتا ہے۔ مثلاً موت و حیات یا حرکت و سکون کی شکل میں۔ مگر جن کو عملاً کوئی ثبات حاصل نہیں۔ اس لئے کہ صفت کوئی زمانی عمل نہیں۔ یوں دو قوانین ہمیں حاصل ہوتے ہیں۔

☆ بہ اعتبار ماہیت کسی شے کو قرار نہیں۔

☆ جواہر کا صرف ایک ہی نظام ہے۔

لہٰذا روح بھی مادے ہی کی ایک لطیف شکل ہے یا محض عرض۔ جہاں تک اول الذکر کا

تعلق ہے تو تخلیق مسلسل کے اس نظریئے کی رو سے جو اشاعرہ کو قائم کرنا منظور تھا، ہمیں ان سے ایک حد تک اتفاق کرنا پڑے گا اور قرآن مجید کا نقطہ نظر بحیثیت مجموعی یونانیت کے منافی ہے اور اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ اشاعرہ نے مشیت مطلقہ یا قدرت مطلقہ کی بناء پر فی الواقعہ اس امر کی کوشش کی کہ تخلیق عالم کا ایک ایسا نظریہ قائم کریں جو اپنی خامیوں کے باوجود ارسطو کے اس تصور کی نسبت کہ کائنات ایک ساکن وجود ہے، قرآن مجید کے نقطہ نظر کی زیادہ صحت کے ساتھ ترجمانی کرے۔ لہٰذا اب یہ کام مستقبل کے علمائے الٰہیات کا ہے کہ اس نظریئے کو پھر سے اس طرح پیش کریں کہ وہ علم حاضر سے جس کا اپنا رجحان بھی اسی جانب ہے، قریب تر ہو جائے۔ رہا موخر الذکر، سو اس کی روح سراسر مادی ہے۔ یوں بھی اشاعرہ کا یہ خیال کہ نفس کی حقیقت عرض سے زیادہ نہیں، خود ان کے اپنے نظریئے کے حقیقی تقاضوں کے خلاف ہے۔ کیونکہ اس نظریئے کی رو سے جوہر کی مسلسل ہستی کا دارومدار اعراض کی مسلسل تخلیق پر ہے۔ اب زمانے کے بغیر یہ ممکن ہی نہیں کہ حرکت کا تصور کیا جا سکے اور زمانے کا تعلق حیات نفسی سے ہے۔ اس لئے ثابت ہوا کہ زمانے کا وجود بمقابلہ حرکت زیادہ اساسی ہے۔ یا دوسرے لفظوں میں یہ کہ حیات نفسی کی نفی زمانے کی نفی ہے اور زمانے کا انکار حرکت کا انکار ہے۔ لہٰذا اشاعرہ جس چیز کو عرض کہتے ہیں اس سے تو جوہر کی ہستی کا تسلسل بحیثیت جوہر قائم رہتا ہے۔ کیونکہ جو ہر قید مکانی میں آتا ہے یا آتا ہوا محسوس ہوتا ہے تو صفت ہستی کی بدولت جس کا مطلب پھر یہ ہے کہ بحیثیت قدرت الٰہیہ کی ایک شان کے جوہر کی ماہیت خالصاً روحانی ہے۔ گویا نفس محض عمل ہے اور جسم اس عمل کی مرئی اس لئے قابل پیمائش شکل ہے۔

لہٰذا جب رومی یہ کہتا ہے۔

پیکر از ما ہست شد نے ما ازو۔
بادہ از ما مست شد نے ما ازو

تو اس سے حضرت غزالی رحمۃ اللہ علیہ کی نسبت اسلامی نقطہ نظر کی ترجمانی زیادہ صحت

کے ساتھ ہو جاتی ہے۔ اسی طرح کہ حرکت کا اثبات زمانے کا اثبات ہے اور زمانے کے اثبات حیات نفسی کا اثبات۔ دوسرے الفاظ میں مقدم، حیات نفسی ہے پھر زمانہ اور پھر حرکت۔اب اشاعرہ کے نزدیک قدرت الٰہیہ کا اظہار جواہر کی شکل میں ہورہا ہے اور جواہر کی حقیقت بجز اس کے کچھ نہیں کہ وہ اک شان ہے قدرت الٰہیہ کی اور ایک لمحہ حیات الٰہیہ میں۔لہٰذا روح جسم سے مقدم ہے، جسم اس کا پیکر ہے، اس کی مرئی شکل اور اس کے اظہار کا ایک ذریعہ۔ چنانچہ حقیقت اپنے مطلب میں محض روح ہے، فقط نظر اس سے کہ روح کے بھی مختلف درجات ہیں۔ اس اسلامی فلسفہ میں شیخ مقتول شہاب الدین سہروردی رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں ان کا ذکر موجود ہے۔ بہرکیف حقیقت مطلقہ کا تصور بطور ایک ''انا'' ہی کے کرنا چاہیئے اور اس لئے میرے نزدیک انیت مطلقہ سے انیتوں ہی کا صدور ممکن ہے۔ دوسرے الفاظ میں انیت مطلقہ کی تخلیقی قدرت کا اظہار (جس میں فکر کو عمل کا مترادف سمجھنا چاہیئے) ان وحدتوں ہی کی شکل میں ہوتا ہے جن کو ہم ''انا'' سے تعبیر کرتے ہیں۔ گویا کائنات کا ہر عمل خواہ اس کا تعلق مادی جواہر کی میکانیاتی حرکت سے ہو یا ذات انسانی (خودی یا انا) میں فکر کی آزادانہ کارفرمائی سے، سب کی حقیقت بجز ایک عظیم اور برتر ''انا'' کے انکشاف ذات کے سوا اور کچھ نہیں۔لہٰذا قدرت الٰہیہ کا ہر جوہر خواہ اس کا درجہ ہستی پست ہو یا بلند، اپنی ماہیت میں ایک ''انا'' ہے اور اسی سے فلسفہ ''انا الحق'' تقویت حاصل کرتا ہے۔

زمانہ جدید کے نظام جواہر کے آئینہ میں ذات الٰہی کے تصور کو واضح کرنے کے بعد اب بذات خود انسانی نفسیات میں بھی اس حقیقت مطلقہ کے پنپنا تے تصور سے واقفیت حاصل کر لی جائے۔

جدید نفسیات اور تصور حقیقی

قارئین کرام! انسان اب ماحول کا غلام نہیں رہا بلکہ اس کا آقا بن چکا ہے۔ وہ اب برق و باد اور آب و آتش کی زور آزمائیوں سے مرعوب نہیں ہوتا۔ بلکہ انہیں زرخرید غلام کی طرح گھریلو کام کاج میں استعمال کرتا ہے۔ بجلی اس کی مشین چلاتی ہے اور اس کے لئے

روشنی اور ہوا کا انتظام کرتی ہے، پانی اس کے لئے بجلی مہیا کرتا ہے اور سٹیم (Steam) کی شکل میں بڑی بڑی مشینوں کو چلاتا ہے۔ ابھی یہ ابتدائی مرحلہ ہے۔ فطرت کے نئے نئے قانون دریافت کر کے انسان زیادہ سے زیادہ قوی ہوتا چلا جا رہا ہے، وقت اور فاصلے کا سوال ایک حد تک حل ہو چکا ہے۔ اب یہ صورت اور صورت کو بغیر کسی ظاہری وسیلہ کے اقصائے عالم میں پھیلا سکتا ہے اور اب سیاروں پر شب خون مارنے کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ غیر معمولی قوت واقتدار کے دو ہی نتیجے ہو سکتے ہیں۔ یا تو حضرت انسان اپنے ہی ہاتھوں اپنے لئے جہنم تیار کر رہا ہے کہ جس میں گر کر پھر کوئی بھی راہ رستگاری باقی نہیں رہتی یا ایسی جنت تیار کر رہا ہے جس کا تصور بھی ابھی ممکن نہیں۔ جنت یا جہنم کا فیصلہ انسان کے اپنے مزاج نے ہی کرنا ہے۔ بظاہر تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ قوت واقتدار کا مالک انسان جس منزل کی طرف جا رہا ہے وہ قطعی ہلاکت اور تباہی کی منزل ہے۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ جن قوتوں پر انسان نے قبضہ کیا ہے وہ خود اس پر قابض ہوتی چلی جا رہی ہیں۔ اس کی فتح اب شکست میں بدل رہی ہے۔ یہ تمام قوتیں تعمیر میں نہیں بلکہ تخریب میں استعمال ہو رہی ہیں۔ قوت جتنی زیادہ ہوگی اتنی ہی زیادہ وہ ہلاکت پیدا کر سکے گی اور اب اس ہلاکت کے تصور ہی سے انسان کی روح کانپ رہی ہے۔

آپ کسی دیوانے کے ہاتھ میں بندوق تھما کر کسی اچھے نتیجے کی توقع نہیں رکھ سکتے اور یہی بندوق اگر کسی شریف اور معقول آدمی کے ہاتھ میں ہو تو وہ اس سے نیکی کی حمایت اور بدی کی مخالفت کا کام لے گا۔ کیونکہ قوت کا استعمال تو استعمال کنندہ کے اپنے ہی مزاج پر مبنی ہے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ سب سے پہلے عناصر پر قابض انسان کو انسان بنانے کی کوشش کی جائے۔ ورنہ نتیجہ وہی ہوگا جو دیوانے کو ہتھیار تھما دینے سے ہوتا ہے۔ انسان کی اس کمزوری کو اب شدت سے محسوس کیا جا رہا ہے کہ ماحول پر قابض انسان ہنوز اپنے ادنیٰ جذبات کا غلام ہے۔ یہ عقل کے زور سے ایٹمی قوتوں پر حکمران ہے لیکن اپنی ادنیٰ سے ادنیٰ خواہشات کا بندہ بے دام ہے۔ اب مفکرین بڑی سنجیدگی سے اس پر غور کر رہے ہیں کہ اگر عقل اور

اخلاق ہم عناں نہ رہے تو نتیجہ کیا ہوگا؟ جب تک انسان خود اپنے آپ کو نہیں سمجھ لیتا وہ اپنی خواہشات اور جذبات کا مقابلہ نہیں کرسکتا اور جب تک وہ اپنے متضاد فطری تقاضوں کو ہم آہنگ نہیں کر پاتا وہ دوسروں سے حسن سلوک نہیں کرسکتا اور جب تک وہ دوسروں سے حسن سلوک نہیں کرسکتا دنیا میں قیام امن نہیں ہوسکتا۔ لہٰذا اب خود اپنے آپ کو سمجھنے کے لئے نفسیات پر زور دیا جارہا ہے۔ (Psychology) علم النفس کی عمر دوسرے تمام علوم سے کم ہے۔ ابھی اسے مرتب اور مدون ہوکر علمی حیثیت حاصل کئے ہوئے کل پینتیس، چالیس سال ہی ہوئے ہیں۔ لیکن انسان کے ذوق تحقیق نے اس مختصر سے عرصے میں ہی کافی معلومات حاصل کر لی ہیں۔ بہر حال یہ اقدام اس لحاظ سے بہت اہم ہے کہ انسان نے اپنے آپ کو سمجھنے کی کوشش شروع کردی ہے۔

حضرت مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ تو پہلے ہی انسان کی خود شناسی کا شکوہ کرتے ہیں اور اسے عرفان نفس کی تحریک کر گئے۔

فلسفی گشتی و آگہ نیستی
تو کجاؤ از کجاؤ کیستی
از خود آگہ چوں نئی اے بے شعور
پس بریں علمت نمی باید غرور

حضرت علامہ محمد اقبال رحمۃ اللہ علیہ بھی اسی طرف توجہ دلا گئے۔

بینی جہاں را خود راند بینی
تا چند ناداں غافل نشینی

لہٰذا اب کہیں انسان اپنے جذباتی الجھاؤ، جذبات اور اخلاق کی کشمکش کے نتائج اور ماحول سے ٹکراؤ کے اثرات پر عملی لحاظ سے غور کرنا شروع کیا ہے اور وہ کوشاں ہے کہ جذباتی توازن حاصل کر کے سکون باطن کو پا سکے۔ اور پھر ایسے خود شناس اور مطمئن انسانوں کے اجتماع سے ایک مطمئن اور پر امن معاشرہ وجود میں آئے۔ جذباتی ہیجان سے بچا جا سکے تو

ذہنی توازن خراب نہ ہو اور افراد کے ذہنی عدم توازن کی جو سزا، انسانیت کو جرم اور جنگ کی شکل میں بھگتنی پڑتی ہے اس سے نجات ہو سکے۔ یہ مقصد بہر نوع بڑا مقدس ہے لیکن یہ بات محل نظر ہے کہ کیا علم النفس، انسان کے نا تمام مطالعہ پر مبنی انکشافات کے ذریعے، انسان کے ذہنی عوارض کا کامیاب علاج پیش کر سکتا ہے؟ فی الحال تو جواب یہی ہے کہ جب تک مکمل انسان، جو جسم، ذہن اور روح کا مرکب ہے زیر مطالعہ نہ آئے، اس وقت تک جزوی اور نا تمام تحقیقات مفید نہیں ہو سکتی۔ بدقسمتی یہ ہے کہ اب تک انسان کو صرف کسی ایک پہلو سے دیکھا گیا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ طب اور نفسیات دونوں ہی انسان کی جزوی راحت کا سامان کر پائی ہیں۔ صرف مذہب کا تصور ذات حقیقی ہی انسان کو بطور انسان کے مکمل طور پر ارتقاء پذیر کرنے کا داعی ہے اور اس میں کامیاب بھی ہے۔

آیئے! ہم علم النفس کی تعریف پر بھی غور کریں۔ بعض علماء نے لکھا ہے کہ نفسیات ''انسان کا مطالعہ'' ہے۔ لیکن یہ تعریف بہت زیادہ وسیع ہے۔ کیونکہ بعض دیگر علوم مثلاً علم الحیات، علم الانسان، اقتصادیات اور سیاسیات وغیرہ کا دائرہ عمل بھی یہی ہے اور اس لحاظ سے یہ تعریف بین اور واضح نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ نفسیات کا تعلق دوسرے علوم سے متعین کرنا آسان نہیں۔ بعض یونیورسٹیوں میں نفسیات کو قدرتی علوم مثلاً (Biology) علم الحیات سے متعلق کیا گیا ہے اور بعض میں اس کو اجتماعی علوم کے زمرہ میں شمار کیا جاتا ہے۔ نفسیات قدرتی اور اجتماعی دونوں قسم کے علوم سے متعلق ہے اور پھر ان سے الگ بھی ہے۔ مندرجہ بالا تعریف سے واضح تر تعریف یہ ہے کہ ''نفسیات فطرت انسانی اور اس کی عملی سرگرمیوں کا عمومی مطالعہ ہے'' فی الواقت نفسیات کے مطالعہ سے مندرجہ ذیل توقعات وابستہ کی جا سکتی ہیں۔

☆ اس کی مدد سے اجتماعی مسائل حل کرنے میں مدد مل سکتی ہے۔ انسان مدنی الطبع ہے، ہمیشہ مل جل کر رہتا ہے اور اس طرح افراد کے اجتماع سے کئی قسم کے مسائل پیدا ہوتے ہیں۔ انسان اگر اپنے طبعی تقاضوں کو صحیح طور پر سمجھ سکتا ہو اور پھر اپنے جذبات

پر قابو بھی رکھ سکتا ہو تو وہ دوسروں کے ساتھ بہتر طور پر تعاون کر سکتا ہے اور اجتماعی ذمہ داریوں کو بہتر طور پر ادا کر سکتا ہے۔ لیکن اگر وہ غصیلا، چڑ چڑا، حاسد یا شکی ہو تو ظاہر ہے وہ دوسرے انسانوں سے عمدہ سلوک نہیں کر سکتا۔ اس کے علاوہ ماحول کی ناسازگاری کا اندازہ کر کے ماحول میں مناسب ترمیم کرنا یا خود اپنے آپ کو بدل کر ماحول کے مناسب بنانا بھی لازم ہوتا ہے۔ ورنہ ماحول اور زندگی کی ناسازگاری ایک مستقل بے اطمینانی اور کشمکش میں مبتلا کر دیتی ہے۔

☆ نفسیات کے مطالعہ سے دوسروں کو سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے۔ جہاں عمدہ اجتماعی تعاون کے لئے عرفان نفس لازم ہے۔ وہاں دوسروں کی معرفت بھی ضروری ہے کیونکہ جہاں انسان اپنے طبعی تقاضوں کی تسکین چاہتا ہے وہاں دوسروں کے طبعی تقاضوں کی تسکین کا مناسب اہتمام کرنا بھی ضروری ہوتا ہے۔ ورنہ مطمئن معاشرہ وجود میں نہیں آ سکتا۔ انسان اپنے ہی مطالعہ سے دوسروں کا مطالعہ کر سکتا ہے اور نفسیات چونکہ اپنی فطرت کے متعلق علم فراہم کرتی ہے اس لئے وہ دوسروں کے متعلق واقفیت بہم پہنچانے میں مدد دیتی ہے۔

☆ ہم علم برائے علم کے لحاظ سے بھی نفسیات کا مطالعہ کرتے ہیں۔ حصول علم سے انسان کو نئی قوت حاصل ہوتی ہے اور اس کی فطرت کی تکمیل ہوتی ہے اور اسے دماغی ارتقاء نصیب ہوتا ہے۔ حصول علم میں فطرت انسان کی تکمیل مضمر ہے اور تکمیل کے احساس کے ساتھ ایک ایسی لذت وابستہ ہے جو عام جذباتی تقاضوں کی تسکین سے حاصل نہیں ہوتی۔ اس لئے ایسا عالم کسی علمی نکتہ کے حصول یا کسی مشکل مسئلہ کے حل سے جو حظ حاصل ہوتا ہے اس کا اندازہ ایک آدمی کر ہی نہیں سکتا۔ نیوٹن کے متعلق مشہور ہے کہ اسے اپنی علمی تحقیقات میں خود فراموشی کی حد تک محویت ہوتی تھی۔ چنانچہ ایک دفعہ اسی محویت کی حالت میں دیکھ کر اس کے ایک بے تکلف دوست نے اس کا کھانا تناول کر لیا اور پس خوردہ دستر خوان پر ہی رہنے دیا۔ تحقیقات سے فارغ ہونے پر جب نیوٹن

نے پس خوردہ دیکھا تو اسے یقین ہو گیا کہ وہ کھانا کھا چکا ہے۔ ایسے ہی علمی انہماک کے واقعات دیگر علماء اور محققین کے متعلق بھی مشہور ہیں کہ وہ اپنے علمی انہماک میں اپنے گردو پیش کو قطعاً بھول جایا کرتے تھے۔

اب نفسیات میں بھی نفسیات کے اس خصوصی شعبہ پر زور دیا جا رہا ہے جو نفسیاتی عوارض کی تشخیص اور ان کے علاج کے متعلق مخصوص ہے اور اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ تہذیب و تمدن کی ترقی اور ماحول پر غیر معمولی فتح کے باوجود انسان قلبی سکون اور اطمینان سے محروم ہے اور وہ جن جن اشیاء کے حصول کو قلبی مسرت اور دلی اطمینان کا ذریعہ سمجھ رہا تھا وہ اسے اطمینان بخشنے میں ناکام رہی ہیں۔ وہ سب کچھ رکھتے ہوئے بھی اپنے آپ کو مفلس سمجھ رہا ہے۔ وہ اپنے جبلی اور طبعی تقاضوں کو تو مطمئن کر سکا ہے لیکن اپنے دلی اور روحانی تقاضوں کو نہ سمجھ سکا ہے اور نہ ہی ان کی تسکین کا سامان کر سکا ہے۔ وہ حال سے غیر مطمئن اور مستقبل سے خائف ہے۔ امریکہ میں لاکھوں لوگ مستقل اقامت گاہوں کو چھوڑ کر سفری مکانوں میں خانہ بدوشوں کی سی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ وہ روز بروز پرانے ماحول سے بھاگ کر کسی نئے ماحول میں پناہ لینا چاہتے ہیں۔ لیکن اضطراب ان کا پیچھا نہیں چھوڑتا۔ نام نہاد تہذیب کی قید کے خلاف ردعمل کے طور پر لاکھوں مرد و زن "مکمل برہنگی" (Nudism) کا شیوہ اختیار کر رہے ہیں۔ لاکھوں نوجوان ہپی بن کر تہذیب و تمدن کے تمام تقاضوں کا منہ چڑا رہے ہیں۔ وہ اپنے اس احمقانہ طرز عمل کے جواز کے طور پر نئی سے نئی طبی اور نفسیاتی وجوہات بیان کرتے رہتے ہیں۔ لیکن حقیقتاً وہ اپنی انسانی ذمہ داریوں سے گھبرا کر، دور طفولیت کی غیر ذمہ داریوں کی طرف رجعت قہقری اختیار کر رہے ہیں۔ وہ لاشعوری طور پر پھر بچہ بننا چاہتے ہیں کہ اس دور حیات میں وہ ہر قسم کی ذمہ داریوں سے آزاد تھے۔ اب وہ پھر لاشعوری طور پر اپنی اسی جنت میں گم گشتہ کو حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ طرز عمل ان کی انتہائی باطنی بے اطمینانی اور گہرے احساس کمتری کا ہی مظہر ہے۔ موجودہ تہذیب نے انسان کو سینکڑوں نئی سے نئی امراض بخشی ہیں جن کی وجہ سے

صرف داخلی بے اطمینانی اور جذباتی عدم توازن ہے۔

Psychosomatic Mdeicine کی تحقیق نے ثابت کر دیا ہے کہ خون کا دباؤ، معدہ کے زخم، اختلاج قلب، مزمن خوف اور ہسٹریا وغیرہ تمام عوارض کی وجہ صرف جذباتی ہیجان اور کشمکش ہے اور جب تک انسان اپنے اندر جذبات میں ہم آہنگی اور ماحول سے خوش دلانہ تعاون نہ کر پائے وہ ان عوارض سے بچ نہیں سکتا۔ Abnormal Psychology اپنی عوارض کی تشخیص، تحقیق اور علاج کی کوشش سے ہی معنون ہے۔ لیکن جب تک انسان کا مطالعہ، کائنات کے اجتماعی تصور کی ہم آہنگی کے ساتھ نہ کیا جائے اور کائنات میں اس کے مقام کا تعین نہ کیا جائے، اس وقت تک نہ ہی یہ اپنے آپ کو سمجھ سکتا ہے اور نہ ہی اپنی منزل حیات کا یقین کر سکتا ہے۔ انسان زندگی اور اس کے مقصد، اپنی ابتداء اور انتہاء، خیر وشر اور موت وحیات کے متعلق سوالات کا تسلی بخش جواب چاہتا ہے۔ وہ اس گونا گوں کثرت میں وحدت کا متلاشی ہے، وہ اس ہمہ وقتی تغیر میں ثبات کا جویا ہے، وہ فنا کے مظاہر کے پیچھے بقاء کے مظاہر کو دیکھنا چاہتا ہے، وہ اپنی اخلاقی مساعی کے عظیم اور یقینی نتائج کو سمجھنے کا متمنی ہے۔ جب تک ان تمام سوالات کا تسلی بخش جواب اسے مہیا نہ کیا جائے اور جب تک انسانی ذات اور کائنات کے متعلق ایک تسلی بخش اور قابل عمل نظریہ اسے مہیا نہ کیا جائے، اس کا وجدان کبھی مطمئن نہیں ہو سکتا۔ اور یہ فلسفہ صرف ایک سچا مذہب ہی مہیا کر سکتا ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ جدید نفسیات کی تشکیل، باقی علوم انسانی سے متعلق رہتے ہوئے مذہب کے زیر سایہ کی جائے۔ تاکہ انفس وآفاق اور ذات وکائنات کا ایک جامع اور صحیح نظریہ مرتب ہو سکے۔ ورنہ مزاج انسانی کی تسکین ممکن نہیں اور جزوی مساعی کی مشکور نہ ہو سکیں گی۔ حقیقت الٰہیہ سے دوری درصل فطرت انسانی کے سب سے بنیادی اور قوی تقاضے سے دوری ہے اور اس کی مسرت اور اطمینان سے مہجوری ہے۔ اور یہ حقیقت نفسیات کو علم کائنات کے ایک شعبہ کی حیثیت سے پیش کرتا ہے اور یوں انفس وآفاق میں ایک مطابقت اور آہنگی کا لائحہ عمل بھی مہیا کرتا ہے جس سے روح تسکین پاتی ہے اور یوں انفس و

آفاق میں ایک مطابقت اور آہنگی کا لائحہ عمل بھی مہیا کرتا ہے جس سے روح تسکین پاتی ہے۔ اس سے نفسیاتی اطمینان اور روحانی ارتقاء نصیب ہوتا ہے۔ روح مذہب سے ہٹ کر نفسیات کی تحقیقات جزوی اور ناتمام رہتی ہے اور اپنے مقاصد یعنی نفسیاتی صحت، جذباتی ہم آہنگی اور تکمیل شخصیت میں ناکام رہتی ہے۔

اسلام صحیح نصب العین پر مبنی مکمل ضابطہ حیات کا نام ہے۔ انسان اپنے آغاز اور انجام کو سمجھنا چاہتا ہے آغاز کو اس لئے وہ انجام کے سمجھنے میں مدد دے تاکہ انسان کو ابتداء میں ہی زندگی کی انتہا اور اس کے حصول کے لئے قانون ارتقاء کا پتہ چل جائے مگر اسے اپنے طبعی تقاضوں کو سمجھنے اور ان کی تسکین کے سلسلے میں مقید اور غیر مقید میں امتیاز کا شعور حاصل ہو سکے۔ انسان صرف جہت رنگ وحدت ہی نہیں بلکہ ایک بڑی وحدت (کائنات) کا ایک حصہ بھی ہے۔ لہٰذا جب تک اس بڑی وحدت (کائنات) کے سلسلہ میں یہ اپنے موقف و مقام کو نہ سمجھ لے یہ اس سے پورا تعاون نہیں کرسکتا اور نہ ہی اس سے پورا تعاون لے سکتا ہے۔ حالانکہ اس کے بقاء اور ارتقاء کے لئے انسانی ذات اور کائنات اور نفس و آفاق میں یہ تعمیری ہم آہنگی ضروری ہے۔ گو کائنات بظاہر مختلف موضوع اشیاء کا مجموعہ نظر آتی ہے اور پھر ہر ایک نوع میں بھی اسی نوع کے افراد میں باہمی اختلاف نظر آتا ہے لیکن جب غائر حکیمانہ نظر سے دیکھا جائے تو اس تمام اختلاف میں ایک ارتباط اور اس ظاہری انتشار کے پیچھے باطنی ارتباط نظر آتا ہے۔ تاہم مختلف اشیاء حقیقتاً متحد ہوتی ہیں اور جوں جوں انسان کی نگاہ کی گہرائی بڑھتی جاتی ہے۔ یہ سلسلہ ارتباط واضح سے واضح تر ہوتا چلا جاتا ہے اور انسان کثرت میں وحدت اور وحدت میں کثرت کو ملاحظہ کرسکتا ہے۔

زندگی اور ماحول میں توافق اور ذات کائنات میں رفاقت، زندگی کا ایک عملی تجربہ ہے کہ اس ہم آہنگی کے بغیر کسی بھی مرحلہ ارتقاء میں زندگی کا تحفظ ممکن نہ تھا۔ طبیعاتی اور حیوانی دور سے گزر کر انسان مرحلہ ارتقاء میں زندگی اس ارتباط اور ہم آہنگی کو بوضاحت دیکھنا، سمجھنا اور مرتب کرنا شروع کر دیا مزاج انسانی کا ذوق تجسس ہی وہ انسانی متاع گرانمایہ ہے جس

پر تمام علوم فنون اور ایجاد و تخلیق کا دارومدار ہے۔ انسان نے دیکھا کہ یہ ازلی اور ابدی "ربط باہم" طبیعات میں قوانین طبعی کے رنگ میں موجود ہے اور حیوانات میں "جبلت" کے رنگ میں کارفرما ہے۔ اور انسان میں محبت مقصد کے روپ میں جلوہ نما ہے۔ انسانی گاڑی کو متحرک رکھنے میں بھی جبلتیں کارفرما ہیں۔ جبلت انسانی تجربات کی تحت الشعوری یاد ہے۔ یہ نوع انسانی کے طویل تجربات کا لاشعوری نچوڑ ہے جو انسان کو طبعاً ودیعت کیا جاتا ہے جس سے انسانی گاڑی خود کار طریقہ پر چلتی رہتی ہے۔ تیار شدہ تجربات (جبلت) کے حصول سے انسانی کام آسان ہو جاتا ہے۔ ہر معاملہ میں فرد کو ذاتی تجربہ اور علم حاصل کر کے طویل اور صبر آزما عمل سے نجات مل جاتی ہے جس سے ابتدائی طبعی اور حیاتیاتی ضروریات خود کارانہ انداز میں پوری ہوتی رہتی ہیں۔ اور انسان کو عقلی اور روحانی اور نصب العین جستجو کے لئے وقت مل جاتا ہے۔ ارتقائی نکتہ نگاہ سے جبلتوں کے وجود، ان کی اور قوت کی صحیح سمت کی کوئی توجیہہ اس وقت تک ممکن نہیں ہوسکتی جب تک کہ زندگی کے انتہائے مقصود اور ارتقاء کی منزل کا تعین نہ کر لیا جائے۔

زندگی کے اس نصب العین کا تعین اور اس کی تلاش ہی مذہب کا سب سے بڑا مقصد ہے۔ تلاش مقصد کا زوردار تقاضا ہی ہے جو زندگی کو ہر مرحلہ ارتقاء میں کشاں کشاں تعمیر اور تحسین کے راستہ پر گامزن رکھتا ہے۔ نفسیاتی اور انسانی مرحلہ شعور میں بھی محبت مقصد کا جذبہ ہی انسانی سیرت و کردار کی تعمیر کا باعث ہوتا ہے۔ محبت مقصد کی زوردار کشش ہی فرد میں جبلتوں کی گوناگوں کے باوجود ایک نفسیاتی وحدت پیدا کر دیتی ہے۔ اور فرد کے کردار کو ایک متین سانچے میں ڈھال دیتی ہے۔ جبلتوں کی داخلی کشمکش اور متضاد تقاضے ہم آہنگ ہو کر ایک وجدانی مقصد کی خدمت کے لئے وقف ہو جاتے ہیں۔ یہ ربط باہم اور فقدان انتشار ہی داخلی اطمینان کی علت ہوتا ہے اور اسی فکری، جذباتی اور عملی وحدت سے ہی ایک مضبوط اور فعال کردار وجود پذیر ہوتا ہے اور یہ داخلی وحدت اور جذبات کی ہم آہنگی صرف نصب العین کی محبت کے دباؤ سے ہی ممکن ہے۔

جب وحدت نصب العین کے زوردار جذباتی تقاضوں کے ماتحت ایک ہی نصب العین کے متلاشی افراد میں ارتباط پیدا ہوتا ہے تو اس خاص معاشرہ کا ضابطہ اخلاق وجود پذیر ہوتا ہے۔ نصب العینی معاشرہ میں اخلاقی آئین کا اتباع کسی خارجی قوت کی بناء پر نہیں ہوتا بلکہ فرد اور معاشرہ کے ایک زوردار داخلی تقاضے کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس نصب العین کے استحضار اور قومی لگاؤ کے پیش نظر ایسے معاشرہ کا اخلاقی معیار بہت بلند ہوتا ہے اسے اخلاقی ضابطوں کا پابند رکھنے کے لئے کسی سیاسی اور قانونی لبادہ کی ضرورت نہیں پڑتی۔ بلکہ ہر فرد خوش دلی سے اپنے ہی داخلی تقاضے کو اخلاقی توضیحات کے رنگ میں پورا کرتا رہتا ہے۔ ایسے معاشرہ میں تنازع اور تصادم وظلم وجبر، عیش وعشرت کے تخریبی امور بہت ہی کم وقت پذیر ہوتے ہیں۔ فرد اور معاشرہ کا اپنا مزاج ہی ایسے تمام امور کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیتا ہے اور وہ صرف ان ہی امور کو خوش دلی سے قبول کر سکتا ہے جو اس کے نصب العین کے ماتحت اور اس کے حصول میں معاون ہیں۔

لہٰذا مذہب کا بنیادی اور اصولی حصہ تو وہ ہے جس میں انسان کے صحیح اور فطری نصب العین کی وضاحت کی گئی ہے۔ یہ فطری نصب العین عقیدۂ توحید ہے۔ اس کا تعین اس کی وضاحت اور اس سے وابستگی کی تعلیم، دین کا اصولی اور بنیادی حصہ ہے اور دوسرا حصہ اس نصب العین کے حصول کے سلسلہ میں انسان کی اجتماعی جدوجہد کے مفید اور صحیح ضابطہ کار کا تعین ہے جو شریعت کے نام سے موسوم ہے پہلے حصہ میں نہ کبھی اختلاف ہوا اور نہ ہو سکتا ہے کہ فطرت انسانی کے سب سے قوی اور بنیادی تقاضے کا ترجمان ہے۔ اس لئے مذہب کے اس اصولی اور نظریاتی حصے میں تمام انبیاء کرام علیہم السلام متحد ہیں۔ اور سب توحید کامل کو ہی اساس مذہب کے طور پر پیش کرتے ہیں اور یہی فطرت انسانی ہے جو ناقابل تغیر ہے۔ اٹل ہے، محکم ہے اور تمام اخلاقی اعمال اور تعمیری امور کا مبداء ہے۔

فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا ۭ لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ۭ
ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ ۙ (روم:30)

دوسرا حصہ شرائع کا ہے اس میں وقتی تقاضوں، تمدنی ضرورتوں اور انسان کے ذہنی ارتقاء کے پیش نظر تفاوت رہا ہے اور رہنا بھی چاہئے تھا کہ حصول مقصد کے وسائل کا اختلاف مقصد پر، اور وسائل سفر میں تفاوت منزل کی صحت پر اثر انداز نہیں ہوتا۔ بلکہ یہ عملی گونا گونی، تجرباتی ارتقاء، نفسیاتی تہذیب اور داخلی خود آ گاہی کا ذریعہ بنتی رہتی ہے۔

جستجوء مقصد، فطرت انسانی کا سب سے قوی تقاضا ہے۔ اس کا عملی ثبوت یہ ہے کہ انسان زندگی کے ابتدائی مرحلہ سے ہی اس جستجو میں منہمک رہا۔ انسانی ارتقاء کی تمام داستان جستجو مقصد کی جدوجہد سے ہی معنون ہے۔ ہم اسی معیار کے پیش نظر ماضی میں انسانی جدوجہد کی توضیع بھی کر سکتے ہیں اور اس کے مستقبل کی روش کی مناسب تشریح بھی کر سکتے ہیں۔ مقصد حیات کے تعین کے بعد مذہب، حصول مقصد کے کامیاب طریقے بھی بتاتا ہے۔ داخلی اور خارجہ یا انفسی اور آفاقی رکاوٹوں سے عہدہ برآ ہونے کے اطوار بھی سکھاتا ہے۔ نصب العین سے محبت چونکہ فطرت انسانی کا سب سے قوی تقاضا ہے۔ اس لئے اس تقاضے کی کماحقہ تسکین پر ہی انسان کی نفسیاتی صحت اور باطنی اطمینان کا دارومدار ہے "الا بذکر اللّٰہ تطمئن القلوب" سے اسی حقیقت کا اظہار مقصود ہے۔ نصب العین کی محبت کا دباؤ متفرق جبلتوں میں معتدل ہم آہنگی پیدا کر کے ایک حسین کردار کی تشکیل کرتا ہے۔

حصول مقصد کی راہ میں دو قسم کی دشواریاں پیش آ سکتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ انسان کو حصول مقصد کے تقاضے کے داخلی دباؤ کا احساس تو ہو لیکن وہ اسے شعوری طور پر سمجھ نہ سکے اور اس کی مناسب توضیح نہ کر سکے۔ اور دوسرے یہ کہ وہ اس تقاضے کو شعوری طور پر سمجھ تو لے لیکن اس کے مقصود کا صحیح تعین نہ کر پائے اور غلط فہمی کی بناء پر کسی ادنیٰ اور ناقص نصب العین سے اس جذبہ کو وابستہ کرے۔ پہلی صورت میں انسان اپنے اندر ایک شدید اضطراب و خلش محسوس کرتا ہے لیکن غلطی سے اسے جبلتی ہیجان سمجھ کر بعض جبلتوں کی تسکین میں لگا رہتا ہے جیسا کہ آج کل Neuroses کو جبلتی تقاضوں کی رکاوٹ اور Ego اور Super Ego (ضمیر) کی باہمی کشمکش کا مظہر سمجھ کر Ego کو اظہار کا موقع مل جاتا ہے۔

حسن کا احساس تو ہوتا ہے لیکن وہ اس کے مقصد کا صحیح تعین نہیں کر پاتا اور غلط فہمی کی بناء پر کسی ادنیٰ اور ناقص نصب العین سے محبت مقصد کے جذبہ کی تسکین کرنا چاہتا ہے اور چونکہ ادنیٰ اعلیٰ کا اور ناقص کامل کا صحیح جانشین نہیں بن سکتا اس لئے داخلی اضطراب رفع نہیں ہوتا۔ اس صورت میں ایک اور الجھن بھی بعض اوقات پیش آجاتی ہے اور وہ یہ کہ بعض ادنیٰ نصب العین جبلت حیوانی کی مقصود بھی ہوتے ہیں۔ اس سے نصب العین محبت اور جبلتی محبت کے تقاضے ایک ہی شے سے وابستہ ہو کر غیر معمولی قوت حاصل کر لیتے ہیں۔ مثلاً عورت سے محبت اس لئے بھی ہوتی ہے کہ جبلت جنس اس کا تقاضا کرتی ہے اور اس لئے بھی ہو سکتی ہے کہ حسن وکمال کے صحیح نصب العین سے ناآشنائی کی بناء پر انسان حسین عورت کو ہی اپنے فطری جذبہ حصول حسن کا منتہائے نظر سمجھ بیٹھتا ہے اور یوں جبلت جنس کو جذبہ حسن سے مزید تقویت حاصل ہو جاتی ہے اور وہ ایک شدید لگاؤ کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ حسن وعشق کی اور کئی داستانوں میں یہی صورتحال کارفرما ہوتی ہے کہ سوئے اتفاق سے لاشعوری جذبہ حسن، جبلت شہوت سے مل کر ایک نامکمل نصب العین سے وابستہ ہو جاتا ہے اور والہانہ عقیدت سے اس کی پرستش شروع کر دیتا ہے۔

بہرحال جہاں جذبہ حسن کا اظہار ضروری ہے وہاں یہ بھی ضروری ہے کہ اس کو صحیح نصب العین سے آگاہ کر دیا جائے آیہ کریمہ "والذی قدر فھدیٰ" میں اس جذبہ کی موجودگی اور پھر اس کی تسکین کے لئے بہ شکل وحی قدرت کی رہنمائی کے اصول کی طرف ہی اشارہ کیا گیا ہے۔ جستجوئے مقصد کی قوت کو سمجھنا نفسیات کا کام ہے اور اس کو صحیح منتہائے مقصود سے آشنا کرنا مذہب کا کام ہے۔ یوں نفسیات اور مذہب میں ایک گہرا ربط ثابت ہوتا ہے اور چونکہ دونوں کا مقصد انسان کی فکری اور جذباتی واردات کا مطالعہ اور اس کی تہذیب وتسکین ہے۔ اس لئے دونوں میں تعاون انسانی کردار کی تشکیل کے سلسلے میں بہت مفید ہو سکتا ہے۔ اور چونکہ مذہب انسان کو ایک الگ وحدت کی حیثیت سے بھی دیکھتا ہے اور اس سے بڑی کائناتی وحدت کے ایک حصہ کی حیثیت سے بھی اور پھر وہ کائنات میں انسان کا مقام بھی متعین کرتا ہے اور اس کی منزل بھی اور پھر کائنات اور انسان کی ابتداء اور انتہاء کو بھی

ضروری حد تک بیان کرتا ہے اس لئے نفسیات کا مطالعہ مذہب کے ہمہ گیر تصور حیات کے ربط سے ہی کیا جائے تو وہ مفید مطلب اور درست ہو سکتا ہے۔

مذہب ان تمام سوالات کا جواب مہیا کرتا ہے جن کے تسلی بخش جواب کے بغیر انسانی مزاج کی تسکین نہیں ہو سکتی۔ انسان جہاں اپنے آپ کو سمجھنا چاہتا ہے وہاں اپنے گردو پیش کو بھی سمجھنا چاہتا ہے اور پھر ان کے باہمی تعلق کا علم بھی حاصل کرنا چاہتا ہے۔ مذہب ان تمام سوالات کا جواب مہیا کرتا ہے۔ اور تمام کائنات کی توجیہہ ایک مکمل اور مربوط وحدت کی حیثیت سے کرتا ہے جس سے انسان کی خلش جستجو کا ایک حد تک مداوا ہو جاتا ہے اور وہ اپنی منزل مقصود کے شعور سے حصول منزل تک تگ ودو کو کامیابی کے ساتھ جاری رکھ سکتا ہے۔

اب تک نفسیاتی امراض کے متعلق جو تشخیص ہوتی رہی۔ وہ چونکہ انسان کے متعلق ایک غلط تصور پر مبنی تھی اس لئے وہ بھی ناقص تھی اور چونکہ تشخص مرض غلط تھی اس لئے علاج بھی غلط ہی ہونا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ جب کسی چیز کے متعلق ایک غلط مفروضہ قائم کر لیا جائے تو اس مفروضہ کو صحیح سمجھ کر اس کی توضیح وتشریح اور اس سے استفادہ کے لئے جتنے بھی تجربات کئے جائیں گے وہ سب غلط ہوں گے۔ اور اس سلسلے میں جتنی بھی طویل کوشش کی جائے گی حقیقت سے اتنا ہی بُعد ہوتا چلا جائے گا۔ اس مشینی دور میں انسان کو بھی ایک نادر مشین یا ایک ترقی یافتہ حیوان ہی سمجھا جاتا رہا۔ Dynamic School جو آج کل یورپ کے قوت پرست دماغ کے لئے بہت زیادہ کشش رکھتا ہے۔ انسانی کردار کی توجیہ جبلتوں کی تسکین کے تصور سے ہی کر سکا ہے اور یہی نتیجہ نکالا گیا ہے کہ انسانی کردار کی گاڑی کو اس کا جبلتی حیاتیاتی دباؤ پیچھے سے دھکیلتا ہے۔ انسان کی امتیازی خصوصیت ''عزم اور جستجوئے مقصد'' کو ابھی تک نفسیات جدید میں وہ اہمیت نہیں مل سکی جس کی وہ مستحق ہے Gestall School کے متبع اب کردار کو کسی ایک جبلت کے دباؤ کا نتیجہ نہیں سمجھتے۔ بلکہ ان کے نزدیک انسان کے افعال اور کردار اس کی مکمل شخصیت کے آئینہ دار ہوتے ہیں۔ Allpart اپنی معیاری کتاب Personality میں شخصیت کو موزون کرتے ہیں۔ فرد کے مجموعی طور پر مائل بہ عمل ہونے

Hadfield سے اپنی کتاب Prychology and Mental Health میں لکھتے ہیں کہ کشمکش حیات، تطابق ماحول کے لئے ایک زندہ جسم کی ابتدائی کوشش ہے۔ لیکن حصول کمال کے لئے انسانی قویٰ کے مجموعی عمل کو اس کی سیرت کا نام دیتے ہیں تو لامحالہ اب ان کے نزدیک اختلال ذہنی اور دیگر نفسیاتی عوارض صرف شخصیت کی عدم تکمیل کے احساس کے ہی مظہر ہوتے ہیں۔ انسانی کردار کا یہ توجیہ حقیقت کے قریب ہے۔ انسانی کردار کا یہ Teleological تصور، نفسیات میں ایک جدید اور مفید باب کا اضافہ کر رہا ہے جس سے تشخیص اور علاج مرض میں نمایاں کامیابی کا امکان ہے۔ یہ ایک صحیح اقدام ہے اور مذہب میں انسان کے جامع تصور کا تائیدی پہلو لئے ہوئے ہے۔ اسی سے نفسیات اور مذہب میں مزید قرب پیدا ہوگا۔ جو ہر نوع انسانی کی نفسیاتی عصمت کے لئے بہت مفید ہے۔

انسان کی امتیازی خصوصیت ''عزم اور جستجوئے مقصد'' کو اب تک نفسیاتِ جدید میں وہ جگہ نہیں مل سکی جس کی وہ مستحق ہیں حالانکہ فطرت انسانی کے انہی تقاضوں کے سمجھنے سے انسانی ارتقا کی صحیح توجیہ بھی ممکن ہے اور انسانی سیرت و کردار کا صحیح تجزیہ بھی ہوسکتا ہے۔

جیسا کہ میں نے سطور بالا میں عرض کیا ہے اب نفسیات میں اس معنوی نکتہ نگاہ سے انسانی کردار کی تشریح کی طرف توجہ مبذول ہونی شروع ہوگئی ہے اور یہ ایک صحیح اقدام ہے اس سے نفسیات اور مذہب میں خاصا قرب پیدا ہو جائے گا اور نفسیات کو مذہب سے صحیح رہنمائی اور نئی قوت حاصل ہو جائے گی۔ مذہب فطرت انسانی ہی کی طرح ایک قدیم حقیقت ہے۔ کشمکش حیات کے انتہائی مشکل مراحل میں بھی مذہب نے ہی انسان کو ثابت قدم رکھا ہے۔ مشکل کو مذہب نے آسان بنا دیا ہے۔ ناامیدی کو امید سے بدل دیا ہے اور بزدلوں کو دلیر بنا دیا ہے۔ جہاں مذہب نے انسان کو خود شعور اور خود آگاہ بنایا وہاں ماحول سے سازگاری اور جبر میں اختیار کا ڈھب بھی سکھایا اور ساتھ ہی ساتھ محبت مقصد کے ذریعہ انسانی جبلتوں کی کشمکش سے بھی بچایا۔

جبلتوں کی یہ غیر ضروری کشمکش ہی اختلال ذہنی کی علت ہوتی ہے۔ مذہب نے داخلی

جبلتی دباؤ کے تعمیری اظہار کے طریقے بھی سکھائے اور پھر انسان کے سامنے صحیح تصور منزل پیش کر کے اس کے شعور ولاشعور میں وہ توافق پیدا کیا کہ انسانی سیرت وکردار کی راہ کی داخلی رکاوٹیں مٹ گئیں اور منزل تکمیل قریب تر ہوگئی۔ کردار کی خرابیوں کی ماہرین نفسیات نے عموماً تین قسمیں بتائی ہیں تا کہ ان کی علت کا تعین ہو سکے اور ان کے علاج میں سہوت ہو۔

1۔(Simple character Trait) کردار کا سادہ نقص۔ اس سے مراد وہ خرابی ہے جو ماحول کے اثر سے پیدا ہوئی ہے۔

2۔(Reaction character Trait) کردار کی وہ خرابی جو خود انسان کے کسی داخلی تقاضے کے ردعمل کے طور پر وجود پذیر ہوئی ہو۔

3۔(Psychoneuratic character Trait) جو اِن دبائے ہوئے لاشعوری تقاضوں کی نمود سے پیدا ہو۔ ایک مثال سے ان کو سمجھنے میں آسانی ہوگی۔ مثلاً ایک بارہ، چودہ سال کا بچہ چوری کا مرتکب ہوتا ہے۔ اس کی چوری کی علت مندرجہ بالا تینوں وجوہات میں سے کوئی بھی ہوسکتی ہے۔ پہلی صورت میں ممکن ہے کہ وہ لڑکا غلط ماحول میں پلا ہو۔ یا اس نے چوری بر بنائے ضرورت کی ہو۔ یا ناقص تعلیم کی وجہ سے اسے چوری کے گناہ کا پورا احساس نہ ہو۔ یا اس کے برے دوستوں نے اسے اس کام پر اکسا دیا ہو۔ ان تمام صورتوں میں چوری کا فعل کردار کی سادہ خرابی کہلائے گا۔

دوسری صورت میں وہ لڑکا ایک متمعل گھرانے میں پلا ہے اسے کوئی ایسی اقتصادی ضرورت درپیش نہیں جو اسے چوری پر آمادہ کرے۔ اس کی تربیت بھی اچھی ہوئی ہے لیکن جب اس کا چھوٹا بھائی پیدا ہوا اور اس نے دیکھا کہ اس کا چھوٹا بھائی بھی والدین کی محبت کا مرکز بنتا چلا جا رہا ہے اور والدین کی محبت پر اب اس کی اجارہ اداری قائم نہیں رہی اور والدین اب اس سے پہلی جیسی محبت نہیں کرتے تو اس سے اس میں احساس کمتری پیدا ہوگیا اور احساس کمتری کے ردعمل کے طور پر اس میں بغاوت اور سرکشی کے جذبات پیدا ہو گئے۔ جنہوں نے قانون شکنی اور چوری کے ذریعے اپنا اظہار شروع کر دیا۔ اس صورت میں اس کا

طرزِ عمل اپنے ہی ایک غلط داخلی تقاضے کا ردِ عمل ہے۔

تیسری صورت میں بھی لڑکے میں والدین کی محبت سے محرومی اور مایوسی کے ردِ عمل کے طور پر نفرت کا جذبہ پیدا ہوا۔ لیکن تحفظ خویش کی خاطر اس نے اسے اظہار سے روکا اور وہ جذبہ نفرت اس کے لاشعور میں چلا گیا۔ وہ لڑکا اب اس جذبہ نفرت کو شعوری طور پر بھول چکا ہے۔ وہ بظاہر ایک شریف اور مؤدب لڑکا ہے۔ لیکن کبھی کبھار وہ دبی ہوئی نفرت بے اختیار ظاہر ہو کر بچے کو ارتکاب جرم پر آمادہ کرتی ہے۔ یہ فعل دماغی کی بنا پر ارتکاب جرم کی مثال ہے۔ ان مثالوں سے معلوم ہوا کہ انسان میں جرم کا مادہ اور نفسیاتی خلل یا ماحول کے اثر سے پیدا ہوتا ہے یا پھر داخلی تقاضوں کی باہمی کشمکش ہے۔ مذہب دونوں صورتوں میں انسان کی رہنمائی اور امداد کرتا ہے۔ وہ ماحول سے تطابق کا عملی طریقہ بھی سکھاتا ہے اور محبت مقصد کے ماتحت جذبات میں ہم آہنگی بھی پیدا کرتا ہے۔ جس سے داخلی اضطراب اطمینان میں بدل جاتا ہے۔

مذہبی نظام اپنی عملی افادیت کا ثبوت ہزارہا سال کی تاریخ انسانیت کے ذریعے مہیا کر چکا ہے۔ لہٰذا تمام ان افراد کو جو مایوسی کا شکار ہوں، جو خوف و حزن میں مبتلا ہوں اور جن کو زندگی میں کوئی دلچسپی نظر نہ آتی ہو، مذہب کی طرف لوٹنا چاہئے۔ Psychological Clinics میں انہیں وہ سکون و اطمینان نہ مل سکے گا جو مساجد اور معابد میں مل سکے گا۔ معالج کی ترغیب ان میں وہ انقلاب نہ پیدا کر سکے گی جو ایک ہمدرد دینی رہنما کر سکے گا اور اپنی جذباتی الجھنوں کے تجزیہ سے ان کو وہ وہ فائدہ نہ پہنچے گا جو عبادت میں "تصور حسن مطلق" سے حاصل ہو گا۔ انسانوں نے معابد کو چھوڑ دیا تو انہیں (Psychological Clinics) ذہنی شفاخانوں میں پناہ لینی پڑی۔ وہ تصور حسن و کمال یعنی اپنے معبود کو بھول گئے تو انہیں جذباتی ہم آہنگی کے لئے ناقص تصورات کی پناہ لینی پڑی۔ ان کے برعکس وہ جو اس تصور حسن مطلق سے نزدیک ہیں وہ باعلم ہیں کہ کس طرح ان دینی اعتقادات اور اعمال میں ان نفسیاتی حفظ ماتقدم اور علاج کے وہ تمام عوامل سمو دیئے گئے ہیں۔ جن کو آج نفسیاتی انکشافات کے نتائج کے طور پر بھاری بھرکم علمی اصطلاحات کے پردوں میں چھپا کر پیش کیا جا رہا ہے۔

منازل یقین

خدائے رب العزت نے جس تصور کے ساتھ اپنے آپ کو دنیا کے سامنے پیش کیا وہ ''تصور عیاں'' ہے۔ ہم اس کی شان اور فضیلتوں کو اس تصور عیاں کے آئینے میں تلاش کر سکتے ہیں۔ کیونکہ انسان کی تخلیق کا مقصد ''جستجو'' بیان کیا جاتا ہے۔ اس تصور عیاں کو جن دو چیزوں نے عبارت کیا ہے وہ اللہ کی ''صفات'' اور ''اسماء'' ہیں۔ اپنی ان صفات اور اسماء کو بندگان خدا پر واضح کرنے کے بعد خدائے باری تعالیٰ تمام کو دعوت دیتا ہے کہ جو نشانیاں میں نے تمہارے لئے چھوڑی ہیں مجھے ان میں تلاش کرو۔ خدائے رب العزت کے اس تصور عیاں کو ہم اس طرح سے بھی بیان کر سکتے ہیں کہ جو ظاہر ہے اس کی حقیقت پوشیدہ ہے اور جو پوشیدہ ہے اس کی حقیقت ظاہر سے ہے۔ مثال کے طور پر ہر روح کی حقیقت بغیر کسی شک کے ہے اور لامحدود ہے۔ لیکن یہ انسان کی تخلیق کا باعث بنتی ہے جو کہ محدود ہے۔ ایک پیغمبر خدا کی ذات اس دنیا میں محدود ہے۔ یعنی ظاہری زندگی کا ایک عرصہ مقرر کر دیا گیا ہے۔ لیکن جو کچھ وہ خدا کے حکم سے دنیا والوں کے سامنے پیش کرتا ہے وہ اس کے بعد بھی لامحدود ہے۔ اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ محدود تصور کا احساس اس وقت تک ہی محدود ہے کہ جب تک خود تصور کا احساس ہے۔ سمندر کی لہروں کا احساس اس وقت تک ہوتا ہے جب تک سمندر رہے۔ اسی طرح اگر میں کہوں کہ ایک پرندہ انڈے سے ہے اور انڈہ پرندے سے تو کچھ غلط نہ ہوگا۔ ان تمام مثالوں کا آپ پر واضح کرنے کا مقصد صرف اتنا تھا کہ میں یہ کہہ سکوں کہ

> ''جو کچھ ہم اس دنیا کے گہرے مشاہدے سے حاصل کر سکتے ہیں تو اس کی واضح برتری ہے اس پر کہ جو ہم اللہ کے مشاہدے سے حاصل کر سکتے ہیں۔''

اس تحریر کو پڑھنے کے بعد آپ یہ سوچتے ہوں گے کہ یہ کس طرح ممکن ہے؟ اس کی وضاحت کچھ اس طرح سے کروں گا کہ اگر آپ اس دنیا کے آئینے میں اپنی تلاش کی جستجو کو قائم رکھتے ہیں تو اس صورت میں آپ کو اس دنیا کی جلوتوں میں جو چیز حاصل ہوگی وہ

صفات باری تعالیٰ کی حقیقت ہوگی اور اگر آپ اپنی جستجو خدا کے آئینے میں جاری رکھیں گے تو اس سے جو چیز آپ کو حاصل ہوگی وہ یہ دنیا ہوگی۔ اس صورت میں صفات باری تعالیٰ اس دنیا پر حاوی ہوں گی جو میری اوپر بیان کی گئی عبارت کی تصدیق کرتی ہے۔

حضرت علی المرتضیٰ علیہ السلام فرماتے ہیں کہ

''میں نے اپنے رب کو اپنے ارادوں کے ٹوٹنے سے پایا ہے۔''

گزشتہ امتوں کی جہالت کا سبب یہ تھا کہ مندرجہ بالا جو کچھ بیان کیا انہوں نے اس کے برعکس کیا۔ یعنی انہوں نے اس دنیا کے پردے کے پیچھے جھانکنے کی بجائے دنیا کے پردے کے آگے اپنے خدا کو تلاش کرنا چاہا۔ انہوں نے اس پردے کے آگے کے عناصر کی قوت اور ترتیب کو دیکھ کر ان کو اپنا خدا مان لیا اور یہ جاننے کی کوشش نہ کی کہ جس نے ان عناصر کو قوت اور ترتیب بخشی ہے وہ پس پردہ کارفرما ہے۔

تلاش اس کو نہ کر بتوں میں

وہ ہے بدلتی ہوئی رتوں میں

حضرت علی کرم اللہ وجہہ اس موقع پر اہل جستجو کی تعریف کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

''خدا تعالیٰ اس مرد پر اپنا رحم کرے جو آثار قدرت میں فکر کرتا ہے اس سے عبرت پذیر ہوتا ہے۔ سلسلہ کائنات کو عبرت کی نگاہ سے دیکھتا ہے اور اس سے بصیرت حاصل کرتا ہے۔''

اس موقع پر خدا کی وحدانیت کو واضح کرنے کے لئے میں ناگ پور کے شیخ ابراہیم کی فارسی تصنیف ''ارشاد العارفین'' سے چند سطروں کا ترجمہ پیش کروں گا۔ وہ کہتے ہیں کہ

''کسی بھی چیز کی تخلیق کسی دو چیزوں کا مجموعہ تفریق یا ضرب نہیں ہوتی۔ مثلاً انسان کو ہی لے لیجئے کہ اگرچہ وہ جن دو چیزوں سے مل کر بنا ہے اور اس دنیا میں بھیجا گیا ہے وہ روح اور مٹی ہیں۔ لیکن اس روح کی خصوصیات اور ہیں۔ مٹی کی اور ہیں اور ان سے تخلیق پانے والے انسان کی اور ہیں۔ اس دنیا سے جانے

کے بعد ایک بار پھر سے انسان اپنی خصوصیات کو کھو کر مٹی اور روح میں تبدیل ہو جاتا ہے۔''

اور ان کی خصوصیات مختلف ہیں تو جب انسان یا کسی اور چیز کا وجود اس دنیا میں آنے اور جانے کے بعد ایک ہی خصوصیات کا ایک ہی وقت میں حامل نہیں ہو سکتا اور ایک وقت میں دو طرح کے وجود ظاہر نہیں کر سکتا تو پھر ''شراکت'' کا تصور تو ختم ہو جاتا ہے۔

جیسا کہ سورۂ اخلاص میں ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

''کہو کہ اللہ ایک ہے۔'' (اخلاص:1)

اگر اللہ کو اس کی وحدانیت کے آئینہ میں دیکھا جائے تو جو چیز ظاہر ہو گی وہ فقط یہ کہ وہ ذات واحد ہے کہ جس پر کائنات کا کوئی قانون لاگو نہیں۔ اس لفظ قانون کی حقیقت اس ذات باری تعالیٰ کی عطا کی ہوئی ہے۔

یحییٰ معاذ الرازی رحمتہ اللہ علیہ اس ذات گرامی کا دنیاوی قانون سے موازنہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں

''الٰہی جیسا تو کسی کی مانند نہیں تیرے کام کسی کی طرح نہیں۔ اگر کوئی شخص کسی کو دوست جانے تو وہ بہر حال اس کی راحت چاہتا ہے۔ لیکن تو اپنے دوستوں کو بلاؤں میں ڈالتا ہے۔''

اہل ذوق اور اہل نظر کے لئے یہاں ایک نقطہ بیان کرنے کی جسارت چاہوں گا۔ کوئی صوفی یا اللہ کا بندہ جب اپنے رب کو تلاش کرتا ہے تو ایک مقام ایسا آتا ہے کہ جب بندے کی حقیقت اپنے رب کی مطلقیت میں گم ہو جاتی ہے اور اس کی کیفیت میں بندہ ''فناء'' کی حالت میں آ جاتا ہے اور جب اللہ کی مطلقیت اپنے بندے کی حقیقت میں گم ہو جاتی ہے تو اس کے لئے ضروری ہے کہ اس کی ''بقاء'' ہو۔ اس لئے اس ''عروج'' کی حالت میں بندہ اپنی ذات کو ''حق'' میں گم پاتا ہے جس کی بہترین مثال ہمیں منصور رحمتہ اللہ علیہ کے تصور ''انا الحق'' سے ملتی ہے۔ اب اگر میں یہاں پر کہوں کہ جب ایک بلبلے کی اپنی حقیقت

سمندر کی وسعت حاصل کرتی ہے یا اس میں کھو جاتی ہے تو بلبلا پھر بلبلا نہیں رہتا اور اگر وسعت سمندر، بلبلے کی حقیقت بن جائے تو بلبلہ خود اپنی ذات میں اپنے آپ کو سمندر تصور کرتا ہے اور اپنی شناخت تلاش کرتا ہے۔ اس طرح ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اللہ کا بزرگ بندہ حقیقت اور وجود کی ایک حد کے اندر رہتا ہے۔ جب وہ اپنے آپ کو مٹا لیتا ہے تو اس کی حقیقت لامحدود ہو جاتی ہے اور اسے ''فنا'' کہتے ہیں اور جب خدا کی مطلقیت اپنے بزرگ بندے کی حقیقت کی حدود میں آجاتی ہے تو اس کی حقیقت محدود ہو جاتی ہے۔

خواجہ خاں نے اپنی ایک تصنیف میں مسلمان کی حقیقت کو اس طرح سے بیان کیا ہے۔

"You grew beard and become an infidel An Infidel without beard is a Musalman"

اس حقیقت کو حدیث مصطفیٰ ﷺ بھی کچھ اس انداز سے واضح کرتی ہے۔

''ہر زندہ چیز فطرتاً مسلمان ہی پیدا ہوتی ہے ایک بچہ بھی مسلمان پیدا ہوتا ہے لیکن جیسے وہ بڑھتا ہے اپنے ماحول اور کردار کی بناء پر بھٹک جاتا ہے۔''

اللہ رب العزت کی صفات اور حقیقت اس کے دو پہلوؤں میں تقسیم ہے۔ ایک وہ کہ جس کو ہم اس کی جمالی تصویر کہتے ہیں اور ایک وہ کہ جس کو اس کی جلالی تصویر کہتے ہیں۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو جو حکم ہوا وہ یہ تھا کہ وہ اہل ایمان کے سامنے خدا کی جمالی تصویر کو زیادہ واضح کریں اور ان کو ایک مکمل تحفظ کی یقین دہانی کروائیں۔ جب خدائے رب العزت نے انسان کو مکمل تحفظ کی یقین دہانی کروائی ہے تو انسان کا یہ کہنا کہ شیطان اس کو برائی کے راستے کی جانب رغبت دلاتا ہے۔ تو اس کے اس بہانے کی کوئی حقیقت نہیں رہتی بلکہ اگر وہ برائی کی طرف بھٹک جاتا ہے تو قصور صرف انسان کا ہی لکھا جائے گا۔ کیونکہ شیطان کے مقصد کو واضح کر دیا گیا ہے۔ اس کا امتحان اس وقت ہوگا کہ جب روز محشر کو خدا کے سامنے اپنی جیت یا ہار کو پیش کریگا۔ اس لئے یہ صرف انسان پر منحصر ہے کہ وہ اپنے آپ کو خدا کے تحفظ کی یقین دہانی کرائے۔ جس کے بعد وہ اپنے آپ کو شیطان سے باز رکھ سکے۔

خدائے رب العزت کی ذات کا ہم اس طرح سے بھی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اگر اندھیرے کا تصور کر لیا جائے تو اس اندھیرے میں بھی اس کی ذات کی روشنی موجود ہے کیونکہ اس اندھیرے سے ہی آب حیات نصیب ہوتا ہے۔ اللہ کی تمام بنائی ہوئی مخلوقات کا اگر بغور جائزہ لیا جائے تو سبھی کی ابتداء اندھیرے سے ہوتی ہے اور اندھیرے میں ہی ہر چیز زندگی پاتی ہے۔ یہ آپ کا اپنا انداز فکر ہے کہ آپ اس اندھیرے کی خاصیت کو کس طرح جانتے ہیں۔ اس کو زندگی کی علامت سمجھ کر ذات باری تعالیٰ کو پاتے ہیں یا اس اندھیرے کو اندھیرا جان کر اس کی اہمیت کا انکار کرتے ہیں اس کی مثال اس طرح ہے کہ اگر میں دوران خوش خطی قلم سے نکلنے والی سیاہی کی طرف دیکھتا ہوں تو لکھے جانے والے الفاظ میری نگاہوں سے اوجھل ہو جائیں گے۔ لیکن اگر الفاظ کو دیکھتا ہوں تو سیاہی سے توجہ ہٹ جائے گی۔ یہ مجھ پر منحصر ہے کہ میں کس چیز کا اندازہ لگانا چاہتا ہوں۔ ہر چھوٹی سے چھوٹی تخلیق میں بھی ایک حکمت پوشیدہ ہے جو اس باری تعالیٰ کی حقیت کی گواہی دیتی ہے۔ اگر آپ یہ چاہیں کہ اس ذات باری تعالیٰ کا ظاہر کیسا ہے؟ اور کہاں ہے؟ تو انسان کی شکل کا بغور مطالعہ کیجئے آپ کو اس میں خدا کا صفاتی چہرہ صاف نظر آئے گا۔ بالکل صاف۔ اس انسان کی مسکراہٹوں میں۔ آپ یہ سوچتے ہوں گے کہ ہم نے یہ تو سنا ہے کہ خدا کی حقیقت ''غائب'' کی حالت میں پوشیدہ رہتی ہے پھر ہم اس کو کس طرح جان سکتے ہیں کہ آخر کون ہمارا خالق و مالک ہے؟ اس کا جواب صرف اتنا ہے کہ اس ذات نے اپنے آپ کو اپنی ''صفات'' کے ذریعے ظاہر کیا ہے۔ جیسا کہ اگر میں کہوں کہ اس کی موجودگی کے احساس کا ہی یہ اثر ہے کہ ہم میں زندگی کی خاصیت ہے۔ اس کی عقل کا احساس زندہ ہوتا ہے اس امر سے کہ ہم میں سوچنے سمجھنے کی خاصیت موجود ہے۔ اسی طرح ہم اپنی باقی کی سات خاصیتوں سے اس کی صفات کا اور حقیقت کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ ہم یہاں پر آ کر اکثر دھوکا کھا جاتے ہیں حالانکہ یہ معمولی لیکن غور طلب بات ہے کہ اچھائی اور برائی کا وجود اس کی اپنی حقیقت سے منسلک ہے۔ ایسا نہیں ہے بلکہ یہ اس کی صفات سے اثر لیتی ہیں۔ ان صفات کا اثر یہ چاہتا ہے کہ وہ

اپنے آپ کو ظاہر کریں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان کو اس کائنات کی فطرت میں موتیوں کی طرح پرو دیا ہے۔ مثال کے طور پر اس کی موجودگی کے آثار نے اپنے آپ کو اس طرح سے شکل دی ہے کہ وہ زندگی کا احساس بنے اس کی قدرت اور مرضی کے احساس نے خواہش کا روپ دھار لیا ہے۔ اس کی طاقت نے توانائی کا اور اس طرح بے شمار ہی صفات ہیں۔ آپ اس دنیا میں جہاں بھی زندگی پائیں گے وہ اس کے علم کا نتیجہ ہے، اس کی مرضی نے انسانی سوچ کا روپ دھار لیا ہے، اس کی طاقت کو انسانی دماغ میں پوشیدہ کر دیا، اس کی سماعت نے انسانی کان کا روپ دھار لیا، اس کی نظر نے انسانی آنکھ کا، اس کی قوت گویائی نے زبان کا اور ہر ایک چیز نے اس کی صفات کا روپ دھارا ہوا ہے۔ تمام کا تمام نظام شمسی انہی صفات سے اثر لے کر اپنے آپ کو ثابت کرتا ہے اور جس طرح یہ روپ بدلتے ہیں اور ان میں فرق پڑتا ہے اسی مناسبت سے اس کی صفات بھی بدلتی جاتی ہیں۔ اس لئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس کا علم اور اختیار دنیا میں جو شکل اختیار کرتا ہے اس کو ''وحدت'' کہتے ہیں۔

اس پروردگار کی ''اصل'' کیا ہے اور اس کا تصور ''عیاں'' کیا ہے، یہ دونوں ''غائب'' میں پوشیدہ ہیں جو کچھ ہم کو نظر آتا ہے وہ حقیقت مطلق کی عیاں صورت ہے لیکن رسائی کی اصل کوئی نہیں جان سکتا۔ ''حقیقت مطلق'' اور ''عیاں'' دونوں پوشیدہ حالتیں ہیں جو کچھ ہمیں نظر آتا ہے اس کو فقط ہم اس کی شبیہ کہہ سکتے ہیں۔ سالک نہ تو اس کا وجود دیکھ سکتا ہے اور نہ ہی عیاں۔ لیکن وہ صرف ان کے اثرات دیکھ سکتا ہے۔ جس مقام پر بندہ اپنے رب سے لاتعلق ہو جاتا ہے یہ وہ مقام ہوتا ہے کہ جہاں اس کو اپنی حقیقت سے بھی لاتعلق ہونا پڑتا ہے۔ یہ مقام ''غائب مطلق'' کا مقام ہوتا ہے کہ جہاں بندہ اپنی حقیقت کو بھی نہیں پہنچان سکتا اور یہ کیفیت ایک تابع نفس کی ہے۔ محبت میں ہی کسی چیز کی حقیقت کا راز پوشیدہ ہوتا ہے۔ محبت کی اصل روح صحیح معنوں میں حقیقت کو پا لینا ہی ہوتا ہے۔ یہ محبت کسی خاص شخص سے منسوب نہیں ہوتی کہ وہی لوگ اس کو پا سکتے ہیں۔ حتیٰ کہ پیغمبروں اور اولیاء اللہ کے نزدیک بھی اس کا ٹھیک ٹھیک علم نہایت پیچیدہ اور انسان کو Puzzle کر دینے والا ہے۔

کیونکہ اللہ کی حقیقت سے متعلق صحیح علم پانا ایک نہایت مشقت طلب فعل ہے اور جب اس حقیقت سے نزدیک ہوتا ہے تو تبھی محبت کا دعویٰ کرسکتا ہے اور یہی اس کا مقصود ہوتی ہے۔

حضرت جنید بغدادی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

''محبت خدا کی امانت ہے۔ جو محبت کسی عوض پر ہو وہ زائل ہو جاتی ہے اُس وقت کہ جب عوض اٹھ جائے۔''

اس لئے وہی محبت پائیدار ہے جو صرف خدا کی خاطر ہو۔ یہ محبت نہ تو علم کی گہرائی سے حاصل کی جاسکتی ہے اور نہ ہی کسی خاص نسبت سے حاصل ہوسکتی ہے۔ اولیاء کرام اس سلسلے میں راستے پر راہنمائی ضروری فرماسکتے ہیں۔ لیکن اس راستے پر آنے کے بعد باقی کی جستجو انسان کی اپنی ہے کہ وہ کس حد تک اس کی ذات سے قریب ہوسکتا ہے۔ اس محبت کی وجہ آپ دنیاوی نقطہ نظر سے بیان نہیں کرسکتے کیونکہ آپ اس ذات کی خوبصورتی کو کوئی شکل نہیں دے سکتے۔ دنیا کے جتنے بھی عالم، فاضل اور محبت کرنے والے ہیں وہ اپنی فصاحت علم اور محبت کی بناء پر اس سے جو بھی اخذ کرسکتے ہیں وہ صرف ایک شبیہ ہی ہے اس سے زیادہ اور کچھ نہیں۔ جو اس ذات کی اصل حقیقت ہے وہ کچھ اور ہی ہے اور اس کو ان تصورات میں کوئی بھی نہیں لاسکتا یا یوں کہہ لیجئے کہ جو شخص سورج کے عکس کو پانی میں دیکھتا ہے وہ یہ نہیں کہہ سکتا کہ اس نے حقیقت میں سورج کو دیکھا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد پاک ہے۔

''میں اس (اللہ) کو اس حد تک نہیں جان سکا کہ جتنا میں نے اس کو جاننے کی کوشش کی۔''

یہی وجہ ہے کہ خدائے رب العزت خود بھی فرماتا ہے۔

''اس کی حقیقت کا علم صرف اسی کے سوا اور کسی کو نہیں ہے۔''

وہ مقام کہ جہاں پر اصل حقیقت بھی اپنے آپ کو اپنے اوپر ظاہر نہیں کرسکتی، اس کو ''غائب الغائب'' کہتے ہیں۔ وہ مقام کہ جہاں یہ حقیقت اپنے آپ کو ظاہر ہوتی ہے اس کو

''احدیت'' کہتے ہیں اور یہ پہلی حد ہے۔ اس کی سب سے بڑی مثال حقیقت محمد الرسول صلی اللہ علیہ وسلم ہیں کہ انہوں نے آ کر ہمیں اللہ کی وحدانیت کا یقین دلایا۔ دوسرا مقام کہ جہاں پر یہ حقیقت اپنے اوپر بھی ظاہر ہے اور دوسروں پر بھی اپنی صفات سے ظاہر ہے۔ اس کو ہم دوسری حد کہہ سکتے ہیں اور یہ وہ ہے کہ جہاں پر یہ دوسروں پر حقیقت انسانی کی صورت میں ظاہر ہے اور حقیقت انسانی کی حقیقت روح سے ہے۔ وہ مقامات کہ جہاں پر یہ حقیقت تفصیل سے دوسروں پر صفاتی لحاظ سے ظاہر ہوتی ہے ان میں عالم ارواح، عالم میثال اور عالم اجسام شامل ہیں اور یہ تمام مل کر جو شکل اختیار کرتے ہیں اس کو ''تخلیق'' کہتے ہیں۔

جب ''ذات'' کی اصل اپنے آپ سے ہی تھی تو اس وقت اس کی حقیقت اپنے آپ سے ہی موجود تھی (یاد رہے کہ ذات اور حقیقت میں نمایاں فرق ہے) اور وہ اپنے آپ کو خود ہی محسوس کر سکتی تھی اس میں کسی قسم کی کمی نہیں تھی۔ اس وقت عقل اور علم کے مقابلے میں کوئی ایسی چیز نہ تھی کہ جس کو ہم جہالت کا نام دے سکتے ہیں۔ اس وقت جو احساس تھا وہ صرف اس میں ذات کا تھا اور اس احساس میں سوائے اس کے کوئی شریک نہ تھا اور وہ ہمیشہ کے لئے تھا۔ اس کی اپنی ذات میں کسی قسم کا شک ناممکن چیز تھی اور ہے۔ اس کی خالصیت کا عنصر نہ تھا بلکہ وہ خود ہی خالص تھی۔ اگر کسی چیز میں شک کیا جا سکتا ہے تو وہ ان اشکال کے ساتھ وابستہ ہے کہ جن کو اس نے خود ہی شک کے ساتھ تخلیق کیا اور پھر دعوت حق دی کہ میری تخلیق میں کوئی شک نہیں ہے کیونکہ یہ شکوک میں نے خود ہی پیدا کئے ہیں تا کہ تم ان کو تلاش کر سکو۔

عارضی پن اور تبدیلی اس کی ذات سے نہیں بلکہ اشکال سے متعلق ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب اولیاء کرام ''ھوٗ'' کا نعرہ جذب کی کیفیت میں بلند کرتے ہیں تو اس ''ھوٗ'' سے مراد وہ ذات گرامی ہوتی ہے۔ اور جب انسان مکمل طور پر اپنی نفسیات پر حاوی ہو جاتا ہے تو جو چیز مٹ جاتی ہے وہ نفس ہوتا ہے کہ جس میں کوئی شک ہو سکتا ہے لیکن جو چیز بچ جاتی ہے وہ روح ہے جو بغیر کسی شک کے ہے اور انسان اس ذات باری تعالیٰ کی حقیقت سے قریب تر ہو جاتا ہے۔ چونکہ اس روح کی حقیقت اللہ کی مطلقیت سے ہوتی ہے (مطلقیت، حقیقت سے

قریب ترین ہوتی ہے)۔ اور انگریزی کے مصنف اس کو Holy Breath کے نام سے منسوب کرتے ہیں۔ اس لئے ''ھو'' یعنی ''وہ'' کی حقیقت ''میں'' سے تبدیل ہو جاتی ہے۔ یعنی اس کی جستجو ایسے مقام پر پہنچا دیتی ہے کہ جہاں پر اللہ کی مطلقیت اپنے اندر نظر آتی ہے اور سالک کی اپنی ذات مٹ جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب منصور رحمتہ اللہ علیہ نے ''انا الحق'' کا نعرہ بلند کیا تو ان پر شرک کا فتویٰ لگا کر سولی پر لٹکا دیا گیا۔ لیکن جب ان کے خون کے قطرے زمین پر گرتے تو اس ہر ایک قطرے سے ''انا الحق'' کی صدا بلند ہوتی۔ حقیقت باری تعالیٰ بغیر کسی شک کے ہے۔ یہ کسی خاص شکل تک محدود نہیں ہے کیونکہ اس کی کوئی شکل ہی نہیں ہے اور اگر اس کی کوئی شکل موجود ہے تو وہ شکل بھی بغیر کسی شک کے ہے اس کی اصلیت محدود نہیں بلکہ لامحدود ہے اور اس لامحدود پر تمام محدود شکلیں انحصار کرتی ہیں۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

''رحمٰن نے تعلیم قرآن دی اور انسان کو پیدا کیا''۔ (رحمٰن: 1)

تو معلوم کیا ہوا کہ اس نے انسان کو رحمٰن کے آئینے میں تخلیق کیا۔

لکڑی کی ایک اپنی پہچان اور ہیت ہوتی ہے لیکن پھر یہ کئی اشکال کی ترتیب کا باعث بنتی ہے اور یہ اشکال اس بات سے بے پرواہ ہوتی ہے کہ لکڑی کی اپنی اصل شکل کیا تھی۔ اس کو جو ترتیب دے دی گئی وہ اسی شکل کو اختیار کر لیتی ہے۔ لیکن لکڑی کی جو خصوصیات ہوتی ہے وہ اشکال بدلنے کے بعد بھی وہی رہتی ہیں۔ اسی طرح وہ ذات باری تعالیٰ جب چاہے اپنے آپ کو مختلف اشکال میں ظاہر کر سکتا ہے۔ لیکن اس کی اصل خاصیت اور حقیقت وہی رہتی ہے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

''میں نے اپنے رب کو ایک بچے کی شکل میں دیکھا ہے۔''

یہ تمام شبہات ہوتی ہیں اور اگر یہ نہ ہوں تو لوگ سیدھی راہ سے بھٹک جائیں لیکن اس کے باوجود یہ تمام صورتیں ذات باری تعالیٰ کی اصل حقیقت کی جگہ نہیں لے سکتیں۔ یہ

نشانات تو اس نے صرف ہماری رہنمائی کے لئے پوشیدہ کر رکھے ہیں کہ ہم ان کو ڈھونڈ کر راہ ہدایت پر گامزن رہیں۔ عام لوگ کہتے ہیں کہ خدا کہیں نظر نہیں آتا۔ تو مولانا روم رحمتہ اللہ علیہ اس کو واضح کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ

''خدا اس طرح کیوں نظر آنے والی ہستی نہیں جس طرح کہ اور اشیاء یا ہستیاں نظر آتی ہیں۔ اس قسم کی دید کے لئے تو ''لن ترانی'' ہر کس و ناکس بلکہ ہر نبی و ولی کے لئے معقول جواب ہے لیکن دید دو قسم کی ہے ایک چشم بصارت سے اور دوسری وجدان اور چشم بصیرت سے حاصل دیدی یہی دوسری قسم کی دید ہے اور اس کا امکان ہر مومن کے لئے ہر وقت موجود ہے۔ وہ مومن جس کی نسبت کو ''ھو ینظر بنور اللّٰہ'' کہا گیا ہے۔ حضرت مولانا وم رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جن لوگوں کو یہ شکایت ہے کہ خدا نظر نہیں آتا یہ ان کا اپنا قصور ہے صد جلوہ روبرو ہے جو مژگان اٹھائیے۔ کسی حکیم صوفی کا قول ہے کہ ''الحق محسوس والخلق معقول'' خدا تو براہ راست چشم بصیرت کو محسوس ہوتا ہے البتہ خلق یا ماسوا کے وجود ہونا دلائل عقلی کا نتیجہ ہے۔ حضرت مولانا روم رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جہاں جو ظاہر و باہر ہے وہ آنکھوں پر انگلیاں رکھ لینے سے غائب ہو جاتا ہے لیکن معدود تو نہیں ہوتا۔ لوگوں نے اپنی چشم بصیرت کے آگے پردے ڈال رکھے ہیں۔ ''علی ابصار ھم غشاوۃ'' اور پھر کہتے ہیں کہ خدا نظر نہیں آتا۔ ''انشراح صدر'' کے بعد تو پھر ذرے میں بھی آفتاب نظر آنے لگتا ہے۔ زندگی کا اصل مقصد تو دید دوست ہے۔ اگر یہ دید دوست لایزال نہیں تو اس کی دوستی اور دیدار سے کیا حاصل۔''

وجود باری تعالیٰ کی حقیقت کو اس طرح واضح کیا جا سکتا کہ کسی شے کے ''وجود'' کا خیال اس شے کے خیال سے پہلے کا ہوتا ہے۔ اگر شے کا وجود ہی نہیں ہے تو پھر پیچھے کچھ بھی نہیں بچتا۔ اس لئے کسی چیز کی غیر موجودگی اس چیز کے وجود سے پہلے نہیں ہو سکتی اور یہ پہلا اصول

ہے کہ جس کو "ما کل اول" کہا جاتا ہے۔ اگر آپ یہ کہیں کہ زاہد کھڑا ہے تو زاہد کی اپنی حیثیت اور شخصیت اس کے کھڑے ہونے سے پہلے کی ہے۔ اس لئے خدا کے وجود کو ماننے کا مطلب ہے کہ اس ذات پاک کی تمام صفات اس کی اپنی حقیقت کے اقرار کے بعد آتی ہیں۔ تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس کے وجود کا احساس ہی دراصل اس کی حقیقت کا احساس ہے (یہی وجہ ہے کہ اللہ نے اپنی مطلقیت کو مخلوق کے لئے پہلے رکھا اور پھر حقیقت سے شناسائی بعد میں رکھی)۔ بعض فلسفیوں کا کہنا ہے کہ کسی چیز کی حقیقت اس کے وجود سے پہلے ہوتی ہے لیکن یہ ان کا نظریہ ہے اور اس پر بحث ہمارا موضوع نہیں ہے۔

اس کل کائنات میں جو ذات سب سے زیادہ عیاں اور ظاہر ہے وہ اللہ بزرگ و برتر کی ذات ہے۔ کائنات کی تمام اشیاء کا وجود اس کے نور سے ہے۔ جب آپ کسی چیز کا بغور تجزیہ کرتے ہیں تو اس کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ آپ پہلے نور خدا کو اپنے تصور میں لائیں۔ مثال کے طور پر اگر آپ چینی یا گوند کو کسی سانچے کی مدد سے کسی شکل میں ڈھالنا چاہیں تو جس چیز کے تجزیے پر آپ سب سے پہلے توجہ کریں گے وہ چینی اور گوند ہی ہوگی پھر آپ ان سانچوں کے بارے میں سوچیں گے کہ جن میں بننے والی اشکال صرف آپ کی خیالاتی کاوش ہے۔ حقیقت میں ان اشکال کا کوئی اپنا وجود نہ ہوگا۔ یہ صرف آپ کے اپنے تخیل میں بستی ہیں اور ان کی اصل حقیقت چینی اور گوند ہی ہوگی۔ چینی اور گوند کی کوئی اپنی شکل نہیں ہوتی بلکہ یہ مختلف اشکال کا باعث بنتی ہیں اگر آپ ان سانچوں میں ڈھلی اشکال کو توڑ دیں تو پیچھے کچھ بھی ایسا نہیں رہیگا کہ جو ختم نہ ہو گیا ہو۔ اس لئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ اشکال چینی اور گوند کے ساتھ نہ تو منسلک ہیں اور نہ ہی ان سے جدا ہیں۔ یہ صورتیں اور اشکال بے معنی ہوتی ہیں اصل ظاہری حالت تو چینی اور گوند کی ہی ہوتی ہے۔ اس نظریئے پر قائم رہتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ اللہ رب العزت کا وجود اور اس کی صفات ہی اصل میں تمام حقیقتوں میں ظاہر ہیں۔ اگر آپ اپنے آپ اور گردونوح کی اشیاء کا جائزہ لیں تو ہر طرف آپ کو اللہ ہی اللہ نظر آئے گا۔ اگر آپ اس وقت میرے قلم سے لکھے گئے الفاظ کا بغور

جائزہ کریں تو ان کے پیچھے جو چیز کارفرما ہوگی اس کی حقیقت سیاہی ہے۔ اپنے آپ کا تجزیہ اور تصور کرنا ہی دراصل اللہ کا تصور کرنا ہے۔

فرمان رسول اللہ ﷺ ہے۔

''خدا کے وجود کا تصور، انسانی نفس کے تصور سے پہلے ہے''۔

سورۂ شمس میں ارشاد ہوتا ہے۔

''بیشک مراد کو پہنچا جس نے نفس کو ستھرا کیا اور نامراد ہوا جس نے اسے معصیت میں چھپایا''۔ (شمس:9-10)

اپنے نفس کو پانے کے لئے صرف اپنے نفس کا تصور اور تجزیہ کرنا ہوتا ہے جو کہ انسانی ذہن کا ایک تاریک گوشہ ہے لیکن حق کے تصور کو پانے کے لئے اس کے وجود کے تصور کو پانا ضروری ہے جو کہ انسان کو اپنے وجود کے تجزیئے سے ہی حاصل ہوسکتا ہے۔ فارسی زبان میں حقیقت محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے جو لفظ استعمال ہوتا ہے، وہ ''سر'' ہے اور اگر اس حقیقت سے اوپر جانے کی کوشش کریں تو لامحدودیت شروع ہو جاتی ہے۔ اس لئے حقیقت محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد جو لفظ استعمال ہوا ہے، وہ ''میں'' ہے اور یہ اس کے لامحدود ہونے کی طرف اشارہ ہے۔

اگر یہ کہا جائے کہ اس ذات باری تعالیٰ کی لامحدودیت کو اپنے لامحدود ہونے کے بارے میں علم ہے تو پھر وہ حقیقت کہ جس کا اندازہ لگ گیا کہ وہ لامحدود ہے تو وہ اپنے ہی فصاحت علم کی بناء پر محدود ہوگئی۔ اگر اس کو اس کا علم ہے کہ اس کا ''علم'' بھی لامحدود ہے تو پھر وہ علم تو خالص نہ رہا کیونکہ اس میں شک آ گیا۔ تو پھر میں یہ سوال کروں گا کہ اگر اس کا ''جاننا'' لامحدود ہے تو پھر علم اس کی گہرائی کو کس طرح ناپ سکتا ہے۔ خواہ اس ذات کا اپنا ہی علم ہو اور اگر اس نے جان لیا تو پھر اس کا ''جاننا'' لامحدود نہ رہا بلکہ محدود ہو گیا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اس مقام پر اس کی حقیقت بغیر کسی شک کے خالص ہے اور وہ بلاشک خالص علم رکھتی ہے۔ اس میں اس حقیقت کا جو ''تعلق'' اس کے علم سے ہے وہ بھی خالص

ہے اور اس کا اپنے آپ کے بارے میں ''جاننا'' بھی خالص ہے۔ قانون محدودیت اور لامحدودیت، یہ صرف ان چیزوں پر لاگو ہوتی ہے جو اس کی ذات کے علاوہ ہیں یا یوں کہہ لیجئے کہ جس مقام پر آ کر اس کی خالص حقیقت اپنے خالص علم کی بناء پر محدود ہو جاتی ہے اس کو ''مجہولت'' کہتے ہیں۔ یہی ''جو نہ جانا گیا ہے اور نہ ہی کوئی جان سکتا ہے۔'' اس مقام پر جاننے کے لئے اور جاننے والے کے لئے کوئی گنجائش نہیں ہے۔ جب ہم اس مقام سے نیچے آتے ہیں تو ''جاننے'' کی ایک شکل ہم پر ظاہر ہوتی ہے جو کہ پہلی حد ہے۔ اس لئے ''خالصیت'' کے اس مقام پر علم اور دوسری تمام خاصیتیں اس ذات باری تعالیٰ کی حقیقت میں گم ہو جاتی ہیں اور یہ حقیقت علم کی بناء پر کبھی بھی محدود نہیں ہو سکتی۔ اس مقام پر باطن کا تعلق صرف اسی کی ذات سے ہے۔

اب جب ہم یہاں پہنچ گئے ہیں تو ''ظاہر'' یعنی باہر کی حقیقت اور ''باطن'' یعنی اندر کی حقیقت ان دونوں کو بھی واضح کر دینا ضروری سمجھوں گا۔ اگر میں ظاہر کو محدود کہوں اور باطن کو خالص تو بلاشبہ کچھ غلط نہ ہو گا۔ ان دونوں نظریات کا علیحدہ علیحدہ آپ کے ذہنوں میں واضح ہونا بہت ضروری ہے اور ان دونوں کو آپس میں الجھانا ٹھیک نہیں ہو گا۔ جو محدود ہوتا ہے اس کو اپنی محدودیت کا علم ہوتا ہے اور جو لامحدود ہے اس کو اپنی لامحدودیت کا علم ہوتا ہے۔ سمندر میں جاتے ہوئے قطرے کے اپنے قطرے ہونے کا احساس بھی ہوتا ہے اور سمندر کی وسعت کا بھی۔ ایک قسم کا علم دوسری قسم کے مخالف نہیں ہوتا اور نہ ہی اس میں پیچیدگیاں پیدا کرتا ہے۔ یہ ایک طرف تو اپنی مختصر سی مکمل حقیقت سے باخبر ہوتا ہے تو دوسری طرف اس کو اپنے محدود ہونے کی محدودیت کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ جب حقیقت اور علم ایک ہو جاتے ہیں یعنی دونوں ایک دوسرے کے بارے میں شکوک نہیں رکھتے۔ اس صورت حال میں نہ تو کوئی ان کا گھیراؤ کرنے والا ہوتا ہے اور نہ ہی کوئی گھیراؤ ہوتا ہے۔ سوائے اس ذات باری تعالیٰ کے۔ اس صورت حال پر آ کر حقیقت اور صفت ایک ہو جاتے ہیں۔

کسی شے کی اصلیت اس کی خاصیتوں سے جدا اور آزاد ہوتی ہے اور اس کی اصلیت کو

بیان میں نہیں لایا جا سکتا۔ آپ ''درد'' ہی کی مثال لے لیجئے کہ وہ کیا ہے اور اس کی تعریف کرنے کی کوشش کیجئے لیکن میں یہ یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ آپ ایسا نہیں کر سکیں گے کوئی بھی اس کو الفاظ میں بیان نہیں کر سکتا اور نہ ہی اس کی اصل حقیقت کا احساس دوسرے کو دلا سکتا ہے۔ لیکن اس کو صرف وہی شخص ''محسوس'' کر سکتا ہے کہ جس کو وہ درد رہی ہو۔ اور وہ اس کو صرف اس وقت تک جان سکتا ہے کہ جب تک درد محدود ہے اگر درد اپنی حد کو پار کر جائے تو انسان موت کی آغوش میں چلا جاتا ہے اور اس طرح یہ درد لامحدود ہو جاتا ہے اور انسان کی عقل اس کے اسباب اور کشف کے آئینے سے باہر ہو جاتی ہے۔

درد تو چلو ایک کیفیت کا نام ہے۔ لیکن اگر آپ مٹی کے ایک چھوٹے سے چھوٹے خوردبینی دانے کو ہی لے لیں تو تب بھی اس کی اصلیت کی حقیقت کو بیان نہیں کر پائیں گے۔ جو کچھ انسان ان کے بارے میں بیان کرتا ہے وہ صرف اس بناء پر کرتا ہے کہ وہ اس کی مختلف خاصیتوں کو محسوس کرتا ہے لیکن اس کی اصل کی حد کیا ہے یہ کوئی بھی بیان نہیں کر سکتا کیونکہ اس دنیا کی ہر شے کے علم کی ایک حد ہے اور اس کے آگے وہ علم لامحدود ہو جاتا ہے جو کہ صرف اس ذات باری تعالیٰ کے اختیار میں ہے اور انسان کا علم تو کشف کے آئینے سے باہر ہے۔ اگر ان تمام اشیاء سے ان کی خاصیتوں کو چھین لیا جائے تو اس کی حقیقت کیا ہوگی یہ نہ تو کوئی جانتا ہے اور نہ جان سکتا ہے سوائے اس ذات باری تعالیٰ کے۔ انسان کو جس چیز کا علم ہے وہ صرف ان کی خاصیتیں ہی ہیں۔ اگر میں یہ کہوں کہ میں ''مرتضیٰ'' ہوں اور مجھ سے میری عقل، طاقت، بینائی، سماعت اور گویائی وغیرہ چھین لی جائیں تو میں آپ کو کیا بتاؤں گا کہ میں کیا ہوں اور اگر میں ایک لمبے عرصے کیلئے اپنی حقیقت کی تلاش میں لگا رہوں تو میں اپنا ذہنی توازن کھو دوں گا۔ اگر اس تلاش کے دوران کوئی چیز میری سمجھ میں آئے گی تو وہ صرف یہ کہ میں کچھ نہیں سمجھ سکا۔ اس لئے ماننا پڑے گا کہ اس ذات باری تعالیٰ کی اصل حقیقت پوشیدہ رہے گی خواہ کوئی کتنی بھی جستجو کر لے۔

سورۂ آل عمران میں ارشاد ہوتا ہے۔

''اور اللہ تمہیں اپنے عذاب سے ڈراتا ہے۔'' (آل عمران:30)

مگر اس کی تشریح کی جائے تو یہی معلوم ہوگا کہ اللہ انسان کو باخبر کرتا ہے کہ کوئی اس کی اصل حقیقت کو نہ پا سکے گا۔ خواہ وہ کتنی کوشش کر لے لیکن خوف وڈر صرف یہی ہوگا کہ وہ اس کی تلاش میں اپنی زندگی سے ہاتھ نہ دھو بیٹھے۔ علم خود بھی اس ذات کی حقیقت پر حیران ہے کیونکہ علم کی اپنی حقیقت بھی اس کی حقیقت میں کھو جاتی ہے۔ اس لئے جب علم کو اپنا خالص اور لامحدود مقام ملے گا تو اس وقت علم کی حقیقت اس کی اپنی ہی ہوگی اور اگر علم خالص اور لامحدود مقام کو نہیں پاتا تو اس وقت تک علم کو اپنی اصل حقیقت کو پانے میں کچھ فرق رہے گا۔ اس کی وجہ یہ نہیں کہ علم میں نقص ہے اس لئے وہ اپنی حقیقت کو نہیں پا سکتا۔ بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ جو علم اپنی اصل حد تک نہیں پہنچا ہے تو وہ اپنی اصل حقیقت کو کس طرح تلاش کر سکتا ہے؟ اس لئے تلاش کرنا نہ کرنا ایک ہی ہوگا۔ ہم جس علم کی آخری حد تک جا کر اس ذات گرامی کے بارے میں جانتے ہیں وہ تمام کا تمام جہالت اور حیرت کے ہی ضمن میں آتا ہے۔

حضرت ذوالنون مصری رحمتہ اللہ علیہ کہتے ہیں۔

''حقیقت اللہ میں علم حاصل کرنا جہالت ہی ہے۔''

نہ کوئی پیغمبر علیہ السلام اور نہ کوئی ولی آج تک اس کی حقیقت کو جان سکا ہے اور نہ ہی کوئی اس حد تک پہنچ سکتا ہے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد پاک ہے۔

''میں اس ذات کو اس حد تک نہیں جان سکا کہ جتنا میں جاننا چاہتا تھا۔''

اگرچہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم شب معراج اپنے رب سے بنفس نفیس ہم کلام ہوئے اور انہوں نے اس ذات کے نور کو بھی دیکھا لیکن نور تو اس کی مطلقیت کو ظاہر کرتا ہے، اس کی حقیقت کیا ہے یہ کوئی نہیں جان سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مندرجہ بالا حدیث ارشاد فرمائی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جب کوہ طور کی آڑ میں اپنے رب کو دیکھا تو اس وقت بھی اللہ نے اپنے نور کو ایک پردے میں رکھ کر ظاہر کیا تھا۔ اس بناء پر ہم

کہہ سکتے ہیں کہ اس کی حقیقت صرف اس پر عیاں ہے۔ اس حقیقت کو پانے کے لئے یا تو خود ختم ہونا پڑے گا اور یا پھر انسان جن حدوں کا پابند ہوتا ہے اس کو ان سے باہر آنا پڑے گا۔ کیونکہ حقیقت الٰہی کو پانے کے لئے ظاہر کے تمام پردوں کو اس ذات گرامی کی حقیقت میں گم ہونا پڑتا ہے۔ ان ظاہری پردوں کی آخری حدیں رسولوں اور اولیاء کرام پر آ کر ختم ہوتی ہیں۔ جو حد، اللہ کے قریب ترین ہے وہ رسولوں کی ظاہری حالت ہے اور اس کے بعد کی اولیاء کرام سے تعلق رکھتی ہے۔ اس لامحدود کی حقیقت کو پہنچنے کے لئے پہلے تو دوسری ظاہر حالت کو پہلی ظاہر حالت میں جذب ہونا پڑے گا اور اس کے بعد یہ پہلی حالت بھی اپنے آپ میں جذب ہو جائے گی۔ اس طرح سے اس کی صفات کی تجلی اس کی حقیقت سے قریب ہو جاتی ہے اور جو چیز بچتی ہے وہ صرف لامحدود اور خالص ہوتی ہے۔ اس کی ذات کا کسی دوسرے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس کے اپنے ذاتی چیمبر کے دروازے تمام باہر والوں کے لئے بند ہوتے ہیں۔ اس کے دروازے پر وہی دستک دے سکتا ہے کہ جو اپنی ذات کو مٹا کر اس کے نور میں اپنے وجود کو پائے۔ جیسا کہ پیغمبر آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم، ہر ایک چیز کی حقیقت جس کو ہم محسوس کر سکتے ہیں اور جس کو نہیں بھی محسوس کر سکتے ایک خالص اور بلاشک حقیقت کی عامل ہوتی ہے۔ ان چیزوں کی جو ظاہری حالتیں ہم پر ظاہر ہوتی ہیں وہ ان کی اصل حقیقت نہیں ہوتی بلکہ وہ تو ہمارا ان چیزوں کے بارے میں احساس ہوتا ہے۔ ظاہری حالتیں بے شمار ہیں۔ حتیٰ کہ ان کی تعداد لامحدود بھی ہو سکتی ہے لیکن ان سب میں سے جو اصل حقیقت ظاہر ہو گی وہ ایک ہی ہو گی اور اس کو ''اللہ کا یکتا'' ہونا کہتے ہیں کہ جو ہمیں اسلام نے بتایا ہے۔

سورۂ انعام میں آتا ہے۔

''بے شک اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔''

اس کا ہونا اسی طرح ہے کہ جس طرح ہم پانی کے احساس کو لہروں، برف باری، شبنم کے قطروں اور بوندا باندی میں پاتے ہیں۔ ''ھوٗ'' سے مراد اس ذات کی بے داغ حقیقت

ہے یعنی کہ اس کی صفات کو اس حقیقت میں جانے بغیر لفظ اللہ ہی اس کی تمام صفات کے ساتھ اس کی حقیقت کی طرف اشارہ کر دیتا ہے اور "احد" وہ مقام ہوتا ہے کہ جہاں پر تمام اشارے بھی ختم ہو جاتے ہیں۔ یعنی کہ آپ اس ذات کے لئے "یہ" اور "وہ" جیسے الفاظ استعمال نہیں کر سکتے۔ "واحد" وہ مقام ہے کہ جہاں پر شائد ہی اس کے وجود کیلئے کسی تصدیق کی ضرورت باقی رہتی ہو بلکہ وہ بھی نہیں رہتی۔ اللہ تبارک و برتر اپنی جس لامحدودیت اور لامحدود صفات کے ساتھ ہے اس کا تصور اس دنیا میں سرے سے ہی موجود نہیں ہے۔ اس لئے کوئی یہ اندازہ لگا ہی نہیں سکتا۔ وہ محدود صفات کے علاوہ ہے کہ جن کو ہم اس کی ذات سے منسوب کرتے ہیں۔ اسی لئے وہ سورۃ انعام میں "عما یصفون" کے الفاظ استعمال ہوتے ہیں۔

حدیث قدسی ہے۔

"اے میرے رب! تو ہی سب سے پہلا ہے بغیر کسی چیز کے جو تجھ سے پہلے ہے اور تو ہی آخر ہے بغیر کسی کے جو تجھ سے بھی بعد میں ہے۔ تو ہی ظاہر ہے بغیر کسی چیز کے کہ جو تجھ سے بھی اوپر ہے اور تو ہی پوشیدہ ہے بغیر کسی چیز کے جو تجھ سے نیچے ہے۔"

یہاں پر غیر کوئی تصور نہیں ہے۔ غیر کا تصور اس صورت میں ممکن ہے کہ جب اللہ کی حدود مقرر کی جا سکے۔

اسم صرف نام ہی نہیں ہوتا بلکہ یہ اس نام والے کی حقیقت کو صفات کے آئینے میں بیان کرتا ہے۔ اسی طرح لفظ اللہ بھی اسی ذات باری تعالیٰ کی حقیقت کو صفات کے آئینے میں بیان کرتا ہے۔ جہاں تک صرف وجود کا تعلق ہے تو اس حد تک صفت اور حقیقت ایک ہی ہوتے ہیں۔ لیکن جب وجود کے ساتھ علم کا تعلق آ جاتا ہے تو اس وقت صفت اور حقیقت ایک نہیں رہتے۔ آپ پھول کی مثال لے لیجئے۔ جہاں تک پھول کی مختلف اقسام کا تعلق ہے وہ اقسام اپنی جگہ پر ہوں گی لیکن وجود تو ان کا پھول ہی ہے۔ اس وجود میں فرق صرف

اس وقت پڑے گا جب ہم اس کی اقسام کی خوشبو اور تاثیر کو محسوس کریں گے۔اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ حقیقت کی ایک اصلی پہچان ہوتی ہے اور ایک فرضی۔اگر آپ ان دونوں کو علیحدہ علیحدہ کر کے رکھیں گے اور کبھی نہ ملنے دیں گے تو اس کو سمجھنا انسان کی محدود عقل سے باہر ہو جاتا ہے اور ایسا کرنے میں کم علمی اور کم عقلی ہے۔کیونکہ اس طرح انسان بالکل ہی اپنے رب کی حقیقت سے نزدیک نہیں ہوسکتا۔اس کو جاننے کے لئے حقیقی اور فرضی دونوں پہچانوں کا ہونا ضروری ہے۔علم وہ ہوتا ہے کہ جو کسی مخصوص چیز کا مکمل احاطہ کرے اور وہ لامحدود کا احاطہ نہیں کرسکتا۔لیکن خدا کی ذات ایسی خالص اور لامحدود ہے کہ وہ اپنے بارے میں مکمل علم رکھتا ہے۔اس کے باوجود کہ اس کی اپنی ذات لامحدود ہے اور جاننے والا اور جاننے والی چیز وہ خود ہی ہے۔اس کائنات کی حقیقت بھی اس ذات کے یکتا ہونے کا احساس دلاتی ہے۔

ٹھوس کی کسی بھی حالت میں تین اطراف (Three Dimensions) بیان کی جاتی ہیں۔ان میں لمبائی، چوڑائی اور اونچائی شامل ہیں اگر آپ اونچائی نکال دیں تو پیچھے لمبائی اور چوڑائی رہ جاتی ہے جو کہ ایک ہموار سطح کی خصوصیات ہیں۔جیسا کہ سایہ اور ''آئینہ میں عکس'' وغیرہ۔اب اگر اس میں چوڑائی نکال دیں تو پیچھے صرف لمبائی رہ جاتی ہے جیسے کہ کتاب کے ایک ورق کا کنارہ۔اگر آپ اس میں سے لمبائی کو بھی نکال دیں تو ہمیں اس لمبائی کی حقیقت مل جاتی ہے اور اس نازک، پتلی اور چھوٹی سی حالت کو نقطہ یا ایٹم کہتے ہیں کہ جو تمام اجسام کی فی زمانہ معلوم حقیقت ہے۔

جیسا کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم فرماتے ہیں۔

''علم ایک نقطہ ہے اور جاہلین نے اس نقطہ کو پھیلا دیا۔''

اس کو ''معلوم معدوم'' کہتے ہیں یعنی کہ غیر موجودگی کو جاننا۔اس کو آپ اپنے تصورات میں ہی جان سکتے ہیں۔لیکن تصورات سے باہر حقیقت میں یہ غیر موجود ہوتا ہے۔اس نقطے یا ایٹم کے دو پہلو ہوتے ہیں۔ایک وہ کہ جس سے اس کی اپنی ذات کا احساس وابستہ ہے یعنی

کہ اس کے اپنے نزدیک اس کی حقیقت اتنی چھوٹی ہوتی ہے کہ وہ غیر موجود ہی سمجھی جائے۔ اس کو ہم ''ممتنع الوجود'' بھی کہہ سکتے ہیں۔اس کا ایک اور نام بھی ہے'' واجب الوجود'' یعنی کہ ایسی موجودگی کہ اس کا ہونا ایک بہت ہی ضروری امر ہے کیونکہ اس ایٹم کے بغیر یہ دنیا کس طرح بنتی۔ پھر جب کسی شئے کی موجودگی کا احساس پختہ ہو جاتا ہے تو پھر اس کے متعلق کسی ''غیر'' کے بارے میں سوچنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ یہی حقیقت رب العزت کی ہے کہ اس کا وجود ضروری ہے اس لئے اس کا کوئی غیر نہیں ہو سکتا۔ اس ذات کی حقیقت خالص اور آزاد ہے۔ حتیٰ کہ'' الوہیت'' اور'' ربوبیت'' سے بھی یعنی کہ پیدا کرنے اور پیدا کئے جانے سے بھی زیادہ کیونکہ یہ دونوں لفظ اپنی حقیقت کو اس ذات کے اسماء سے پاتے ہیں اور اس ذات کی اپنی حقیقت سے نہیں پاتے۔

جیسا کہ سورۂ اخلاص میں ارشاد ہوتا ہے۔

''اس کا کوئی ہمسر نہیں۔''

اس کے بھی دو پہلو ہیں۔ ایک کو'' تنزیح'' اور دوسرے کو'' تشبیہ'' کہتے ہیں۔ اسمائے سلبی وہ نام ہیں کہ جو دوسرے ناموں پر انحصار نہیں کرتے۔ جیسا کہ'' قوی اور غنی'' وغیرہ۔ اسمائے ثبتی وہ نام ہیں جو دوسرے ناموں پر انحصار کرتے ہیں جیسے کہ'' رازق، خالق اور غفار'' وغیرہ۔ عالم'' برزخ'' بھی اس ذات پاک کی حقیقت کو ہی واضح کرتی ہے۔ برزخ کے لغوی معنی کسی دو چیزوں کے درمیان پردے کے ہیں اور اگر اسی نظریئے پر رہ کر کہا جائے کہ'' وحدت'' برزخ ہے احدیت اور وحدیت کے درمیان تو کچھ غلط نہ ہوگا اور اسی طرح سے'' وحدیت'' بزرخ ہے۔'' ضروری وجود اور امکانی وجود'' کے درمیان ہم بزرخ سے متعلق مزید تفصیل میں نہیں جائیں گے کیونکہ یہ احاطہ موضوع میں نہیں ہے۔ ایک چیز ہوتی ہے'' تعین''، جس سے مراد کسی شے کی مقدار کی اندازاً حد مقرر کرنا ہے۔ یہ حد صرف آپ کے علم میں بھی رہ سکتی ہے یا آپ اس کو ظاہر بھی کر سکتے ہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ اللہ کی ذات بغیر کسی حد کے ہے اور یہ کہ جو کچھ اس کی حد میں ہے وہ تو ظاہر ہے تو پھر اللہ اپنے علم کی بناء پر

محدود ہو جاتا ہے۔ مگر یہ کہنا درست نہیں ہے کیونکہ اس کی خالص حقیقت اس کے قریب دائرہ علم میں ہی رہتی ہے نہ کہ وہ باہر آ کر کائنات کے سامنے اس کو ظاہر کرتا ہے۔ جب یہ حدیں ہی ختم ہو جاتی ہیں تو پیچھے خالص بلاشک اور بغیر اندازے کے جو چیز بچتی ہے وہ اس کی ذات ہے۔

ذات باری تعالیٰ اپنی پہلی حد میں ''میں'' کے روپ میں موجود ہے۔

ایک بزرگ اس حقیقت کو یوں بیان کرتے ہیں۔

''یعنی اگر ذات کی حدیں مقرر کر دی جائیں تو وہ محدود ہو جاتی ہیں اور اگر اس کو ''تو'' کر کے پکارا جائے تو یہ ''میں'' کا روپ اختیار کر لیتی ہے۔''

اور جب یہ مختلف محدود شکلوں اور صورتوں میں ظاہر ہوتی ہے تو یہ ''تو'' کا روپ دھار لیتی ہے اور پھر جب یہ حدوں اور سمجھ سے باہر ہو جاتی ہے تو ''ھو'' کا روپ دھار لیتی ہے۔ اس بارے میں جو لفظ عام طور پر اس کی حقیقت کو بیان کرنے کے لئے لیا جاتا ہے وہ ''اللہ ھو'' ہے اور یہ اس وقت ہوتا ہے کہ جب انسان کو اس ذات کی اصل حقیقت کے لئے کوئی لفظ نہیں ملتا۔ حتیٰ کہ اس میں جو ''ھو'' کا لفظ استعمال کیا گیا ہے وہ بھی صرف اس کی صفات کی جامعیت کو ظاہر کرتا ہے۔ جب اس ذات کی اپنی حقیت کو بیان کرنے کے لئے کوئی علم نہیں ملتا تو اس کو حضرت جنید بغدادی رحمتہ اللہ علیہ ''مجہولنات'' کہتے ہیں۔ اس لئے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ معیار بھی ہے اور معیار کے بغیر بھی۔ معیار کے بغیر اس لئے کہ اس پر یہ دنیا کا معیاری اور غیر معیاری قانون لاگو نہیں ہے۔ وہ ہمیشہ کے لئے ہے اور ہمیشہ رہنے والی صرف معیاری ہی ہوتی ہے۔ اس نظریئے پر رہتے ہوئے وہ موجود بھی ہے اور غیر موجود بھی، وہ یکتا بھی ہے اور لاتعداد بھی۔ اس لئے وہ اپنی ذات میں اپنے حقائق کو بھی چھپائے ہوئے ہے اور ان کی مخالفت کو بھی اور انسان کو یہ دعوت ہے کہ وہ ان میں رہ کر اپنے رب کو تلاش کرے۔ اس لئے تو اس کے ناموں میں ''القابض'' یعنی حقائق دنیا پر قابض، ''الباسط'' یعنی اس دنیا کو پھیلانے والے، ''المعز'' یعنی عزت دینے والا اور ''المذل'' یعنی

ذلت دینے والا وغیرہ شامل ہیں۔ اس کی حقیقت سے انحراف کرنے والے اثرات اس کی یکتائی کی مخالفت نہیں کرتے بلکہ یہ تو اس نے اس لئے پیدا کئے ہیں تا کہ تم کو جستجو کی رغبت دلا سکے۔ یہ تمام اسماء اس کی یکتائی میں جمع ہو کر ایک ہو جاتے ہیں۔ وہی اول ہے اس کائنات کی تمام حقیقتوں میں اور کوئی بھی حقیقت نہیں کہ جس میں وہ بعد میں ہو۔ اس کا اول ہونا ہی اس کا آخر ہونا ہے اور اس کا آخر ہونا ہی اس کا اول ہونا ہے۔ اس کا ظاہر ہی اس کا باطن ہے اور اس کا باطن ہی اس کا ظاہر ہے۔ اس کی تمام صفات اس کی حقیقت کی یکتائی کی وساطت سے ایک دوسرے میں جذب ہیں۔ اگر یکتائی کے برعکس ہم کثرت کا تصور کریں تو یہی صفات ایک دوسرے سے اختلاف کرتی ہوئی نظر آئیں گی۔ یہ اختلاف حقیقت پر مبنی نہیں ہوتے اگر وہ ہوتے تو اس ذات کی حقیقت کو ضرور ادا کرتے مگر ایسا نہیں ہے۔ کیونکہ یہ تمام اختلافات فرضی ہیں اور یہ صرف ظاہری حیثیت ہی رکھتے ہیں۔ اس لئے یہ دنیا بھی صرف ظاہر ہے اور اس کی اپنی حقیقت کچھ بھی نہیں ہے۔ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ اختلافات دراصل ظاہر میں ہیں اور انسان کی حقیقت میں نہیں۔

حضرت امام غزالی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ۔

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تا کہ وہ توحید کا اعلان کر سکیں اور لوگوں کو کفر و شرک سے دور کریں اور لوگوں کے ذہنوں کو توحید کے اختلافات سے پاک کر سکیں۔''

اس لئے ہمیشہ اس چیز کو محسوس کریں کہ یہ تمام صفات اس ذات پاک کی یکتائی میں جذب ہو کر ایک ہو جاتی ہیں اور شرک خفی اور شرک جلی سے ہمیشہ آزاد رہو اور اس کی تمام خصوصیات کے باوجود اس کو ایک ہی جانو۔ ''اسم'' حقیقت کا وصف بیان کرتا ہے اس خاصیت کے ساتھ کہ جو اس کے وجود میں ہے۔ مثلاً ''عالم'' اور یا پھر اس صفت کے ساتھ بیان کرتا ہے کہ جس کے ساتھ وجود کا احساس نہیں ہے۔ جیسا کہ ''قدوس'' یعنی خالص۔ یہ جو اس ذات کی یاد کو تازہ کرنے کے لئے مختلف ''رسوم'' منعقد کی جاتی ہیں یہ اصل میں

ظاہریت کو بیان کرنے کا ایک انداز ہوتا ہے کہ جس میں اس کی لاتعداد صفات کا ذکر کیا جا سکے۔ یہ ذات باری تعالیٰ کا ایک ایسا وصف ہے کہ جو اس کی حقیقت اور ارد گرد کی چیزوں کے اعلیٰ معیار کو بیان کرتا ہے۔ جیسا کہ خالص خود اس کا اپنا وجود ہے۔ خدا تعالیٰ کی اصل اس کے وجود سے ہے کہ جو اس کی خالص حقیقت ہے۔ خالص اور لامحدود وجود کی نہ تو کوئی صورت ہوتی ہے نہ شکل نہ کوئی حد ہوتی ہے اور نہ ہی کوئی آغاز و اختتام۔ اس سب کے باوجود اس نے اپنے آپ کو مختلف اشکال میں ظاہر کیا ہے بغیر اپنی اصل حقیقت کو بدلے۔ اس کی مثال اس طرح ہے کہ ایک شخص مختلف پیمائش اور مختلف بناوٹوں کے شیشوں میں گھرا ہوا ہو تو ہر ایک شیشے میں اس کی ضرورت کے مطابق رنگ اور عکس نمودار ہوں گے لیکن جو شیشے کی اصل حقیقت ہے وہ ایک ہی رہے گی۔

ارشاد ہوتا ہے۔

''اور وہ ایسا ہی ہے کہ جیسا وہ تھا۔''

لفظ ''ھوٗ'' اس چیز کے لئے ہوتا ہے کہ جو پوشیدہ ہو اور اللہ اپنی اصل حقیقت کے اعتبار سے تمام علماء و ماہرین کے علم سے پوشیدہ ہے۔ انسان جو کچھ اپنی جستجو اور عبادت کی بناء پر حاصل کرتا ہے وہ اس کی اصل حقیقت نہیں ہوتی بلکہ اس کی ''تشبیہ'' ہوتی ہے۔ اس کی وضاحت میں پیچھے کر کے آیا ہوں اور تشبیہ کے معنی خدا کا ایک حد میں رہ کر ظاہر ہونا ہے تنزیح سے مراد اس کا خالص پن ہے کہ جس کا اندازہ تشبیہ سے ہوتا ہے۔ اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ تشبیہ میں ہوتا ہے کہ جب وہ تنزیح کے درمیان ہوتا ہے اور وہ تنزیح میں ہی ہوتا ہے جب وہ تشبیہ کے درمیان ہوتا ہے۔ آپ کو جتنی بھی کتب ملیں گے ان میں آپ کو ذات کے لئے یہ دونوں الفاظ ملیں گے یعنی تشبیہ اور تنزیح اور یا پھر ان کا مفہوم ملے گا۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

''اور اس جیسی کوئی شئے نہیں۔'' (شوریٰ:11)

اب جبکہ ہم پر خدائے رب العزت کی لامحدود حقیقت اپنے آپ کو ثابت کر چکی ہے تو

ضروری ہے کہ اس کی اصل حقیت سے ہٹ کر منازل یقین کا باقی سفر اس کی صفات کے آئینے میں کریں اور یہ چند اہم نکات کی صورت میں درج ذیل ہیں۔

اس ضمن میں جو پہلے تین مقام موجود ہیں وہ ایک دوسرے میں ضم ہوتے ہوئے نظر آتے ہیں بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ یہ ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم ہیں۔ سب سے پہلے ''احدیت'' کا مقام ہے کہ جس کی نسبت ''وحدت'' سے ہے اور پھر اس نظریئے پر رہتے ہوئے۔ دوسرا مقام وہ ہے کہ جہاں ''وحدت'' کی نسبت ''واحدیت'' سے ہے اور پھر تیسرے مقام پر ''احدیت'' کی نسبت ''واحدیت'' سے ہے۔ مقام ''واحدیت'' میں اس ذات کے تمام اسماء پوشیدہ ہیں۔ یہ اسماء سب سے پہلے عالم ارواح میں ظاہر ہوتے ہیں پھر عالم مثال میں اور پھر عالم اجسام میں۔ حقیقت محمدی صلی اللہ علیہ وسلم میں یہ تمام اسماء پوشیدہ ہیں اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔

''میں نور الٰہی سے ہوں اور تمام تخلیقات میرے نور سے ہیں۔''

مگر حقیقت محمدیہ واحمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم جو مقامات قرب میں سب سے اعلیٰ مقام اور بہت ہی دور ہے۔ اس مقام کو حاصل کر کے داخل ہونا بہت محال ہے۔ اس مقام میں انبیاء کا ہی جب گزر نہیں تو پھر اولیاء اللہ اور دیگر امتی لوگوں کا کیا ذکر ہے کہ اس جگہ مقام بنا سکیں۔

اس مقام پر بعض لوگ یہ تاویل بھی پیش کرتے ہیں کہ پھر کیا وجہ تھی کہ جب کعبۃ اللہ میں بتوں کو توڑنا مقصود ہوا۔ تو جناب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مولا علی کرم اللہ وجہہ الکریم کا سہارا لیا اور ان کو اپنے کندھوں پر سوار کیا اور یہ صفت کسی اور کے نصیب میں نہ آئی۔ کہ نبوت کو ولائیت کا سہارا لینا پڑا۔ تو اس سے یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ ولایت نبوت سے افضل قرار پاتی ہے۔ حالانکہ ایسا ہرگز نہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا جناب علی رضی اللہ عنہ کو بت شکنی کی خاطر شانوں پر سوار کرنا۔ ایسا ہی ہے کہ جیسے ہمیں کسی سخت چیز کو توڑنے کی خاطر کسی آلے کا استعمال کرنا پڑتا ہے۔ چنانچہ اوزار میں جو بھی حرکت اور قوت پیدا ہوتی ہے تو وہ اسی انسان کے دست و بازو کی درحقیقت مرہون منت ہوتی ہے۔ اسی طرح سے نبوت

نے ولائیت کو اپنا اوزار بنایا اور باطن کعبہ کو بتوں سے پاک کیا۔ چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فعل رہتی دنیا تک امر ہو گیا کہ جب بھی باطن قلب کو نفسانی بتوں سے پاک کرنا مقصود ہو گا تو بطور ہتھیار یا اوزار ولایت ہی کو واسطہ رکھنا ہو گا۔

جہاں تک حقیقت محمد یہ صلی اللہ علیہ وسلم کا سوال ہے تو حضرت بایزید بسطامی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ خدا تعالیٰ کو میں نے پالیا مگر محمد الرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خیمہ تک نہ پہنچ سکا۔ پھر فرمایا میں نے تیس سال تک قلب پر مجاہدہ کیا۔ جب پورے تیس برس گزر چکے تو مجاہدہ سے نکلے۔ آپ نے دیکھا قلب کی اصلاح ویسے تو بہت کچھ ہو گئی ہے مگر ابھی کچھ ریشے سے باقی ہیں۔ پھر مجاہدہ میں مشغول ہو گئے۔ اور تیس برس ہی پھر مجاہدہ کیا۔ ساٹھ برس کے مجاہدہ کے بعد جب قلب بالکل درست ہو گیا تو لوگوں نے پوچھا حضور اب کیا حال ہے؟ فرمایا! عرش معلیٰ میرے قلب کے ایک کونے میں ہے۔ پھر انہوں نے مجاہدہ شروع کیا تو دیکھا کہ ہماری روح اولیاء اللہ کی صفوں میں پہنچی۔ پھر انبیاء علیہم السلام کی صف کے پاس بڑے زور مار کر پہنچی۔ ہر چند بڑی کوشش کی مگر آگے نہ بڑھ سکی۔ انبیاء علیہم السلام کی صف سے آگے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خیمہ تھا۔ بہت زور مار کر اور بہت ہی کوشش کے بعد اتنا ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خیمہ کی رسیاں پکڑیں جو انبیاء علیہم السلام کی صف تک تنی ہوئی تھیں۔ اس واقعہ پر ایک عالم نے حضرت خواجہ توکل شاہ انبالوی رحمتہ اللہ علیہ سے سوال کیا کہ حضور اس سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خیمہ تک بایزید بسطامی رحمتہ اللہ علیہ جیسے اکابر کی رسائی نہ ہوئی۔ تو یہ جو فقیر کہتے ہیں کہ ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت ہوئی یہ زیارت کیسے ہوتی ہے۔ اور کیونکر اس کی صورت میں زیارت ہونی ممکن ہے۔ فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت ہونی آسان ہے لیکن آپ ﷺ کے خیمہ تک پہنچنا بہت مشکل ہے۔ اسے یوں سمجھنا چاہئے کہ صاحب خیمہ آپ ہی خیمہ سے باہر نکل کر اپنی زیارت کرادے تو اسے آسان ہے۔ جیسے بادشاہ اپنی رعیت کو دیکھنے کے واسطے دورہ پر نکلے۔ تو ہر شخص بادشاہ کی زیارت کر سکتا ہے۔ پر اتنی مجال

کسی کی نہیں کہ بادشاہ کے تخت پر جا بیٹھے۔

سچ تو یہ ہے کہ حقیقت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اصلی راز حقیقت آدمیہ ہی میں مضمر ہے۔ باطن کی اصطلاعات میں وجود کے جو تین مرتبے متعین کئے گئے ہیں تو ان میں احدیث تو ''غیب الغیب'' یا ''باطن محض''، یعنی ذات الٰہی کو کہتے ہیں۔ وحدت ''صفات اجمالیہ'' کا نام ہے جسے حقیقت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم کہا جاتا ہے اور واحدیت ''صفات تفصیلیہ'' کا درجہ ہے جسے اعیان ثانیہ اور حقیقت آدمیہ بھی کہتے ہیں۔ یہ تینوں درجے ازلی عبدی ہیں اور ان میں آپس میں ایک دوسرے پر تقدم و تاخیر بھی ہے۔ چونکہ انسان صفات حق کا مظہر ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان سب میں مظہریت میں اکمل و اعلیٰ ہیں۔ اس لئے درجہ صفات اجمالی یعنی حقیقت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم درجہ صفات تفصیلی یعنی حقیقت آدم سے مقدم ہے۔ لیکن حقیقت رسول اللہ صلی الہ علیہ وسلم کے مقابلے میں ظاہر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں تمام اسماء الٰہی میں سے صرف ایک اسم ہی ظاہر کیا گیا ہے اور وہ ہے ''ہادی''، یعنی صحیح راہنمائی کرنے والا اور اسی طرح ابلیس کے مقابلے میں تمام اسماء الٰہی میں سے صرف ایک اسم سے اس کو نوازا گیا اور وہ ہے ''مذل''، یعنی راستے سے بھٹکانے والا۔ اور اسی طرح حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم کو براہ راست اپنے اسم ''العلی'' سے نوازا گیا کہ جس کے معنی عالی شان مرتبہ والے کے ہیں۔ اس ضمن میں مفسرین بیان فرماتے ہیں کہ ابلیس اپنی حقیقت مذل سے بدگان خدا کو گمراہ کرتا ہے جبکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی صفت ہادی سے ان کی ہدایت فرماتے ہیں اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم اپنی صفت العلی سے راہ ہدایت پر رہنے والوں کی تین اطراف سے مشکل کشائی کرتے ہیں، یعنی قوت، ہمت اور معرفت۔ کیونکہ اسم ''العلی'' انہی تین اطراف میں بلند مرتبہ کا حامل ہے۔

❖ اگر اس ذات باری تعالیٰ کی جمالی صفات پر ایک نظر ڈالی جائے تو اس میں صفت اول ''حسن'' ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

''(انسان کو) میں نے اپنے دونوں ہاتھوں سے پیدا کیا''۔(ص:75)

پھر فرمایا:

''پھر تمہاری تصویروں کو خوبصورت بنایا''۔(تغابن:3)

اس نے انسان کو اپنی صفت کی مہارت سے لباس پہنایا ہے یہی وجہ ہے کہ انسان کی فطرت میں بھی حسن پرستی شامل ہے۔خدائے رب العزت ان دونوں جہانوں کی تخلیق سے پہلے بھی خوبصورتی کو پسند کرتا تھا۔اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس کی صفات کے علاوہ اس کی اپنی حقیقت بھی خوبصورتی اور محبت ہے۔اس کی خوبصورتی، محبت تھی اور اس کی محبت، خوبصورتی تھی۔وہ ایک ہی وقت میں محبّ بھی تھا اور محبوب بھی اس نے اپنے آپ کو ہی اپنی خوبصورتی کے آئینے میں دیکھا اور اپنے آپ سے ہی محبت میں گرفتار ہو گیا۔اللہ اپنی حقیقت کے علاوہ اور کسی سے محبت نہیں کرتا اور یہی وجہ ہے کہ وہ اپنی مخلوق کہ جس کو اس نے نہایت خوبصورتی سے تخلیق کیا ہے اس سے محبت کرتا ہے اور ظاہری بات ہے کہ جس سے محبت ہوتی ہے اس کی بھلائی بھی مقصود ہوتی ہے یہی وجہ ہے کہ اس نے اپنی مخلوق کی بھلائی کے لئے اپنی محبت کی حقیقت کو اس دنیا میں حقیقت محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کی صورت میں بھیجا۔

اسی لئے ارشاد ہوتا ہے۔

''**اللّٰه جميل و يحب الجمال**''

''اللہ خوبصورت ہے اور خوبصورتی پسند کرتا ہے''۔

❖ سورہ ص میں ارشاد ہوتا ہے۔

''فرمایا تو حق یہ ہے اور میں حق ہی فرماتا ہوں۔''(ص:84)

تو درحقیقت خدا سے بھلائی ہی ہے۔اور جو ہم کو برائی نظر آتی ہے وہ دراصل اس کے وجود سے نہیں بلکہ یہ تو اس کے متضاد اسماء کا آپس میں تعلق ہوتا ہے یا یوں کہہ لیجئے کہ یہ اس بے معنی حقیقت سے ہے کہ جو اس کی حقیقت سے باہر ہے۔آپ ایک تلوار کی مثال لے لیجئے کہ جو کاٹتی ہے۔اب کائنات بذات خود کوئی برائی نہیں ہے بلکہ یہ تو اس تلوار کی دھار

کے عمدہ ہونے کو ظاہر کرتی ہے۔ اس لئے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ جب ہم اس کے اسمائے جلالی سے کرتے ہیں تو ہمیں یہ برائی نظر آتی ہے لیکن حقیقت میں تو ان میں خالصتاً اچھائی ہے۔

❖ اللہ کی ان صفات کا ذکر مولانا رومی رحمتہ اللہ علیہ بھی فرماتے ہیں، جس کا ترجمہ حسب ذیل ہے۔

''عطار محبت کے سات شہروں سے گزرا اور ہم ابھی تک صرف ایک گلی کے موڑ میں کھڑے ہیں۔''

یہاں پر سات شہروں سے مراد اللہ کے سات ایسے مقامات ہیں کہ جو اس کے تمام اسماء کا احاطہ کرتے ہیں۔ یہ سات مقامات اجسام، مثال، ارواح، واحدیت، وحدت، احدیت اور مطلق ہیں۔ اور مولانا رومی رحمتہ اللہ علیہ کے مطابق یہ سات شہر ہیں۔ اللہ کا بندہ خواہ جس قدر بھی جستجو کر لے وہ اس کے سات شہروں میں سے کسی ایک شہر کی ایک گلی کے موڑ سے آگے نہیں جا سکتا۔ یہ درجہ اس ذات پاک نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا فرمایا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی تمام صفات کا معجزانہ علم عطا فرمایا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام بڑے محبوب اور برگزیدہ پیغمبر گزرے ہیں۔ لیکن ان کو بھی فقط اپنی ایک ایک صفت کا معجزانہ علم عطا فرمایا یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ''کلیم اللہ'' اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ''مسیح اللہ''۔

❖ محققین کے نزدیک یہ تمام صفات ایک ظاہری حیثیت رکھتی ہیں اور ان کی اپنی کوئی حقیقت نہیں ہوتی ان کا مقصد اس کی ذات سے قریب ہونا ہے، حصول حقیقت نہیں۔ یہ صفات اس کی اصل حقیقت کے علاوہ ہیں اس کے برعکس حکماء یعنی فلسفہ دانوں کے نزدیک یہ صفات ہی اس کی اصل حقیقت ہیں اور یہ کہ صفات اور حقیقت ایک دوسرے میں ضم ہو کر اس کے وجود کو تخلیق نہیں دیتیں۔ یہ نظریہ بدھ قوم کا نظریہ ہے اور ہم اس کی تفصیل میں نہیں جانا چاہتے۔

❖ کسی بزرگ نے فرمایا ہے۔

''جنت میں ایک بازار لگا ہوا ہے جہاں پر چہرے بکتے ہیں۔''

اس سے مراد اللہ کی تجلیات ہیں کہ جو اس نے کائنات کی مختلف اشکال میں چھپا دی ہیں۔

اس لئے شیخ عبدالقادر جیلانی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

''میں نے رب کو اپنے خواب میں ایک رسول کی شکل میں دیکھا۔''

❖ وہ مقام کہ جو وحدت سے لے کر رسول کے ظاہر ہونے تک ہے اس کو ایک صوفی کی تجربہ گاہ میں ''حقیقت محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کی تشبیہ'' کہا جاتا ہے۔

❖ اس کی ذاتی لیاقت، استعداد یا قابلیتوں کو شریعت میں ''فرشتوں'' کا نام دیا جاتا ہے اور یہ اصل میں قوت ربانی کی ظاہری صورتیں ہوتی ہیں۔ مثلاً ہوا کا فرشتہ، آگ کا فرشتہ وغیرہ وغیرہ۔

آپ کا کان ایک ظاہری حالت ہے اور سننا کان کی استعداد ہے اور اگر جسم بھی نہیں ہو گا تو اس قوت کا ظاہر کرنا بھی ممکن نہ ہوگا۔ اللہ کی حقیقت ان صفات سے ظاہر ہوتی ہے اور یہ صفات اس کی ذاتوں، لیاقتوں اور قابلیتوں سے ظاہر ہیں اور یہ لیاقتیں اور قابلیتیں مختلف اجسام میں جا کر ظاہر ہوتی ہیں اور ان اجسام میں پیدا ہونے والے عوامل اپنا اظہار کسی چیز پر اثر انداز ہو کر کرتے ہیں۔ اس لئے کہہ سکتے ہیں کہ اس کی صفات کے اظہار کے بغیر اس کی حقیقت ظاہر نہیں ہو سکتی ہے۔

❖ علم سے مراد ایک تصور ہے، اس تصور کا تجزیہ ہے اور پھر اصل مقصد کا حصول ہے۔ نور کا اظہار کسی اور چیز سے نہیں ہو سکتا اس لئے اس کو اپنی حقیقت کو پیش کرنے کے لئے اپنے آپ کو ہی پیش کرنا ہوگا۔

یہ ایک بڑا غور طلب نقطہ ہے کہ جو چیز کسی دوسرے میں ظاہر ہو جاتی ہے وہ غیر کے تصور سے باہر ہو جاتی ہے۔ لیکن چیز کو اپنے آپ کو ظاہر کرنے کے لئے خود اپنے آپ کو پیش کرنا

مقصود ہوتو وہ غیر کے تصور کے اندر آ جاتی ہے اور اس تصور میں آنے والی حقیقت صرف نور ہے۔ ''شہود'' سے مراد اس چیز کا مشاہدہ ہے کہ جو ''غیب'' ہے یعنی کہ جو دیکھی نہ جا سکے اور یہ بدھ مت کا عقیدہ ہے۔ وجود سے مراد اس چیز کی ظاہری حالت ہے جو پہلے نہ تھی۔ ''عیاں ثابت'' فارسی میں علم کی قسم ہے اور مختلف چیزوں میں چھپی سچائی اور حقیقت اور اسماء کی مسلمہ حقیقت اور وجود کے تعلق کو ظاہر کرتی ہے۔ اس مقام پر ان کی تخلیق اس بنانے والے کی اپنی تخلیق کے ساتھ نہیں ہوتی بلکہ یہ خود اپنے وجود کو ظاہر نہیں کر سکتی۔ وہ بنانے والا ان کو وجود میں لے کر آتا ہے۔ ان حقیقتوں کا انحصار ''ایکٹر'' کی مرضی پر منحصر ہوتا ہے اور اس کی دو حالتیں ہوتی ہیں یا یوں کہہ لیجئے کہ دو نظریات ہوتے ہیں۔ پہلا وہ جس میں ایکٹر اپنی صلاحیتوں کے ذریعے ان حقیقتوں کو دیکھنے والوں پر ظاہر کرتا ہے تا کہ وہ ان حقیقتوں کو جان کر اصل وجود کا اندازہ لگا سکیں اور یہ نظریہ ''وجودیہ'' ہے۔ دوسری حالت وہ ہے کہ جس میں ایکٹر ان حقیقتوں کو اس لئے ظاہر کرتا ہے تا کہ وہ دیکھنے والوں پر اپنی اصل حقیقت کو ظاہر کر سکے اور یہ نظریہ ''شہودیہ'' کا ہے۔ وہ اکیلا ہی ایک وقت میں وجہ بھی ہے اور اثر بھی۔ اگر آپ اس حد کو پار کریں گے تو آپ کا ایمان دو حصوں میں تقسیم ہو جائے گا۔

❖ صفات کا اس ذات کی اصل حقیقت کے علاوہ کوئی اپنا علیحدہ وجود نہیں ہے۔ ''جاننے'' کی صفت کے لئے اس کی حقیقت ہی خود علم ہے۔ اس کے وجود کے لئے زندگی کو ظاہر کیا گیا، اس کی خواہش کے لئے مرضی کو ظاہر کیا گیا۔ اگر ان صفات کی کوئی اپنی علیحدہ حقیقت ہوتی تو یہ ایک حقیقت اضافہ ثابت ہوتیں اور اس طرح سے ناممکنات پیدا ہوتیں۔ اس کی حقیقت سے ہی زندگی ظاہر ہے، علم ظاہر ہے، خواہش ظاہر ہے، سماعت ظاہر ہے اور گویائی ظاہر ہے۔

❖ ''مواحد'' وہ ہوتا ہے جو کسی ''غیر'' کو نہیں دیکھتا یعنی وہ اپنی ہی حقیقت میں اپنے آپ کو تلاش کرتا ہے اور وہ کسی دوسری حقیقت کو نہیں پاتا اس وقت سے لے کر کہ جس کا کوئی آغاز نہیں ہوتا اور اس وقت تک کہ جس کا کوئی آخر نہیں ہوتا۔ یہ صرف اس ذات کی حقیقت

کی تجلی ہے جو اپنے آپ سے ہی اپنے آپ کو نمودار ہوتی ہے اور اپنی حقیقت کو اپنے اوپر ہی واضح کرتی ہوئی گزر جاتی ہے۔ اس میں صفات کی گنجائش نہیں رہتی۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

''تم فرماؤ وہ اللہ ایک ہے......اور اس کا کوئی ہمسر نہیں۔'' (اخلاص)

یہ وہ مقام ہے کہ جہاں پر انسان کو اس کے ایمان کی بنیاد پر سنگسار کیا جاتا ہے۔ یہاں پر اس حقیقت کی اصل پہچان اور صفات کے تصوراتی فرق کو آپس میں ملا دیا جاتا ہے۔ یہ ایک دوسرے پر واضح نہیں کر سکتے ہیں۔ اس کی حقیقت اس کی لاتعداد صفات کو واضح نہیں کرتی اور نہ ہی اس کی لاتعداد صفات اس کی حقیقت کو واضح کر سکتیں ہیں۔ یہ صفات اس کی حقیقت میں ایک اضافہ ہیں لیکن دونوں کی اصل حقیقتیں علیحدہ علیحدہ ہیں۔ علم اور سوچ کے آئینے میں اس کی صفات اس کی حقیقت کے مقابلے میں ایک تصوراتی چیز ہے یعنی اپنے سے باہر ان صفات کا کوئی وجود نہیں ہے۔ جبکہ اس کی ذات باری تعالیٰ کی یکتائی ایک حقیقی چیز ہے۔ جس کا وجود اپنے سے باہر بھی ہے اور علم کے دائرے میں بھی مثال کے طور پر مجھ میں خواہ جتنی بھی صفات ہوں لیکن اس کے باوجود میری اپنی حقیقت تو ایک ہی رہے گی۔ یہ لاتعداد صفات میری اصل حقیقت کو ایک سے زیادہ نہیں کر سکتیں کہ میری حقیقت ایک انسان کی حقیقت ہی رہے گی۔ اگر میں اس تفصیل کو اس طرح پیش کروں کہ ۱=۰+۰+۱ تو کچھ غلط نہ ہوگا۔ ۱ کا عدد ایک حقیقت کو ظاہر کرتا ہے اور ۰ کے اعداد تصوراتی ہیں اور ان تمام کا مجموعہ بھی ایک ہی رہے گا۔ جبکہ اس کے برعکس اس ذات باری تعالیٰ کی حقیقت کے بارے میں ایک مصنف لکھتا ہے۔

"The true identity dissolves the multiplicity of imaging items as stuff that dreams are made of - When this imaginary item is turned into a reality- It becomes an external screen, a mental disease and gives rise to doubts and suspicions

and this process in its perfection becomes 'Kufr' which cans hide reality with the darkness, of doubts and superstitions"

سورۂ بقرہ میں ارشاد ہوتا ہے۔

''اور اللہ نے مہر کر دی ان کے دلوں پر اور پردہ کر دیا ان کے کانوں پر ان کی آنکھوں پر اوران کے لئے بڑا عذاب ہے۔'' (بقرہ:7)

بعض فلسفہ دانوں کا یہ خیال جس کو میں پہلے بیان کر چکا ہوں کہ اس کی حقیقت اصل میں اس کی صفات ہیں۔ یہ نظریہ اپنے آپ کو ایک لحاظ سے صحیح بھی ثابت کرتا ہے۔ کیونکہ اگر انسان اپنی اصل حقیقت کی بات کرے تو محض اپنے انسان ہونے کی حقیقت کے ساتھ بے کار ہے۔ جب تک کہ اس کے ساتھ انسانی صفات وابستہ نہ ہوں تو نہ دیکھ سکتا ہے، نہ سن سکتا ہے اور نہ سونگھ سکتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ لیکن انسان کی حقیقت کے مقابلے میں اللہ کی حقیقت ان صفات کی محتاج نہیں ہے۔ یعنی اس کو کسی چیز کے پرکھنے کے لئے اسے دیکھنے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ وہ تو اپنی اصل حقیقت سے ہی تمام چیزوں کو جان سکتا ہے۔ اگر اس کو ان ظاہری صفات کی ضرورت نہیں ہے تو اس کا مطلب ہے کہ اس کی اپنی اصل حقیقت ہی سراپائے صفات ہے۔ یہ نظریہ اس صورت میں صحیح ثابت ہوتا ہے کہ اگر ہم اس کے لئے کچھ حدیں مقرر کر دیں کہ جو صوفیائے کرام اور فلسفہ دانوں دونوں کے نظریات کو اپنی اپنی جگہ پر ثابت کریں۔ اگر اس طرح سے کہا جائے کہ اس نے اپنی حقیقت کی صفات کی ایک حد مقرر کر دی ہے کہ انسان اس حد سے آگے نہیں گزر سکتا اور اس حد میں رہ کر وہ ان صفات کو کچھ نام یا اسماء کے ساتھ پکار سکتا ہے۔ کیونکہ یہاں پر یہ صفات لامحدود ہو جاتی ہیں بلکہ یہ صفات اپنا نام بھی کھو کر اس کی حقیت میں گم ہو کر ایک ہو جاتی ہیں تو اس طرح سے دونوں نظریات اپنی اپنی حقیقت کو واضح کر دیتے ہیں۔ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہاں پر نہ تو کوئی مشکیزہ ہے اور نہ ہی کوئی پانی بلکہ یہاں پر تو ایک ہی حقیقت ہے جس میں مشکیزہ بھی ظاہر ہے اور پانی بھی۔ یہ تو انسان کی سوچ ہے کہ وہ ان صفات کو لاتعداد محسوس کرتا اور سمجھتا ہے۔ لیکن ان کی

اصلیت تو ایک ہی حقیقت میں جا کر ایک ہو جاتی ہے۔

❖ اس ذات باری تعالیٰ کی ''حقیقت'' (لاحوت) اس کی صفات کا ذریعہ ہے۔ ''صفات'' (جبروت) ذریعہ ہیں ''افعال'' (ملکوت) کا اور افعال ذریعہ ہیں ''اثرات'' (ناسوت) کا۔

❖ علماء کے نزدیک وقت ایک تصوراتی چیز ہے، فلسفہ دان کے خیال میں یہ آسمانوں اور ستاروں کی گردش سے وجود پاتا ہے اور اولیاء کے مطابق یہ خود لامحدود ہے۔ اور یہ ان دونوں وقتوں کا ملاپ ہے کہ جس کا نہ تو کوئی آغاز ہے اور اس کا کہ جس کی کوئی انتہاء نہیں ہے۔ تخلیق اور تحلیل دونوں اس کے اندر ہیں۔ ہم مختلف اشیاء سے اپنے اور گردونواح کے تعلق کی بناء پر ان کو آغاز اور اختتام سے منسوب کرتے ہیں۔ حالانکہ تخلیق اور تحلیل کا اپنا وجود بھی ایک ہی طاقت میں ایک ہی ہے اور یہ دونوں عوامل ایک دوسرے سے جدا نہیں۔ وقت خدا کی ایک لامحدود صفت ہے اور اس کے کوئی دو کنارے نہیں ہیں۔ جیسا کہ پہلے بیان کر چکا ہوں کہ یہ تو ہماری محدود سوچ ہے کہ وہ وقت کے ایک محدود مقام پر آ کر رک جاتی اور شروع ہو جاتی ہے کہ جس کو ہم آغاز اور اختتام کا نام دیتے ہیں۔ ورنہ اللہ کے ہاں اس کی صفات کا کوئی نام نہیں ہے۔ یہ اس کے اسماء تو فقط ہماری راہنمائی کے لئے پیدا کئے گئے ہیں۔ اس کی صفات تو لامحدود ہو کر اس کی حقیقت میں ہی گم ہیں۔

❖ وقت تو ایک نقطہ کی گردش ہے یہ سال، ماہ، دن، منٹ اور سیکنڈ تو فقط اس کی تفصیل کو بیان کرتے ہیں کہ جو لامحدود ہے۔ اس لئے کسی حال اور ماضی کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

کسی بزرگ نے فرمایا تھا۔

''اللہ کے ساتھ نہ کوئی صبح اور نہ شام۔''

فلسفہ عشق

اب جبکہ ہم ایمان سے فطرت، فطرت سے توکل اور توکل سے یقین تک کی منازل کا سفر طے کر چکے تو ضروری ہے کہ عام فہم انداز میں ان تمام کا باہمی ربط حالت عشق سے واضح

کروں کہ یہ کس طرح سے ایک دوسرے پر اثر انداز ہیں اور ایک ہی حقیقت کے گرد محوِ گردش ہیں۔ اس ضمن میں عرض یہ ہے کہ اگر انسان نامحرموں میں ہو تو اس کے ہم زبان نہ ہونے کی بناء پر وہ خود کو قیدی تصور کرتا ہے۔ تو جب اللہ سے ہم زبان ہونا ہو تو ضروری ہے کہ طریقت کی زبان اختیار کرے۔ شریعت (فیض نبوت) اس کو قرب عطا کرتا ہے لیکن وصل درحقیقت طریقت (فیض ولایت) ہی سے ممکن ہے۔ یہ اس طرح ہے کہ جس طرح جسم میں روح قید ہے۔ جس طرح کی بولی جسم جانے گا ویسی ہی طبیعت سے روح وصل پائے گی۔ تو اگر بولی دنیا سے قرب عطا کرتی ہے تو روح بھی دنیاوی مادیت سے وصل پاتی ہے۔ تو پھر یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اگر جسم کی بولی مجاز سے متعلق ہے تو روح کو بھی مادیت سے سکون ہو گا اور اگر جسم کی بولی شریعت سے متعلق ہے تو روح کو بھی طریقت سے سکون ہوگا۔ فرق فقط یہ ہے کہ مادیت کی زبان شیطان کی ہے جبکہ طریقت کی زبان رحمان کی ہے۔ اب اگر قرب الٰہی سے وصل الٰہی تک کا سفر طے کرنا ہے تو ضروری ہے کہ دل کے تابع ہو۔ کیونکہ دل (عشق) قضائے الٰہی کے نزدیک کرتا ہے اور انسان تمام فیصلوں پر اس کی حکمت کو حتمی تصور کرتا ہے۔ لیکن جب وہ عقل کے تابع ہوگا تو پھر دلائل کے سہارے چلے گا اور قضائے الٰہی سے دور ہو جائے گا۔ تب وہ اپنے فیصلوں پر اپنی عقلی حکمت کو حتمی تصور کرے گا اور جب کوئی عقل کو خدا تصور کرتا ہے تو ہمیشہ منہ کی کھاتا ہے۔

انسان کی صفت یہ ہے کہ وہ اسی کا اقرار کرتا ہے کہ جو اس پر ظاہر ہوتی ہے۔ لیکن پھر بھی اس ظاہر کی باطنی حکمت سے بے خبر ہوتا ہے اور خدا وہ ہے کہ جو اس باطنی حکمت کو جاننے والا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس جو چھڑی تھی تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے نزدیک اس کا اسم ''عصاء'' تھا۔ لیکن اس عصا کا باطنی اسم ''اژدھا'' تھا جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کا رب پر ہی منکشف تھا۔ یہی وجہ ہے کہ فرعون کی عقلی حکمت اس باطنی حکمت کے مدمقابل ناپید ہوگئی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا نام یہاں پر بت پرست مشہور تھا لیکن الست میں مومن وخدا پرست۔ اسی طرز پر جب حضرت آدم علیہ السلام کو تخلیق کیا گیا تو

اس میں نورحق کورکھ دیا کہ جس کو دیکھ کر تمام فرشتے سجدے میں گر گئے۔لیکن پھر ایک نہی کے بل پر پردہ پڑ گیا اور انہوں نے اس درخت کے پھل کو کھالیا۔حالانکہ ان میں تو انوارحق کورکھ دیا گیا تھا پھران سے یہ غلطی کیوں ہوئی؟ تو جواب اس کا یہی ہے کہ یہ قضاء وقدر کا نتیجہ تھا ورنہ حضرت آدم علیہ السلام تو معصوم تھے۔اگران مسائل پر دل سے جواب طلب کیا جائے تو تب ہی حجابات دور ہو سکتے ہیں ورنہ اگر عقل کو ہی قضاء تصور کرو گے تو پھر قضائے الٰہی سے جہنم رسید ہو گئے۔بس یہ جان لینا چاہئے کہ اگر قضاء سو بار قصد آپ کی جان کا کرے تو پھر یہی قضاء آپ کو جان بھی بخشے گی اور آپ کا درمان کرے گی اور اگر سو بار یہ آپ کی راہ مارے اور آپ کا معاملہ خراب کرے تو پھر یہی آپ کو ایسے مرتبہ پر پہنچائے گی کہ آپ کا خیمہ آسمان پر نصب ہوگا۔انسان کو چاہئے کہ اس کے خلاف کو خلاف مت جانے بلکہ اپنے مالک کا کرم سمجھ کر وہ آپ کو ڈراتا ہے۔ظاہر ہے کہ جب وہ اسے ڈرائے گا تو انسان اس سے آگاہ و واقف ہوگا اور اگر وہ نہ ڈرائے تو انسان گمراہ ہو جائے۔انسان جب اس تصور قضائے الٰہی پر یقین محکم پاتا ہے اور انتہاء سے ہمکنار ہوتا ہے اور ''من کان للّٰہ'' ہو جاتا ہے تو مستحق ''کان اللّٰہ لہ'' کا ہو جاتا ہے۔چنانچہ حدیث میں ہے ''من کان للّٰہ کان اللّٰہ لہ'' یعنی جو اللہ کا ہو جاتا ہے اللہ اس کا ہو جاتا ہے۔اس صورت میں کبھی وہ اس کو تو کہتا ہے اور کبھی میں۔کبھی اس کی تعبیر اسی سے کرتا ہے اور کبھی اپنی ذات سے۔غرض جس انداز سے بھی کہیں صحیح ہے۔کیونکہ جب وہ اپنے رب سے روشنی حاصل کرتا ہے تو ایک آفتاب روشن ہوتا ہے کچھ چھپا نہیں ہوتا اور اس وقت اس کی مشکاۃ سے روشنی حاصل کر کے اپنے دم کو فروغ حاصل کرتا ہے اور ایک عالم کی لاحل مشکلیں سب حل ہو جاتی ہیں۔آدمی تو ایسا معزز و مکرم ہے کہ اس کو ہر شے کے اسماء اس رب العزت نے خود سکھائے۔

جیسا کہ فرمایا:

''سکھائے آدم علیہ السلام کو نام ہر شے کے۔'' (بقرہ:31)

اور پھر حضرت آدم علیہ السلام سے دوسروں کو یہ کشود ہوئی۔ظاہر ہے پانی چاہے نہر سے

ڈھونڈے چاہے گھڑے سے، لیکن ہے تو نہر ہی کا۔ کیونکہ نہر ہی سے گھڑے کو مدد ملتی ہے۔ دوسری مثال نور کی ہے کہ خواہ وہ مہتاب سے ہو یا آفتاب سے، مگر ہے تو وہ نور آفتاب کا ہی۔ اگر کسی کو آفتاب نہیں ملتا جو کہ مثل آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہے تو نجوم ہی سے نور چن لے کہ وہ اصحاب رضی اللہ عنہم ہیں۔ یعنی

"میرے اصحاب رضی اللہ عنہ ستاروں کی مثل ہیں اگر ان کی پیروی کرو گے تو فلاح پاؤ گے۔"

چاہے آدمی سے اس کا نور حاصل کر لیا چاہے خود اس سے، خم سے شراب حاصل کر یا کدو سے۔ اس واسطے کہ یہ خم کدہ سے بہت ملا ہوا ہے کہ جہاں سے اس کی اصل ہے۔ پس جب کسی چراغ نے نور شمع سے حاصل کیا تو جس نے اس چراغ کو دیکھا تو اس نے بالیقین شمع کو دیکھا۔ اسی طرح چراغ کا نور اگر سو چراغ تک نقل ہو گا تو اس کے بعد کے نور کا دیکھنا بھی درحقیقت اصل کا ہی دیکھنا ہو گا اور اس میں کچھ فرق نہ ہو گا۔ یہ نور حضرت آدم علیہ السلام سے چلا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچا پھر آپ کے اہل بیت علیہم السلام، اصحاب رضی اللہ عنہم، تابعین رحمتہ اللہ علیہم اور اسی طرح اولیاء اللہ رحمتہ اللہ علیہم سے ہوتا ہوا قلوب کو روشن کرتا ہے۔

جیسا کہ فرمان رسول خاتم صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔

"نفحے اللہ تعالیٰ کے ان ایام میں جو تمہارے زمانے کے ہیں سبق لاتے ہیں تا کہ تم ان سے بہرہ ور ہو سکو۔"

یہ نفحے اہل زمانہ کے لئے غنیمت ہیں۔ ایک نفحہ تو ایسا تھا کہ جو رب کے فضل سے تھا اور جس کو اس نے جان تازہ بخشی چاہی تو بخش دی اور اس کے ذریعے گور ضلالت میں مدفون نے حیات جاوداں پائی اور یہ نفحہ انبیاء علیہ السلام کا تھا اور انہی کے سبب سے دین کاملیت کو پہنچا۔ اب کہنا فقط اتنا ہے کہ جو دوسرا نفحہ چلا ہوا ہے تو کہیں اس سے بھی محروم نہ رہ جائے گا اور اس دوسرے نفحے میں اولیاء و عارفین شامل ہیں اور اس نفحے نے قباء بقاء کی پہنی ہوئی

ہے کہ کبھی مر نہیں سکتا۔ کیونکہ اسی کے سب سے اس کائنات کی تازگی و جنبش ہے اور یہ نفحہ عشق سے متعلق ہے اور یہ وہی نفحہ ہے کہ جب زمین وآسمان سے کہا گیا کہ اس نفحہ کا بار اٹھاؤ تو انہوں نے اس کے اٹھانے سے انکار کیا۔ لیکن انسان نے حامی بھر لی۔

اس کے بارے میں حافظ شیراز نے کہا تھا

آسمان بار امانت نتو انست کشید
قرعہ فال بنام من دیوانہ زدند

اور یہی وہ نغمہ ہے کہ جس کے ذکر سے تمام اشعار بھی تقویت حاصل کرتے ہیں اور یہی وہ نفحہ عشق ہے کہ جس کے سوز سے آتش دوزخ بھی ڈرتا ہے یا یوں سمجھ لیجئے کہ پہلا نفحہ جو متعلق انبیاء علیہ السلام ہے وہ شرع سے متعلق ہے اور فضلی ہے اور جو دوسرا نفحہ ہے وہ طریقت سے متعلق ہے اور آتش عشق میں بھڑک رہا ہے۔ اس لئے اس میں حاصل منزل کی بنیاد خالصتاً مجاہدہ پر ہے۔ یعنی خواہش نفسانی و ہوائے جسمانی کی آتش کو آتش عشق سے بجھانا ہے۔ لیکن یہ فرق یہاں ایسا ہے کہ آتش نفسانی کہ جو بظاہر دنیاوی آرائشوں سے مزین ہے وہ بھی عشق کو ہی بنیاد بناتی ہے۔ لیکن یہ عشق لقمان (فکر و حکمت) کی بجائے عشق لقمہ ہے کہ جو فریب دینا ہے اور مجاہدہ یہ ہے کہ عشق لقمان کو عشق لقمہ پر حاوی کیا جائے۔ انسان کی نادانی یہ ہے کہ وہ نادیدہ ہے کہ وہ جان نہیں سکتا کہ خار کیا ہے۔ وہ عشق لقمہ میں جس کو خار دیکھتا ہے وہ در حقیقت خرما ہوتا ہے اور جس کو خرما دیکھتا ہے وہ خار ہوتا ہے۔ کیونکہ حرص کے سبب اس کو تمیز نہیں رہتی کہ یہ خار کس کے ہاتھ میں ہے، جان کے یا تن کے؟ اور اگر کوئی عشق لقمان کی نگاہ سے دیکھے تو لقمان کے ہاتھ پر خار تو کیا خار کا سایہ بھی نہیں وہ اس سے پاک ہے اور اگر کوئی پائے لقمان کو خار دار کرتا ہے تو وہ خود ہی عشق لقمہ کو خرما سمجھ کر ایسا کرتا ہے۔ مختصر یہ کہ یہ مقام عشق ہی ہے کہ اگر اس کو رب کی جانب سے نفحہ سمجھا جائے تو سالک کامل ہوتا ہے اور اگر اس سے ہوائے نفسانی میں پرواز کرے تو جاہل ٹھہرتا ہے۔

زمانہ بعید سے لے کر زمانہ جدید تک کے تمام عوامل اس امر پر گواہ ہیں کہ جب بھی کوئی

اپنے اصل ٹھکانے یا اصل حقیقت سے دور ہوتا ہے تو وہ بے چین رہتا ہے کہ کب وہ اپنی اصل سے وصل پائے۔ اس ضمن میں انسان کی اصل حقیقت اس وقت بیان کر دی گئی تھی کہ جب اس نے اپنے رب کے حضور وعدہ کیا تھا اور جو کچھ زمان کثرت نہ تھا بلکہ زمان وحدت تھا اور وہ زمان کثرت یا مقام فصل میں رہتے ہوئے اپنی اصل کی جستجو میں رہتا ہے اور اس تلاش میں بعض اوقات وہ خوشحالوں کی محافل میں جاتا ہے تو بعض اوقات بدحالوں میں محو جستجو رہتا ہے۔ اس تلاش میں بنیادی عنصر عشق کا ہے کہ جو اس تلاش کی تقویت کا باعث بنتا ہے اور یہ عشق ایسا ہوتا ہے کہ اس میں تریاقی و مشتاقی دونوں جمع رہتی ہیں۔ تریاقی اس کیفیت کا نام ہے کہ جس میں عشق ابھی اپنے کامل درجہ کو حاصل نہیں کرتا اور راہ میں ہوتا ہے۔ اس دوران میں یہ اسی کی فصلی حالت کے لئے زہر قاتل کا کام رہا ہوتا ہے اور انسان وجدانی کیفیت میں انتہائی تکلیف میں مبتلا رہتا ہے۔ لیکن جب یہی عشق اپنے کامل درجہ کو پہنچتا ہے تو اس کو مشتاقی کیفیت کہتے ہیں۔ کیونکہ اس دوران میں انسان اپنی فصلی کیفیت سے گزر چکا ہوتا ہے اور زہر قاتل اس کی فصلی حالت پر کارگر ہو چکا ہوتا ہے اور اس کی فصلی حالت مکمل طور پر اصلی حالت میں منتقل ہو چکی ہوتی ہے۔ اس بناء پر اس میں سکون پیدا ہو جاتا ہے اور وہ وجدانی کیفیت سے مخفی کیفیت میں پہنچ جاتا ہے۔ کیونکہ انسان جس قدر اپنی اصل سے قریب تر ہوتا ہے اسی قدر اس سے سکون پیدا ہوتا ہے۔

اس کیفیت کی وضاحت کی خاطر مزید عرض کروں گا کہ جب مٹی کو اچھالا جائے تو وہ واپس زمین پر گرتی ہے کیونکہ اس کی اصل زمین ہی کی جانب ہے۔ لیکن درحقیقت یہ بھی اس کی اصل نہیں ہے بلکہ اس کی اصل تو وہ تجلی ہے کہ جس کی تپش سے کوہ طور پھٹ پڑا اور جب پھٹا تو اس کی مٹی زمین میں مزید دھنس جانے کی بجائے ہوا میں اڑی کیونکہ اس کی اصل تو اس تجلی کی جانب تھی اور زمین تو اس کی فصلی حالت تھی۔ اب اگر یہ سوال کیا جائے کہ اگر حقیقت یہی ہے تو پھر طور کو سکون میسر آنا چاہیے تھا پھر وہ وجدان میں کیوں مبتلا ہوا؟ تو اس ضمن میں بیان کر چکا ہوں کہ طور کا عشق ابھی کامل نہ ہوا تھا بلکہ راہ میں تھا یا یوں کہہ لیجئے کہ

تریاتی کیفیت میں تھا۔ اس وجہ سے تکلیف کی کیفیت میں تھا۔ اگر طور اپنی فصلی حالت سے مکمل طور پر گزر کر اصل میں چلا جاتا تو وہ اس تجلی میں گم ہو کر تجلی ہو جاتا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام جو اس عمل کو دیکھ کر بے ہوش ہو گئے تو در حقیقت وجہ یہ تھی کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اس دنیا میں تھے اور حالت بشر میں تھے جو کہ فصلی حالت ہے۔ لیکن وہ تجلی تو اصل سے تعلق رکھتی ہے یہ دونوں حالتیں اکٹھی نہیں ہو سکتیں۔ اس بنا پر اس وقت حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اصلی حاصلت برقرار رہی اور فصلی حالت معدوم ہو گئی اور اسی اصلی حالت کے برقرار رہنے کی بناء پر حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی عوام کو تمام حقیقت سے آگاہ کر سکے۔ تو اب آپ نے غور کیا کہ جب طور پر یہ تجلی پڑی تو وہ راہ عشق پر آ کر اس کی جانب اٹھا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر یہ تجلی اس حد تک رہی کہ جو ان کو چوتھے آسمان تک لے گئی اور حضور خاتم المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ تجلی اپنی انتہا پر رہی جس بناء پر یہ عشق ان کو مقام سدرہ سے بھی آگے لے گیا اور یہی وہ مقام ہے کہ جہاں پر پہنچ کر یہ کہا جا سکتا ہے کہ عاشق و معشوق دو حقیقتوں کے نام نہیں ہیں، جب درمیان سے پردہ اٹھ جاتا ہے تو عاشق، معشوق ہو جاتا ہے۔ اسی بناء پر ابن منصور رحمتہ اللہ علیہ سے ''انا الحق'' بلند ہوا۔

اب اس مقام پر میں اس مقام عشق کا مزید کیا بیان کروں کیونکہ یہ چاہے عشق مجازی ہو یا عشق حقیقی، یہ ایک عجب ذات مستغنی الصفات ہے۔ اس کی جتنی بھی شرح اور بسط بیان کر لی جائے لیکن جب تک اس میں خود داغل نہ ہو یعنی عاشق نہ ہوں تب تک اپنے لکھے سے شرمندہ ہوں گے۔ نہ تو وسعت زبان سے اور نہ ہی انداز قلم سے اس کی کاملیت بیان ہو سکتی ہے۔ اس حالت عشق کے وصف میں جب سخن نے وصف اختیار کیا تو اس کا بھی قلم ٹوٹ گیا اور کاغذ پھٹ گیا اور عقل کا تو اس کیفیت کے سامنے یہ حال ہے جیسے گدھا کیچڑ کا اندھا۔ اگر تمثیلاً اور نظیراً بیان کیا جائے تو عشق ایک آفتاب کی مانند ہے جس کا مقام عرش اور دل مومن کا ہے۔ کیونکہ کیفیت حدت و حرارت اور نور و فروغ میں یہ بھی کاملیت پر فائز ہے۔ چنانچہ کاملین کو اس کے تصور وغیرہ سے بھی بہت فیوض و فائدے حاصل ہوتے ہیں اور اس میں

سایہ وتاریکی مطلق نہیں ہے۔ آفتاب سے جو سایہ لگا ہوا ہوتا ہے تو وہ مثل سحر خواب آور اور غفلت انگیز ہے کہ اس وقت نیند بشدت ہوتی ہے۔ مگر شمس عشق ایسا جاہ وجلال والا ہے کہ اس کے طلوع کے سامنے قمر منشق ومعدوم ہو جاتا ہے جو دراصل مادہ خواب کا ہے۔ شمس ایک ایسی شے ہے کہ اس سے ہر شے کی جان ہے لیکن برابر و یکساں نہیں رہتا۔ امس اس کے پیچھے لگا ہوا ہے جو فصل شب کا ہے لیکن اصل شمس تو عشق ہے کہ ہمیشہ پائندہ اور ایک حال پر اس کے پیچھے امس نہیں ہے۔ آفتاب عرش کی تو اس کے مثل صورت بنا سکتے ہیں اور تصویر میں لا سکتے ہیں۔ لیکن شمس عشق تو بہت بلند ہے اور اس کی کوئی نظیر تصور میں نہیں آسکتی، اس کی ذات تصور کی مطیع کہاں ہے۔

عقل، عشق کے مدمقابل ایک قلیل وجزوی حقیقت کی حامل ہے۔ کیونکہ عشق ایک لاانتہاء اور کامل مقام رکھتا ہے۔ لیکن یہ عقل، عشق سے اس انداز میں منکر ہے کہ جس طرح اطباء عشق کو ایک مرض جنون بتاتے ہیں۔ کیونکہ یہ صورت حسین وجمیل کو دیکھنے سے ہو جاتا ہے اور عقل کہتی ہے کہ عشق خود کو راز واسرار سے بھرپور سمجھتا ہے حالانکہ زیرک ودانا تو میں ہوں۔ لیکن عشق وعقل میں بنیادی فرق یہی ہے کہ عقل عشق کی طرح نیست نہیں۔ بلکہ خودی وخود پرستی سے بھری ہوتی ہے اور نیستی سے مراد خودی ومنی کا مٹ جانا ہے۔ حکماء کے نزدیک تو عقل فرشتہ ہے لیکن اس کے باوجود اس میں نیست ونفی نہیں ہے۔ یہ عقل قول وفعل میں جو ظاہر شے ہے ہماری مددگار ہے اور جب حال کا معاملہ آئے کہ کیا حکم دیتا ہے؟ تو ہم کہیں گے کہ کچھ نہیں بتا سکتا۔ کیونکہ اس کوچہ میں اس کا مطلق گزر نہیں۔ کیونکہ عقل کسی بھی سوز سے بھرپور کیفیت کو بیان نہیں کرسکتی۔ لیکن حال عشق ہی اس کے اثر کو نمایاں کرسکتا ہے۔ یہ عشق اس کو ایسی کیفیت کی خبر دیتا ہے کہ جس کی عقل نفی کرتی ہے۔ جبکہ عشق اس نفی کو بھی بخوشی قبول کرتا ہے اور ہستی ابدی پاتا ہے۔ جان جو انسانی نفس میں ہے اس کا اور کیا کہوں کہ خود کمال ہی ہے اور جو ندا اس سے نکلتی ہے وہ بھی کمال۔ اسی سبب سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو اشارہ اذان میں ارحنا یا بلال رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے

تھے۔یعنی راحت پہنچا ہم کو اے بلال رضی اللہ عنہ۔ چنانچہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ کی جان جو خدا کے عشق سے بھری تھی اس سے جو ندا آتی تھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی جان راحت پاتی تھی اور فرمایا کرتے تھے اے بلال رضی اللہ عنہ! اپنی بانگ خوشگوار اور دم دلنواز کو بلند کر اس دم سے جو میں نے تیرے دل میں پھونک دیا ہے۔ اس مقام پر وہ لوگ جو ظاہری سماعت رکھتے تھے وہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ کی لڑکھڑاتی زبان پر اعتراض کرتے تھے۔ لیکن وہ کہ جو باطنی سماعت رکھتے تھے وہ ہی حضرت بلال رضی اللہ عنہ کی ندا سے سکون پاتے تھے۔اور یہاں بھی عقل ہی عشق کی نفی کرتی ہوئی نظر آتی ہے، اسی طرح جب خیبر سے واپسی پر جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خواب مبارک میں گم ہوئے اور مع تمام اصحاب رضی اللہ عنہما کے نماز فجر قضاء ہوگئی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے چاشت کے وقت آنکھ کھولی اور نماز کے قضاء ہونے پر غم کیا اور اس مقام پر جو اہل عقل اعتراض کرتے ہیں تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہی اہل عقل پر غم کیا۔ کیونکہ وہ صاحب عقل اس امر کے اسرار سے ناواقف تھے اور اگر واقف ہوتے تو کبھی غم نہ کرتے۔ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اولیاء رحمتہ اللہ علیہم و عارفین کا ہر فعل، ان کا نفس اور ان کی جان فقط ایک ہی نشان کی مختلف علامات ہیں اور جو کہ ہر حالت میں یاد خدا سے تعبیر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مع جسم کے سدرہ کی حدوں کو پار کر گئے تو ان کا فعل، ان کا نفس اور ان کی جان تمام ذات ایزدی کے نور میں گم ہوگئی۔ اسی طرح سے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا ہر فعل بھی نماز ہی کی مانند یاد خدا سے تعبیر ہے۔ لیکن یہ حقیقت اہل عقل سے دور اور اہل باطن سے قریب تر ہے۔

اس ضمن میں حضرت مولانا روم رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ

"آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جو بے خود ہوئے شب تعریس میں، وہ اس بناء پر کہ خیبر سے واپسی پر ندا خداوندی تھی اور یہ ایسی ندا تھی کہ اس سے حضرت آدم علیہ السلام مدہوش ہوئے اور اہل آسمان اپنے ہوش سے بے ہوش ہو گئے اور اسی صوت خوب سے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو عروس میسر ہوا کہ جس سبب سے آپ

صلی اللہ علیہ وسلم اس کے لطف میں بے ہوش ہو گئے اور حضرت بلال رضی اللہ عنہ جو ساری رات نماز پڑھتے رہے اور فجر کا انتظار کرتے رہے تھے وہ بھی اس ندا پر اس خواب پر لطائف میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے شریک ہوئے۔

یہاں جو عروس کا لفظ استعمال کیا تو اس بناء پر کہ یہ بھی عشق و جان کی مانند پوشیدہ ہے اور عشق سے ہی اپنی جان میں یہ عروس پیدا ہوتا ہے اور یہ تمام مخفی حالتیں ہیں کہ جن کو فقط محسوس کیا جا سکتا ہے۔ عقل کا یہاں سے گزر بھی ممکن نہیں اور اس بناء پر جاہلین و بے ادب خود کو اہل علم جان کر حالت ظاہر پر تنقید کرتے رہتے ہیں۔''

مومن کے لئے حقیقی دعا یہی ہے کہ وہ ہمہ وقت توفیق ادب و حکمت کا خواہش مند ہو اور راہ سلوک پر سفر کرنے والوں کے لئے یہ اور بھی ضروری ہے کہ وہ بے ادبوں اور جاہلوں کی محافل سے کنارہ کش رہیں۔ اور عشق انتہائے ادب کا بھی تقاضا کرتا ہے۔ کیونکہ جہاں بے ادب لطف رب سے محروم رہتا ہے تو وہاں اس کی یہ بے ادبی گردونواح پر بھی اسی طرح سے اثرانداز ہوتی ہے کہ جس طرح گیہوں کے پیچھے گھن پس جاتے ہیں۔

اللہ جل شانہ کے محبوب پیغمبر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم پر من و سلویٰ اتارا گیا۔ لیکن وہ اس کے باوجود گستاخ و بے ادب رہے اور اس بے ادبی کی حالت میں کہا کہ ہم ایک ہی طرح کی غذا کھا کھا کر تنگ آ چکے ہیں اور یہ کہ ہمیں کچھ لہسن اور مسور وغیرہ کی بھی خواہش ہے۔ ان کی اس بے ادبی نے ان پر اللہ کی رحمت کو تنگ کر دیا اور وہ خوان ان پر بند کر دیا گیا۔ اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے بھی اپنے حواریوں کی خاطر اپنے رب سے خوانِ پر طبق کی فرمائش کی تو ان کے رب نے ان پر مفت کا خوان یعنی روٹیاں، گوشت، مچھلی، شہد، سرکہ، پسا ہوا نمک اور مرچ وغیرہ نازل کیا۔ لیکن مثل قوم حضرت موسیٰ علیہ السلام، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواریوں نے بھی لالچ اور طمع کا مظاہرہ کیا اور فقیروں کی مانند دوسرے وقتوں کے لئے خوان بچانا شروع کر دیا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ان کو سمجھایا کہ تم یہ کیا کرتے ہو۔ کچھ فکر نہ کرو کہ یہ خوان تم پر آتا رہے گا۔ لیکن ان بے ادبوں کا حرص

پھر بھی کم نہ ہوا اور وہ خوان ان پر ایسا منقطع ہوا کہ پھر اس سے کوئی فائدہ مند نہ ہو سکا۔

اسی طرح سے زکوٰۃ ادا نہ کرنا اور زنا کرنا بھی سخت گستاخی و بے ادبی ہے۔ حالانکہ ہر کوئی زانی اور زکوٰۃ ادا کرنے کا اہل نہیں ہوتا۔ لیکن جب صاحب نصاب زکوٰۃ ادا کرنے سے دریغ کرتے ہیں تو اس سے ایسا وبال پیدا ہوتا ہے کہ تمام شہر قحط کی نذر ہو جاتا ہے اور اسی طرح زنا سے جو وباء مہلک پھیلتی ہے تو اس سے مثل طاعون تمام شہر لقمہ اجل بن جاتا ہے اور یہ تمام بے ادبی اور نافرمانی کا ہی نتیجہ ہے۔ جو مرضی خدا کے تابع رہنا چاہتے ہیں تو وہ کبھی بے ادب نہ ہوتے ہیں اور نہ ہی ادھار پر گزارا کرنا چاہتے ہیں۔ کیونکہ اس میں ادب نہیں رہتا۔ ادب تو ایسا ہے کہ اس سے فلک روشن ہو رہا ہے۔ چاند، سورج اور ستارے جو اپنے مدار میں محو گردش رہتے ہوئے کامیاب ہیں تو اس بناء پر باادب ہیں۔ اگر وہ بھی بے ادب ہوں اور ادھار پر گزارا کریں تو اپنے اوقات سے آگے پیچھے ہو جائیں اور تمام نظام درہم برہم ہو جائے۔ یہ ادب ہی ہے کہ جس کی بناء پر فرشتے اور پیغمبر علیہم السلام معصوم پیدا ہوتے ہیں۔ عزازیل جو صفات ملائکہ سے محروم ہوا تو وہ اسی بے ادبی کا ہی نتیجہ تھا۔ یہ بھی مقام ادب سے ہے کہ انسان اپنے رازوں اور بھیدوں پر قابو رکھے اور اس کو ہر کسی پر عیاں نہ کرے۔ اگر قابو رکھے گا تو اپنی مراد جلد پائے گا اور ادب کا تقاضا یہی ہے کہ اس بھید کو فقط اس پر عیاں کرے کہ جو اس پر کچھ خالص تدبیر کرنے کی اہلیت رکھتا ہو۔ ورنہ اگر تمام پر افشاں کرے گا تو بے ادبی کے ضمن میں آئے گا اور تکلیف سے دوچار ہوگا۔ اس کی مثال اسی طرح ہے کہ جس طرح کسی گدھے کی دم میں کانٹا چبھ جائے تو وہ اچھل کود کر اپنی تکلیف میں مزید اضافہ کر لیتا ہے اور شور وغل مچاتا ہے۔ اب ضروری ہے کہ کوئی طبیب اس کو آ کر سمجھائے کہ تو زیادہ اچھل کود مت کر اور پھر اس کی دم سے کانٹا احتیاط سے نکال لے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا بھی یہی فرمان ہے۔

''جس نے اپنا بھید چھپایا وہ جلد ہی اپنی مراد سے جفت ہوا۔''

عشق کیسا ہونا چاہیے؟ اور عشق و ادب کا امتزاج کیسا ہونا چاہیے؟ یہ سوال ایسے ہیں

کہ جو خود کو قابل عمل قرار دینے کے لئے کسی جیتی جاگتی مثال کے طالب ہیں تاکہ اپنے جواب کے تاثرات میں پائیداری حاصل کر پائیں اور ایک ایسی مثال کہ جس سے عشق کے معنی معلوم ہو سکیں کہ یہ عشق ہے کیا؟ خیال رہے کہ احساس عشق فقط اس وقت قائم ہوتا ہے کہ جب دو وجودوں کا آپس میں باہمی ربط کو بطور کسوٹی عشق پیش کرتی ہے وہ درج ذیل ہے اور جس سے ہم حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم "من کان للہ کان اللہ لہ" کے اصل مفہوم کو جان سکیں جو کہ مقصود موضوع ہے۔

معراج عشق، صدیق رضی اللہ عنہ سے ہے

حالات جناب صدیق رضی اللہ عنہ کا بیان کرنا احاطہ موضوع میں تو نہیں۔ لیکن فلسفہ عشق سے شناسائی کی خاطر ان حالات سے مختصراً واقفیت ضروری ہے۔ کیونکہ انتہائے عشق جان، مال اور اولاد کی قربانی راہ حق میں طلب کرتا ہے کہ جس سے حقیقت ذات تعالیٰ سے شناسائی آئینہ حقیقت رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں حاصل ہو سکے اور جناب صدیق رضی اللہ عنہ کی مثال ان مراحل پر رہنمائی کے لئے موزوں ترین ہے۔

عالم مراقبہ کے دوران ایک مرتبہ مجھے محسوس ہوا کہ میرا شعور اور لاشعور ایک دوسرے سے مکالمے میں مصروف ہیں۔ اپنے شعور کو عالم تصور میں اپنی ظاہری ہیت جیسا پاتا ہوں۔ جبکہ لاشعور کی ہیت کو بیان نہیں کر سکتا۔ بس اتنا احساس ضرور تھا کہ وہ شعور سے ابھرنے والے سوالات کا جواب دے رہا تھا۔ اس دوران میں ہونے والا مکالمہ اگرچہ مجھے لفظ بہ لفظ تو یاد نہیں لیکن اشارۃً پیش کر رہا ہوں۔

شعور　　انسانیت کی تصدیق کس نے کی؟

لاشعور　　اللہ نے کہ اس نے انسان کو زمین پر اپنا خلیفہ مقرر کیا۔

شعور　　انسانیت کے افضل ہونے کی تصدیق کس نے کی؟

لاشعور　　ملائکہ کے سجود نے۔

شعور　　خیر کی تصدیق کس نے کی؟

لاشعور رحمٰن نے۔

شعور شر یا نفس امارہ کی تصدیق کس نے کی؟

لاشعور شیطان نے۔

شعور پھول کی تصدیق کس نے کی؟

لاشعور خوشبو نے۔

شعور بادل کی تصدیق کس نے کی؟

لاشعور بارش نے۔

شعور سورج کی تصدیق کس نے کی؟

لاشعور دھوپ نے۔

شعور موت کی تصدیق کس نے کی؟

لاشعور زندگی نے۔

شعور شہادت کی تصدیق کس نے کی؟

لاشعور حضرت حسین علیہ السلام نے۔

شعور طہارت کی تصدیق کس نے کی؟

لاشعور فاطمۃ الزہرہ سلام اللہ علیہا نے۔

شعور ولایت کی تصدیق کس نے کی؟

لاشعور علی المرتضیٰ کرم اللہ وجہہ الکریم نے۔

شعور حیاء کی تصدیق کس نے کی؟

لاشعور ابن عفان رضی اللہ عنہ نے۔

شعور عدالت کی تصدیق کس نے کی؟

لاشعور ابن خطاب رضی اللہ عنہ نے۔

شعور صداقت کی تصدیق کس نے کی؟

لاشعور ابن ابی قحافہ رضی اللہ عنہ نے۔

شعور اللہ کی زمین پر تصدیق کس نے کی؟

لاشعور رسالت نے۔

شعور اچھا بتاؤ کہ رسالت کی تصدیق کس نے کی؟

لاشعور صدیق رضی اللہ عنہ نے، صدیق رضی اللہ عنہ نے، صدیق رضی اللہ عنہ نے۔

(یہ الفاظ تین مرتبہ دہرائے گئے جس سے مجھ پر وجد طاری ہوا، اور بے اختیار زبان حال سے یہ اشعار وارد ہوئے)

وہ عتیق بھی، رفیق بھی، شفیق بھی، صدیق بھی
اسی ''ق'' میں چھپے عشق نے اپنے صاحب کی تصدیق کی
اس وصف الٰہی صدیق کی اگر کسی نے تحقیق کی
تو معراج پر خود ''صدق'' نے اس تحقیق کی تصدیق کی

(مرتضٰی)

مندرجہ بالا کیفیت بلاشبہ اس حقیقت پر دلالت کرتی ہے کہ رب العزت نے اس کائنات کے وجود کی تخلیق کی تو آدم علیہ السلام کے ساتھ رسالت بھی پیدا کر دی اور اس کو اپنی صفت ہادی دے دی اور خود اس رسالت کی تصدیق کی اور ملائکہ اس تصدیق کے آگے سر بسجود ہو گئے۔ چونکہ اس وقت کوئی اور نہ تھا اس لئے تصدیق بھی اللہ نے خود ہی کی۔ لیکن پھر اس رسالت کا متضاد بھی پیدا کر دیا یعنی ''حماقت'' جو شیطان سے سرزد ہوئی اور اس کو اپنی صفت ''مذل'' دے دی۔ چنانچہ یہ تین حقیقتیں اس دنیا کے آغاز سے ہی پیوستہ ہیں۔ ''ہادی'' ہدایت کرنے والا ''مذل'' ذلیل کرنے والا اور ''صدیق'' تصدیق کرنے والا۔ چنانچہ جب بھی صفت ہادی رسالت کے روپ میں ظاہر ہوتی رہی، صفت مذلل کو لئے شیطان بھی بھیس بدل بدل کر ساتھ رہا اور حضرت انسان کو آخرت میں ذلیل کرنے کا سامان مہیا کرتا رہا۔

جیسا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے مدمقابل نمرود تھا، حضرت نوح علیہ السلام کے

مدمقابل ان کا اپنا ہی فرزند تھا، حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مدمقابل فرعون تھا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مدمقابل تھا اور جناب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مدمقابل ابوجہل تھا۔ لیکن گزشتہ تمام پیغمبروں کی رسالت کی تصدیق کے لئے اللہ رب العزت نے انہیں مختلف معجزات سے نوازا کہ جن کو وہ رسل کثرت سے استعمال میں لاتے اور اس طرح سے لوگ ان معجزات کو دیکھ کر ان کی رسالت کی تصدیق کرتے۔ پھر جب ہم رسالت محمدی صلی اللہ علیہ وسلم میں داخل ہوتے ہیں تو وہاں تصدیق کے لئے کوئی صفاتی معجزہ نہ تھا بلکہ حضرت محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ صفت اللہ کی جانب سے ابوبکر رضی اللہ عنہ کی صورت میں ملی۔ جیسا کہ آدم علیہ السلام کے وقت تصدیق خود اللہ نے کی تھی تو مجھے کہہ لینے دیجئے کہ جناب ابوبکر رضی اللہ عنہ کو بھی تصدیق کرنے کا حکم اللہ کی جانب سے تھا۔ کیونکہ یہ صفت الہامی تھی کہ جس نے اس ظاہریت میں اپنے اوپر ابوبکر رضی اللہ عنہ کا لبادہ اوڑھ لیا اور یوں ''صدیق اکبر'' کہلائے۔ اور اس طرح رسالت محمدی صلی اللہ علیہ وسلم بھی اپنی کاملیت کو پہنچتی ہے اور اسلام کل صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے احسانوں تلے دبا ہے۔ یہی وہ صفت تھی کہ جس نے باطل میں مدمقابل جا بجا رسالت کی تصدیق کی۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم معراج سے تشریف لائے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جبرائیل علیہ السلام سے فرمایا کہ میری معراج کی کون تصدیق کرے گا؟ تو حضرت جبرائیل علیہ السلام نے کہا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق، ابوبکر رضی اللہ عنہ کرے گا اور وہ صدیق ہے۔ قارئین کرام غور کیجئے اگر اس مقام پر حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے معراج کی تصدیق نہ کرتے تو کفار کے پاس حقیقت معراج کو جھٹلانے کی انتہائی مضبوط دلیل قائم ہو جاتی کہ دوست نے دوست کا اقرار نہ کیا تو ہم کیوں کریں۔ لیکن شائد رب العزت کی حکمت تھی کہ وہ جانتا تھا کہ ایک دن محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کو بھی ابوبکر رضی اللہ عنہ کی صداقت کا سہارا لینا پڑے گا۔ اسی بناء پر حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زبان وقلب پر اسم صدیق وارد کیا گیا کہ جس سے آپ کو سکون حاصل ہوا۔

جیسا کہ روایت کی حاکم نے مستدرک میں ترال بن میسرہ سے کہ ہم نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم سے کہا کہ اے امیر المومنین! ہمیں صفت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے خبر دیجئے تو حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم نے فرمایا۔

"ابوبکر رضی اللہ عنہ کا نام اللہ جل شانہ نے صدیق رکھا اور وارد کیا جبرائیل علیہ السلام اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان پر اور وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلیفہ تھے۔"

دار قطنی اور حاکم نے ابو یحیٰ سے روایت کی کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم نے بار بار منبر پر ذکر کیا۔

"تحقیق اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان پر ابوبکر رضی اللہ عنہ کا نام صدیق رکھا۔"

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے ابو یعلی اور ابن سعد اور حاکم نے روایت کی کہ آپ فرماتی ہیں۔

"میں کوٹھری میں تھی ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ رضی اللہ عنہم صحن میں تھے۔ بیچ میں پردہ پڑا ہوا تھا کہ اس وقت ابوبکر رضی اللہ عنہ آئے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس کو عتیق من النار کی طرف دیکھ کر خوشی ہو وہ دیکھے ابوبکر رضی اللہ عنہ کی طرف۔"

اب جبکہ آپ کا جنتی ہونا یقین ہو چکا ہے اور خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو جنت کی بشارت دی بلکہ جنتیوں کی ایک جماعت کا سردار بتایا اور جنت کے سب دروازوں سے ان کی پکار اور بلاوے کی خوشخبری دی تو یہ کہنے میں کچھ عار نہیں کہ

"صدیق رضی اللہ عنہ مع الحق وحق مع الصدیق رضی اللہ عنہ۔"

حضرات! جس کسی عاشق کا ذکر آتا ہے تو اس کے عشق کے ناپ تول کے لئے اس کی اپنے محبوب کے ساتھ رفاقت کا ذکر بھی فوراً ذہن میں آتا ہے۔ میں نے بہت سے عاشقوں

کا بغور تجزیہ کیا لیکن ایک مقام پر آ کر سب کا عشق جھوٹا نکلا۔ کیونکہ کسی کے عشق میں بھی مکمل رفاقت نہ تھی۔ میں نے خوشبو کو بہترین عاشق جانا لیکن وہ پھول کے مرجھانے کے بعد جاتی رہی، میں نے بھنورے کو دیکھا لیکن اس کا عشق بھی پھول میں موجود رس تک ہی تھا، میں نے ایک آدم کے عشق کو مثال بنانا چاہا تو وہ بھی اپنے محبوب کے حسن کے جوان رہنے تک رہا، پھر میں نے مشہور زمانہ عشق پروانے کے عشق کو انتہائے عشق قرار دینا چاہا تو وہ بولا کہ میرا عشق بھی روشنی تک ہے اور اگر میں اپنے عشق کی انتہاء کو چھولوں تو تب بھی مجھے فقط موت آ سکتی ہے۔ لیکن موت کے بعد کی رفاقت میں، میں بھی جھوٹا نکلا اور ہار گیا میں اس عاشق سے کہ اس کا عشق کیسا عشق ہے؟ اور وہ اپنے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کا کیسا رفیق ہے کہ جب اس کے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم پر نبوت آئی تو بنا دیکھے اور تحقیق کیے بغیر ہی ایمان لے آیا اور کچھ بھی نہ سوچا کہ جان پر کیا بنے گی۔ لیکن میں مر مٹا تو اس رفاقت کی انتہا پر کہ جب محبوب صلی اللہ علیہ وسلم نے سفر آخرت کیا تو وہ بھی ان کے پہلو میں پہنچ گیا کہ رفاقت کا حق ادا ہو سکے۔ تو میں کیا کروں اس عشق کا کہ میں نے اسے سمجھانے کی بہت کوشش کی لیکن وہ عشق خود بھی صدیق رضی اللہ عنہ کے عشق میں گرفتار ہو گیا۔

حضرت اقبال رحمتہ اللہ علیہ کیا خوب فرماتے ہیں

شیشہ دہر میں مانند مے ناب ہے عشق
روح خورشید ہے خون رگ مہتاب ہے عشق
دل ہر زرہ میں پوشیدہ کسک ہے اس کی
نور یہ وہ ہے کہ ہر شے میں جھلک ہے اس کی

جیسا کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے ترمذی میں روایت کی گئی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"اے ابوبکر! تو صاحب میرا غار میں اور صاحب میرا حوض پر ہے۔"

عموماً تصدیق عقل پر قائم ہوتی ہے لیکن ایسی تصدیق جلدی، ہی متضاد دلائل کے بل پر

رد بھی ہو سکتی ہے۔ لیکن جو تصدیق عشق کو بنیاد بناتی ہے تو اس کی پائیداری دلائل پر حاوی رہتی ہے۔ یہ کائنات اللہ عزوجل نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عشق میں تخلیق کی۔ لیکن دنیا میں بھی معراج عشق قائم کرنے کے لئے اس کو ظاہریت دینے کی ضرورت تھی کہ جو ہمہ وقت تکالیف اور آزمائشوں کے مقابلے میں آئینہ صداقت میں خود کو ثابت کرتی رہے۔

چنانچہ اس معراج عشق نے پہلے ابوبکری لبادہ اوڑھا اور پھر صدیقی لبادہ اوڑھا اور یوں پروانہ عشق کو بھی اپنے لئے کوئی مثال حاصل ہو سکی اور یہی وہ انتہاء عشق تھی کہ جس بناء پر جب عتبہ بن ربیعہ آپ کے سینے پر چڑھ کر بیٹھ گیا اور نو کیلے جوتے سے جناب صدیق رضی اللہ عنہ کے منہ اور پیٹ پر اس قدر ضربات پہنچائیں کہ وہ بے ہوش گئے اور جب آنکھیں کھولیں تو پہلی بات جو ان کی زبان پر آئی وہ یہ تھی "ما فعل برسول اللّٰہ" صلی اللہ علیہ وسلم (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کیا ہوا) اور کہا کہ میں اس وقت تک کچھ نہ کھاؤں گا اور نہ پیوں گا جب تک مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس نہ لے جایا گیا۔ پھر جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کی حالت زار دیکھی تو عشق کو اپنی منزل حاصل ہوئی۔

ابن کثیر کے الفاظ ہیں۔

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان سے لپٹ گئے ان کو چوما اور بہت سخت روئے۔"

اب میری کیا حیثیت کہ شہنشاہ طریقت کے عشق کو قلمبند کرنے کے لئے جنبش قلم دے بیٹھا یہ تو وہ ہیں کہ جن سے خود عشق اپنے معنی تلاش کرتا ہے اور جس کی صداقت کی بشارت خود اللہ تعالیٰ دے رہا ہے۔

> "اور وہ جو سچ لے کر تشریف لائے اور وہ جنہوں نے ان کی تصدیق کی یہی ڈر والے ہیں ان کے لئے ہے جو وہ چاہیں اپنے رب کے پاس کہ نیکیوں کا یہی صلہ ہے۔" (زمر:33-34)

تاریخ ادیان عالم بلکہ پوری تاریخ عالم کا مطالعہ کریں تو عشق و محبت کے مسحور کن نغمے مختلف افسانوں، داستانوں اور حکایتوں کی صورت میں دلوں کو گرماتے اور کانوں میں رس

گھولتے نظر آتے ہیں۔ عشق و محبت کی ان داستانوں کا مرکز و محور اگر ''حسن بتاں'' رہا ہے تو ایسے اہل دل بھی موجود ہیں جنہوں نے عشق مجازی کی دلدل سے نکل کر عشق حقیقی کی وادی میں قدم رکھا اور اپنے محبوب سے والہانہ وابستگی کی روشن مثالیں پیش کی ہیں۔ لیکن اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ عشق و محبت کا جو پاکیزہ مثالی اور متوازن تصور اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کامل وابستگی کی جو درخشندہ اور تابناک مثال اعلان رسالت کے مصدق اور آیت خلافت کے مخاطب اول سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے پیش کی ہے، پوری تاریخ انسانی اس کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے۔ یعنی کرہ ارض کا ربع سکون ایک غزالہ ہے جس کی ناف یعنی وسط آبادی مکہ معظّمہ ہے۔ اس ناف کے اندر مشک صدیقی ہے۔ تاریخ عدل اور اخلاقی اقدار کا، عقل اور عشق کا جب تک اس دنیا میں وجود ہے اس وقت تک اس مضمون کو جھٹلایا نہیں جاسکے گا۔ ہاں اس میں اتنا اضافہ کر لیجئے کہ اس مشک کی مشام نوازیاں اور عطر پیزیاں صرف صدقہ ہے اس عشق مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا جس کے بغیر دعویٰ اسلام ایک لاشۂ بے جان سے زیادہ کچھ نہ ہوتا۔

بہ مصطفیٰ برساں خویش را کہ دین ہمہ اوست
اگر باو نرسیدی تمام بو لہبی است

جناب صدیق رضی اللہ عنہ کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت اور وابستگی کی بناء پر عبادت میں بھی گہرا شغف ہو گیا تھا اور عبادت میں اس قدر سوز و گداز تھا کہ پتھر کو موم کر دے، تو ان لوگوں جن میں مشرک عورتیں اور بچے بھی شامل تھے کا م کیا حاصل ہوتا ہوگا؟ بخاری میں ہے کہ قریش نے یہ الفاظ کہے۔

''وہ (ابوبکر رضی اللہ عنہ) علی الاعلان قرآن حکیم کی تلاوت نہ کریں ہمیں خدشہ ہے کہ کہیں وہ ہماری عورتوں اور بچوں کو مسحور نہ کرے۔''

چنانچہ آپ نے اپنے گھر کے صحن میں ایک چھوٹی سی مسجد بنالی اور وہاں عبادت الٰہی انجام دینے لگے۔ لیکن بقول علامہ اقبال

جب سے آباد تیرا عشق ہوا سینے میں

نئے جوہر ہوئے پیدا میرے آئینے میں

لیکن اس کے باوجود بھی مشرکین اور بچے آپ کے قریب ہو جاتے اور آپ کی کیفیت کو بنظر تعجب دیکھتے اور آپ کو دیکھتے رہتے۔ جس پر مشرکین آپ کو مزید اذیتیں دیتے۔ لیکن عشق بھی کبھی مصلحت کوش ہوا ہے؟ انہیں ایسی قدغن کب راس آسکتی تھی۔

بقول حضرت اقبال رحمۃ اللہ علیہ

بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق

دوسری جانب عشق صدیق رضی اللہ عنہ نہ صرف آتش نمرود میں کود کر خود کو جانی آزمائش میں سرخرو کرتا ہے۔ بلکہ زر وجاہ بھی اس کے عشق حقیقی کی چکاچوند میں ماند پڑ جاتا ہے۔

جیسا کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"کسی کے مال نے مجھ کو ایسا نفع نہ دیا کہ جیسا نفع مجھ کو ابوبکر رضی اللہ عنہ کے مال نے دیا۔"

اور جیسا کہ اس آیۃ کریمہ سے ثابت ہے۔

وَوَجَدَكَ عَآئِلًا فَاَغْنٰى

"(یعنی) پایا تجھ کو فقیر پس غنی کیا ہم نے"۔ (والضحیٰ:8)

اس ضمن میں یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کا مال بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بہت کام آیا اور ان کو نفع پہنچایا۔ لیکن حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کا مال قبل نبوت، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کام آیا اور خوراک میں، پوشاک میں اور امورات خیر میں مفید ثابت ہوا۔ کیونکہ نبوت سے پندرہ برس پہلے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے نکاح اور آٹھ برس بعد نبوت کے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کا وصال ہوا۔ لیکن جناب صدیق رضی اللہ عنہ کا مال سب کا سب نبوت کے بعد خرچ ہوا اور مدد مسلمان اور مدد

اسلام میں صرف ہوااور جناب رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی خوشنودی میں خرچ ہوا۔ جب کل مال حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کا فی سبیل اللہ خرچ ہو گیا اور یہاں تک کہ بدن کے کپڑے بھی راہ مولیٰ دے دیئے تو ایک کمبل کا ٹکڑا، بجائے کرتہ کے، گلے میں ڈالا اور کانٹوں سے دونوں طرف سے بند کر کے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت بے ملال اور بے خیال (جیسے ہر وقت حاضر باش تھے) حاضر ہوئے۔ چنانچہ حضرت جبرائیل علیہ السلام نازل ہوئے اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ آج ابوبکر رضی اللہ عنہ کا کیا حال ہے اور کیسا لباس ہے؟ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا! انہوں نے تمام مال رضا مندی اللہ جل شانہ میں صرف کر دیا اور مفلس ہو گئے کہ یہ نوبت پہنچی۔ جبرائیل علیہ السلام نے حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ حق تعالیٰ نے ابوبکر رضی اللہ عنہ کو سلام فرمایا اور فرمایا ہے کہ اس مفلسی اور مصیبت میں بھی تو ہم سے راضی ہے یا کچھ کدورت دل میں ہے۔ جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ حال ابوبکر رضی اللہ عنہ کو سنایا تو وہ شوق سے وجد میں آئے اور اس نغمہ کو بار بار پکار کر کہتے تھے۔

انا عن ربی راضٍ انا ربی راضٍ (روح البیان)

"(یعنی) میں اپنے رب سے راضی ہوں میں اپنے رب سے راضی ہوں"۔

جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے۔

وَمَا لِاَحَدٍ عِنْدَهٗ مِنْ نِّعْمَةٍ تُجْزٰۤى اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْاَعْلٰى ۚ وَلَسَوْفَ يَرْضٰى

"(یعنی) اور کسی کا اس پر کچھ احسان نہیں جس کا بدلہ دیا جائے گا۔ (یعنی) صرف اپنے رب کی رضا چاہتا ہے جو سب سے بلند ہے۔ (یعنی) اور قریب ہے کہ وہ راضی ہوگا"۔ (الیل:19-21)

یعنی راضی تو اب بھی ہے مگر ظہور رضا کا قریب ہے کہ وہ قیامت کے دن ہوگا۔ یہ ترجمہ روح البیان سے لکھا گیا ہے۔ اس کے علاوہ تفسیر کبیر اور کم وبیش تمام تفاسیر کا اتفاق ہے کہ یہ

آیتیں حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کی شان میں نازل ہوئیں۔

اب ہم جس مقام پر آن کھڑے ہوئے ہیں ان کو نام تو ''ہجرت مدینہ'' کا دیا جاتا ہے لیکن یہ وہ مقام ہے کہ جہاں پر عشق صدیق رضی اللہ عنہ مزید نکھر کر اپنی انتہاء منزل کو چھو لیتا ہے۔ یہ وہ مقام ہے کہ جہاں پر تاریخ اسلام کا ایک نیا، روشن و تابندہ باب کھلتا ہے۔ مفسرین نے اس کو اپنے علم کے اظہار کا ذریعہ بنایا۔ عاشقوں نے اس کے حقائق کو اپنی انتہاء منزل قرار دیا۔ سلسلہ طریقت میں اولیائے کرام نے اس کو ادب شیخ سے تعبیر کیا اور مقصود حقیقی کو پانے کا بہترین ذریعہ جانا، اہل جستجو نے اس کو حصول منزل کی بہترین مثال قرار دیا، مقررین نے اس واقعہ کی خوبصورتی سے اپنے الفاظ کو مزید کیا، شعراء نے اس کے مختلف پہلوؤں کو اپنے اشعار کی لڑیوں میں پرویا، نعت خواں حضرات نے اس سے اپنی نعت ومنقبت میں سوز پیدا کیا، منزل جہاد کے غازیوں نے اس کو مثال بنا کر مال و جان سے جہاد کیا غرضیکہ ہر کسی نے اس کو اپنے لئے مثال ٹھہرایا۔ اور پھر یہ وہ مقام ہے کہ جہاں پر قدرت، رسالت اور صداقت اکٹھی نظر آئی۔ سفر کے دوران جناب صدیق رضی اللہ عنہ کی حالت عشق ایسی تھی کہ کبھی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے چلتے اور کبھی آگے، کبھی دائیں اور کبھی بائیں کہ سب طرف کی خبر رکھ سکیں۔ جب کانٹوں سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاؤں کو صدمہ پہنچنے لگا تو حضرت صدیق رضی اللہ عنہ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے کندوں پر بٹھا لیا اور اپنی ایذا کا بھی خیال نہ کیا۔ (المواہب اللدنیہ ومدارج النبوۃ)

حضرت! یہاں پر بھی ایک مرتبہ پھر سے نبوت کو صداقت کا سہارا لینا پڑا اور صداقت نبوت کو کندھوں پر اٹھائے دوڑی چلی جاتی ہے۔ بھلا جس کے نصیب میں یہ مرتبہ ہو کہ محبوب خدا اس کا محبوب ہو اور وہ اس کے ساتھ تنہا ہو۔ گھر بار کو جواب دے، بال بچوں کو تنہا دشمنوں میں چھوڑ دے اور پھر طرہ یہ کہ محبوب کو وہ اپنے کندھے پر بٹھائے لے جاتا ہو۔ اس کا صلہ انہیں اس آیت کریمہ کی صورت میں ملا۔

''تم میں برابر نہیں وہ جنہوں نے فتح مکہ سے قبل خرچ کیا اور جہاد کیا۔ وہ مرتبہ

میں ان سے بڑے ہیں جنہوں نے بعد فتح مکہ کے خرچ اور جہاد کیا اور ان سب سے اللہ جنت کا وعدہ فرما چکا اور اللہ کو تمہارے کاموں کی خبر ہے۔ کون ہے جو اللہ کو قرض دے اچھا قرض تو وہ اس کیلئے دوگنے کرے اور اس کو عزت وثواب ہے۔" (حدید:10-11)

اب ایک مرتبہ پھر سے عشق صدیق اپنی معراج کامل کو اس غار میں حاصل کرتا ہے کہ جس بناء پر ان کو "یارغار" کا لقب بحوالہ قرآن عطا ہوا۔

"بے شک اللہ نے ان کی مدد فرمائی جب کافروں کی شرارت سے انہیں باہر تشریف لے جانا ہوا۔ صرف دو جان سے جب وہ دونوں غار میں تھے۔ جب اپنے یار سے فرماتے تھے غم نہ کھا۔ بے شک اللہ ہمارے ساتھ ہے تو اللہ نے اس پر اپنا سکینہ اتارا۔" (توبہ:40)

محدث بیہقی نے تو یہ لکھا ہے کہ اس سوراخ میں سے کسی سانپ نے ابوبکر رضی اللہ عنہ کی ایڑی پر کئی بار ڈسا۔ شدید تکلیف سے ابوبکر رضی اللہ عنہ کی آنکھیں بہنے لگیں تھیں مگر انہوں نے اپنی ایڑی سوراخ سے نہ ہٹائی اور یہ اس خوف سے دم نہ مارتے تھے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نیند میں حرج نہ ہو۔ کیونکہ اس وقت صداقت ایک مرتبہ پھر نبوت کو اپنی آغوش میں لئے ہوئے تھی۔ لیکن اس تکلیف سے آنسوان کے چہرہ پر رواں تھے۔ ایک قطرہ آنسو کا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرہ مبارک پر پڑا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم بیدار ہو گئے اور ان کا حال پوچھا اور پھر فرمایا! غم مت کھا، بے شک اللہ تعالیٰ ہمارے ساتھ ہے۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لعاب دہن ان کی ایڑی پر لگایا تو تکلیف فوراً رفع ہوگئی۔ (دلائل النبوۃ)

اے بھائی! دیکھ تو سہی اس مقام کو کہ کس کا لعاب دہن اور کیسے ہاتھ سے کس کی ایڑی کو لگ رہا ہے۔ لیکن پھر بھی خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے کچھ حیاء باقی نہیں جو اس کے عشق پر شک کرتے ہو کہ جس کا بار نہ زمین اٹھا سکے نہ آسمان۔ جناب صدیق رضی اللہ عنہ نے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی خاطر ان تین راتوں میں بڑی تکلیف برداشت کی۔ لیکن

عشق و محبت کی ایک ان مٹ تاریخ رقم کر دی۔ اس سلسلے میں نہ صرف اکیلے موردالزام ہوئے بلکہ اپنے جوان بیٹے عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ اور جوان بیٹی اسماء رضی اللہ عنہا کو بھی ان میں مبتلا کیا۔ ایک طرف پوری قوم تھی، پورے قبائل اور پورے قریش تھے اور دوسری طرف ابوبکر رضی اللہ عنہ کا مختصر گھرانہ۔ بلاشبہ ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اس جنگ میں ہتھیار نہیں اٹھائے تھے کہ یہ لڑائی ہتھیاروں سے لڑی نہیں جاسکتی تھی۔ اس میں محض رازداری، دانائی، حزم واحتیاط اور صبر وقناعت کی ضرورت تھی۔ اور ابوبکر رضی اللہ عنہ اور ان کے مختصر خاندان نے یہ سارے ہنر خوب آزمائے، پوری رازداری برتی۔ قریش کی ساری فوج اور ان کے سارے قبائل یہ جان نہیں سکتے تھے کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ کے اس مختصر خاندان نے انہیں کیسی کامیاب اور غیر معمولی شکست عطا کی تھی۔ لطف کی بات یہ ہے کہ قریش میں سے کوئی آخر وقت تک یہ جان نہ سکا تھا کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ کا نقشہ جنگ کیا ہے۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے یار کی یاری کا صلہ ان الفاظ میں دیا۔

"اے ابوبکر رضی اللہ عنہ! قیامت کے دن تجلی اللہ کی عام ہوگی اور تیرے واسطے خاص۔" (روح البیان، تفسیر کبیر)

پھر جب غار میں حضرت صدیق رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مجھے پیاس کی شدت محسوس ہو رہی ہے تو آپ نے فرمایا! تو جا غار کے بیچ میں اور پانی پی لے۔ پس جب یہ غار کے وسط میں گئے اور پانی پیا تو شہد سے میٹھا، دودھ سے سفید اور مشک سے زیادہ خوشبودار۔ تو جب ابوبکر رضی اللہ عنہ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کے متعلق دریافت کیا تو آپ نے فرمایا۔

"اللہ تعالیٰ نے فرشتہ کو حکم کیا کہ جنت کی نہر میں سے پانی کا چشمہ غار میں لادے کہ تو پی لے اے ابوبکر رضی اللہ عنہ۔"

عرض کیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم، اللہ تعالیٰ کے ہاں میرا یہ مرتبہ ہے تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

''ہاں اوراس سے بھی افضل۔''

''فانزل اللہ سکینۃ علیہ'' (تفسیر کبیر، تفسیر روح البیان)

پھر جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال ہوتا ہے تو اگر چہ آپ اپنے ظاہر کو امت مسلمہ کے بلند حوصلہ کی خاطر چاک و چوبند رکھتے تھے لیکن آپ کا دل ہمہ وقت حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے غم میں روتا رہتا اور جب آپ تنہائی میں ہوتے تو بعض مرثیے بھی پڑھتے کہ جن سے اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرتے تھے۔

ابن سعد نے بعض مرثیے نقل کیے ہیں

فلیت الممات لنا کلنا

و کنا جمعیًا مع المھتدی

(یعنی) اے کاش ہم سب کو موت آجاتی اور ہم سب اپنے پیرو مرشد کے ساتھ موت کے دامن میں سو جاتے۔

ایک دوسرے مرثیے کا یہ شعر بڑا ہی غمناک ہے

لیت القیامہ قامت بعد مھلکہ

و لا نری بعدہ مالا و لا ولد

(یعنی) اے کاش آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال پاتے ہی دنیا ختم ہو جاتی اور قیامت آجاتی اور ہم اس کے بعد نہ کسی شے کو دیکھتے اور نہ اولاد ہی پر ہماری نگاہ اٹھتی)۔

پھر جب یہ عاشق بے مثل اپنے محبوب کی رفاقت کو ایک بار پھر سے حاصل کرنے کے لئے اس دنیا فانی سے کوچ کرتا ہے تو وصال سے قبل یہ وصیت کر دیتا ہے کہ میرے جنازہ کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے روضہ مبارک کے قریب رکھ دینا اور کہنا:

''السلام علیک یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، یہ ابوبکر رضی اللہ عنہ ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی چوکھٹ پر حاضر ہوا۔''

اگر دروازہ کھل جائے تو اندر رکھنا ورنہ بقیع میں دفن کرنا۔ جب وقت آنے پر اسی طرح کیا گیا تو ابھی کلمات تمام نہ ہوئے تھے کہ پردہ دور ہوا اور آواز آئی، جیسا کہ شواہد النبوۃ میں لکھا ہے۔

''لاؤ حبیب کو حبیب کی طرف۔''

اور اس طرح سے ایک مرتبہ پھر صداقت، نبوت کے پہلو میں لپٹ گئی، ابد تک کے لئے۔

آئینہ تاریخ اسلامی سے جناب صدیق رضی اللہ عنہ کے فضائل کی عکس بندی کرتے ہوئے ایک ایسی خصوصیت کا حصول ممکن ہوتا ہے کہ جو منفرد بھی ہے اور عجیب وغریب بھی اور حقیقی معنوں میں وہ خصوصیت آپ کی ذات کے لئے ہی ممکن ہوئی اور وہ ''عشق وعقل کا متوازن امتزاج'' ہے کہ جس میں بال برابر فرق بھی دکھائی نہیں دیتا۔ ایک محبِّ صادق اور محبوب کا محبوب ہونے کے باوجود آپ کے عشق میں سکر نہیں ''صحو'' تھا۔ افراط نہ تھا اعتدال اور توازن تھا۔ آپ عشق سے مدہوش نہیں ہوئے تھے، بلکہ بقول علامہ اقبال رحمتہ اللہ علیہ

ہوش کا دارو ہے گویا مستی تسنیم عشق

عام قاعدہ ہے کہ جب اشب عشق کی لگام ڈھیلی ہوتی ہے تو شہسوار عقل کو نیچے گرا کر خود آگے نکل جانے میں اسے تامل نہیں ہوتا اور عقل لگام کستی ہے تو عشق بے جان ہو کر اس کا ساتھ چھوڑنے لگتا ہے۔ عقل و عشق کا معاملہ ہی کچھ ایسا ہے کہ ایک پلہ جہاں جھکا دوسرا ہی ہلکا ہو کر اٹھ گیا، یا اسے یوں کہہ لیجئے کہ دلیری اور قاہری مشکل ہی سے ایک جگہ جمع ہو سکتی ہیں۔ اگر جمع ہو بھی جائیں تو، توازن ہر آن برقرار نہیں رہتا۔ لیکن ایک دیدہ ور مورخ کی نگاہ تجسس ہمیشہ یہ فیصلہ کرنے میں حیران رہے گی کہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے کس پہلو کو ترجیح دی جائے؟ عشق کو یا عقل کو؟ قاہری کو یا دلیری کو؟ حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کی پوری زندگی میں ایک مرحلہ بھی ایسا نظر نہیں آتا جہاں غلبہ عشق نے عقل کا ساتھ چھوڑ دیا ہو یا دلیری پر قاہری غالب آ گئی ہو۔ جناب صدیق رضی اللہ عنہ نے عشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم

کی لاثانی مثال پیش کر کے عالم انسانیت کو لافانی سبق دیا ہے کہ عشق و محبت کا تقاضا یہ نہیں کہ بھگوان بھگتی میں بھگت اس قدر محو اور منہمک ہو جائے کہ دنیا و مافیہا کو فراموش کر دے اور محبت کا افیونی بن کر رہ جائے۔ بلکہ عشق وہ مے ہے جو بے ہوش کرنے کی بجائے ہوش میں لے آئے۔ قوت عمل مہمیز لگائے، ذہن جلا بخشے۔ انسان نہ تو مغربیوں کی طرح جذبہ عشق سے عاری مادیت اور عقل پسندی کا غلام بن کر رہ جائے اور نہ مشرقیوں کی طرح ترک دنیا اور بیراگ کی طرف مائل ہو جائے۔ بلکہ اس کارگہ حیات میں مثبت، فعال اور مؤثر اور بھرپور کردار ادا کرے۔ مئے عشق اسے بے خود نہ کرے بلکہ اس کی خودی کو اس قدر مضبوط کرے کہ ممولے کو شہباز سے لڑا دے۔ وہ ظاہری چمک دمک اور طاقت کا توازن نہ دیکھے۔ بلکہ ہر حال میں اصول کے توازن کو قائم رکھے۔

یہ وہ انسان ہے جسے خلیفہ بلا فصل حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں۔ اس کی دانائی و عقل، اس کی سیاست و جہاں بانی، اس کی بے نفسی و استغناء، اس کا ایثار و قربانی، اس کی دینی و ملکی خدمات، اس کی اخلاقی زندگی، اس کا صدق و صفا، حیاء و وفا، اس کا ایمان اور عشق مصطفوی صلی اللہ علیہ وسلم سب کچھ آپ کے سامنے ہے اور تاریخ کے سینے میں محفوظ ہے اور قیامت تک محفوظ رہے گا۔ اپنے دل سے پوچھئے کہ اسلام اور کس چیز کا نام ہے؟ اور ایک سچے مسلمان کی زندگی اس کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے؟ اس امت میں اگر سچی اسلامی زندگی کا کوئی بہتر سے بہتر نمونہ پیش کیا جا سکتا ہے تو وہ جناب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ ہی کی زندگی ہے۔

ہمت او کشت ملت را چو ابر
ثانی اسلام و غار و بدر و قبر

(اقبال)

Von Kremer اپنی مشہور کتاب The Orient Under Caliphs میں حضرت سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی سیرت و کردار پر یوں روشنی ڈالتے ہیں۔

(ترجمہ) ''ابوبکر رضی اللہ عنہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد خلیفہ بنے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سفیر کی حیثیت سے ان کو نظام اسلامی میں اگرچہ وسیع اختیارات حاصل تھے۔ لیکن ان کی طرز زندگی اور رہن سہن میں کسی قسم کی تبدیلی نہ ہوئی اور آپ پرانے عرب تمدن پر قائم رہے۔ وہ مدینہ سے باہر ''سخ'' نامی ایک چھوٹے سے قصبے میں ایک بدوی شیخ کی مانند اونٹ کی کھال سے بنے ہوئے خیمے میں اہل وعیال سمیت زندگی بسر کرتے تھے۔ خلافت کے ابتدائی ایام میں سات ماہ تک آپ ہر روز پیدل یا گھوڑے پر سوار ہو کر مدینہ آتے اور فجر کی نماز مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں باجماعت ادا کرتے اور مغرب کی نماز ادا کر کے گھر واپس لوٹتے۔ سات ماہ کے بعد آپ نے مدینہ میں سکونت اختیار کر لی۔ مگر اب بھی آپ کی زندگی میں کوئی تبدیلی نہ آئی۔ بڑی سادہ زندگی تھی صرف ایک غلام تھا جو گھر کا کام کاج بھی کرتا اور فالتو وقت میں اپنے آقا کے اسلحہ کو تیز کرتا اور کارآمد رکھتا۔''

مشہور متعصب یورپین مؤرخ Sir Wiliam Mair اپنی کتاب The Calihpte, Its rise, Decline, Fall میں لکھتے ہیں۔

''ابوبکر رضی اللہ عنہ کو قلب و ذہن میں شخصی جاہ وحشمت کا خیال تک نہ تھا۔ حالانکہ وہ شاہانہ خیالات کے مالک تھے اور کسی کے سامنے جواب دہ نہ تھے۔ انہوں نے اپنی ساری طاقت صرف خدمت اسلام اور اس کی ترقی و برتری میں صرف کی۔ تاکہ ملت اسلامیہ کو فائدہ ہو۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ کی کامیابی کا سب سے بڑا راز محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر کامل ایمان وایقان تھا''۔

آپ نے عوام سے ہمیشہ یہی کہا کہ مجھے اللہ کا خلیفہ کہہ کر نہ پکارو، میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خلیفہ ہوں۔ ہر معاملے میں ابوبکر رضی اللہ عنہ یہی دیکھا کرتے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کیا طریق، عمل یا ارشاد تھا۔ آپ نے تمام عمر اس سے سرمو انحراف نہیں

کیا۔ یہی وجہ ہے کہ آپ نے تمام مخالفتوں اور شورشوں کو فرو کر کے اسلام کی بنیادوں کو مزید مستحکم کیا۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ کا زمانہ خلافت اگرچہ بہت ہی مختصر تھا لیکن بلاشبہ کہا جا سکتا ہے کہ مسلمانوں میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی فرد ایسا نہیں ہوا جو ایمان و عمل میں ابوبکر رضی اللہ عنہ سے افضل ہو۔"

باب سوئم

حقیقت نفس اور تزکیہ نفس

مفہوم نفس

قرآن مجید فرقان حمید میں ارشاد ہوتا ہے۔

''ہر ذی نفس کو موت کا مزہ چکھنا ہے۔'' (العنکبوت:57)

لیکن بعض مفسرین نے اس آیت کریمہ کے ترجمے کو کچھ اس انداز سے پیش کیا ہے کہ ''ہر ذی جان کو موت کا مزہ چکھنا ہے۔'' بظاہر تو ان دونوں تراجم میں کوئی خاص فرق نمایاں نہیں ہے۔ لیکن مختلف مفسرین کرام کا جس لفظ پر اختلاف ہے وہ ''نفس'' ہے۔ بعض نے اس کا ترجمہ نفس کیا ہے اور بعض نے اس کو جان (اور جان سے مراد وہ روح لیتے ہیں) سے تعبیر کیا ہے۔ ماضی کے مفسرین کرام جن میں حضرت مجدد الف ثانی، حضرت شاہ ولی اللہ اور حضرت بو علی سینا رحمۃ اللہ علیہم زیادہ نمایاں ہیں۔ وہ اس بات پر متفق ہیں کہ چونکہ انسان کا نفس اس کی حیات تک باقی رہتا ہے اور موت کے بعد وہ بھی فانی ہے اور اس کی کچھ حقیقت باقی نہیں رہتی اس لئے موت کا مزہ بھی انسان کا نفس چکھتا ہے، روح نہیں۔ نفس اور روح سے متعلق ان نظریات نے دو جماعتوں کو جنم دیا کہ جنہوں نے اپنے اپنے عقائد کو ان نظریات کے مطابق ڈھال لیا یا یوں کہہ لیجئے کہ عرصہ دراز بیت جانے کے بعد ابھرنے والی ایک جماعت کو اپنے نظریات بدلنے کا خیال آیا۔ ان میں پہلی جماعت وہ ہے کہ جو انسان کی ظاہری زندگی اور موت کے لئے ''نفس'' کو منتخب کرتی ہے اور یہ بعد میں ابھرنے والی دوسری جماعت ہے کہ مندرجہ بالا آیت کی تشریح میں نفس کی بجائے ''روح یا جان'' کا لفظ استعمال کرتی ہے۔ پہلی جماعت کے علماء کرام کے عقائد کے تحت انسانی روح اس دنیاوی زندگی میں ایک بشر کو اپنے لئے توشہ آخرت جمع کرنے کے لئے ایک جسم فراہم کرتی ہے اور انسان کا نفس اس ضمن میں روح کی تقویت یا تحریف کا باعث بنتا ہے۔

جیسا کہ حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ اپنے مکتوب نمبر ۱۵ میں اپنے مرشد بزرگوار کو لکھتے ہوئے فرماتے ہیں۔

"روح کے نفس سے نجات پا جانے اور اطمینان کے بعد نفس کے نکل جانے کے باوجود غالب آنے والے انوار سے اس کی روح کو روح و نفس دونوں جہتوں کا جامع کر دیا گیا اور ان دونوں کو برزخیت اور واسطے سے مشرف کر دیا گیا ہے۔ اوپر کی طرف سے فائدہ حاصل کرنے اور نیچے والوں کو فائدہ پہنچانے والا۔ اس واسطہ برزخیت کے حصول کی وجہ سے مجھے اوپر سے فیض لینے اور نیچے والوں کو فائدہ پہنچانے کا مرتبہ بھی عطا کر دیا گیا ہے۔ عین فائدہ حاصل کرنے کی حالت میں فائدہ پہنچا بھی رہا ہے اور عین فائدہ پہنچانے کی حالت میں استفادہ بھی کر رہا ہے۔"

اس کی مثال ہم اس طرح سے بھی دے سکتے ہیں کہ اگر آپ غبارے کی بناوٹ کو روح تسلیم کر لیں اور اس میں بھری جانے والی ہوا کو توشہ آخرت تو جس کی مدد سے یہ ہوا غبارے میں بھری جائے گی وہ نفس سے مطابقت رکھتی ہے۔ اب اگر اس ضمن میں کوشش زیادہ کرے تو وہ مختصر وقت (انسانی زندگی) میں ہوا زیادہ بھر سکے گا اور غبارے (روح) کی تقویت کا باعث بنے گا۔ اگر ہوا صاف اور ہلکی ہوگی تو غبارہ ہوا کے دوش پر اپنی اٹھان لے گا لیکن ہوا بھاری اور گدلی ہوگی تو غبارے کو اپنے مقصد کے مطابق ہوا میں اڑنا مشکل ہوگا۔ اسی طرح اگر انسان کے توشہ آخرت میں اعمال صالح ہوں گے تو روح کی تقویت کا باعث بنیں گے اور آزمائش اور تکمیل مقصد حیات کی آہن گھڑی آسان ہوگی۔ لیکن اگر توشہ آخرت میں گدلی ہوا کی مانند زمانے کی دنیاوی اور نفسانی خواہشات شامل ہوں گی تو آزمائش کی گھڑی سے گزرنا کٹھن ہوگا۔ اگر ہم ایک بار پھر سے مندرجہ بالا جماعتوں کے نظریات کی جانب متوجہ ہوں تو پہلی جماعت اپنے عقیدے پر قائم نظر آتی ہے۔ کیونکہ ان کے مطابق فیض کا حصول موت سے قبل بھی ہے اور بعد میں بھی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ "حصول فیض" روح کا

کام ہے اور روح باقی رہنے والی ہے۔

جیسا کہ خطیب الاسلام حضرت صاحبزادہ سید فیض الحسن شاہ آلومہاروی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

''ایک ولی کامل اپنی حیات ظاہری حیات میں ایسے ہے جیسے ایک تلوار میان کے اندر ہے اور جب وہ حیات ابدی کی جانب جاتا ہے تو وہ ایسے ہے جیسے تلوار میان سے باہر۔''

اگر ہم اس ضمن میں دوسری ابھرنے والی جماعت کے نظریات کا مطالعہ کریں تو اس ایک لفظ کی تفسیر (یعنی نفس کی بجائے روح کو ذائقۃ الموت کے لئے منتخب کرنا) سے پیدا ہونے والی صورتحال کی وجہ سے پورے عقیدے کو اپنی تشریح واضح کرنی پڑ جاتی ہے اگر وہ روح کی موت کی بات کرتے ہیں تو پھر وہ کون سا جسم ہے کہ جس میں اپنے اعمال کو ذخیرہ کر کے رخت سفر باندھیں گے اور سفر بذات خود زندگی کی علامت ہے مردہ پن کی نہیں۔ انسان کا دماغ وعقل مٹی میں مل کر مٹی ہو جاتا ہے لیکن اس کی سوچ کے نتائج زندہ رہتے ہیں اور یہی سوچ اس کے لئے آخرت میں جزا اور سزا کا باعث بنتی ہے۔ یہ نتائج انسانی اور عقائد، روح کا زیور ہوتے ہیں نہ کہ اس کے نفس کا۔ کیونکہ نفس کا مقصد فقط سوچ اور عقائد سے روح کو تقویت دینا ہے۔

بحوالۂ دین وفطرت

اپنے وجود سے رنگ و بوحق کو نمایاں کرنے کی خاطر سب سے اہم عنصر آزمائش اور امتحان میں اپنے نفس پر صبر کرنا ہے۔ یہاں پر آزمائش ایک بھٹی کی مانند ہے کہ جس کی تپش وسوز صبر سے مترادف ہے۔ یہ اسی طرح ہے کہ جس طرح کسی اینٹ کی پختگی کا انحصار اس مدت پر ہے کہ جو وہ بھٹی کی تپش میں گزارتی ہے یا پھر اس سونے کی مانند ہے کہ جس کی اصل حقیقت سنیار کی بھٹی میں سرخ ہو کر عیاں ہوتی ہے اور یہ قدر و قیمت فقط اس وقت نکھرتی ہے کہ جب ان آزمائشوں کا سوز، باطن محسوس کرتا ہے۔ ورنہ اگر فقط تابنے یا

چاندی پر سونے کا پانی چڑھا دیا جائے اور اینٹ کو فقط اوپر سے سرخ کر دیا جائے تو زمانے کی تغیرات ان کے باطن میں چھپی ناپختگی کو واضح کر دیتے ہیں یا یوں کہہ لیجئے کہ جس طرح ایک بیج ہو جو مدت تک زمین کی حرارت کو برداشت کرتا ہے اور پھر زمین کے سینے کو چیرنے کی تگ ودو کرتا ہے اور پھر بھی ابھی وقت آہن جاری ہے اور وہ ننھا پودا سال بھر کے چار موسوں کو برداشت کرتا ہے۔ کبھی چلچلاتی دھوپ میں جلتا ہے تو کبھی سرد و برفانی ہوائیں اس کو زعفرانی رنگ پہنا دیتی ہیں اور پھر کبھی برسات کی شدت میں غوطے بھی کھاتا ہے۔ پھر کہیں جا کر بہار اس میں زندگی کی رمق پیدا کرتی ہے اور یہ سلسلہ سال ہا سال تک یونہی جاری رہتا ہے۔ لیکن وہ پودا ان موسمی مصائب وتغیرات میں صبر کا مظاہرہ کرتا ہے اور پھر ایک وقت آتا ہے کہ جب وہ تنا آور درخت بنتا ہے اور میٹھا میوہ دیتا ہے اور آزمائش میں جس قدر صبر کیا ہوگا اس قدر میوہ میٹھا ہوگا۔

جیسا کہ سورۂ بقرہ میں ہے۔

وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ (بقرہ:155)

چنانچہ یہی وہ نظام فطرت ہے کہ جو انسان کی دین میں بھی رہنمائی کرتا ہے۔ جس طرح سے آب وابر ظاہری ہے اسی طرح سے آب وابر غیب بھی ہے۔ جس طرح ظاہر کا آسمان و آفتاب ہے اسی طرح باطن کا بھی ہے۔ لیکن فرق فقط یہ ہے کہ یہ باطن فقط خاصوں پر عیاں ہوتا ہے اور جو ان خاصوں کے سواء ہیں تو وہ اس آیت کے مصداق ہیں۔

بَلْ هُمْ فِيْ لَبْسٍ مِّنْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ (قٓ:15)

"(یعنی) وہ پوشیدگی میں ہیں مخلوق جدید سے"۔

یہاں مخلوق جدید سے مراد عوام ہیں جن کے پیچھے تجدد امثال لگا ہوا ہے کہ ہر وقت مرتے جیتے ہیں۔ لب لباب اس کا یہی ہے کہ جس طرح بہار سے باغ خرم وتازہ ہو جاتا ہے ایسے ہی ابدال کا دم ہے کہ اس سے دل و جان میں سبزہ جمتا ہے اور شگفتہ وشاداب ہو جاتا ہے اور جو کام باد بہاری درخت کے ساتھ کرتا ہے وہی کام ان کے انفاس نیک بختوں کے

ساتھ کرتے ہیں۔ لیکن اگر کوئی درخت خود ہی خشک مکاں میں رہنا پسند کرتا ہو تو وہ یہ جان لے کہ یہ اس باد بہار سے غائب رہا اور باد بہار آئی اور چلی بھی گئی۔ لیکن وہ بے خبر و مردہ پڑا رہا اور جس میں جان تھی تو اس کو پھل دار و پھول دار کر دیا۔ بس افسوس ہے اس جان پر کہ جو اس ذات کو محسوس نہیں کرتی اور اپنے باطن سے بوئے حق کو نہیں سونگھ سکتی اور فقط ظاہری رمق و دمک سے دھوکہ کھاتی رہی۔

انسانی نفس کہ جس کی یہ فطرت ہے کہ اس کو بنانا یا بگاڑنا خدائے رب العزت نے انسان کے اپنے اختیار میں دیا ہے۔ اس کی یہ خاصیت ہے کہ اس میں نیکی و بھلائی کی مقابلے میں ہر بری چیز کے لئے کشش پیدا کر دی گئی اور انسان کو اس آزمائش اور امتحان کی طرف مدعو کیا گیا ہے۔ پھر اس میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے ایک عنصر کی بھی نشاندہی کر دی گئی ہے کہ جس کو تقویٰ کا نام دیا گیا ہے۔ تقویٰ کی فضیلت کو بیان کرتے ہوئے اللہ رب العزت نے کامیاب لوگوں کی نشاندہی بھی فرما دی ہے۔

فرمان الٰہی ہے:

''اللہ کے نزدیک وہی عزت والا ہے جو زیادہ متقی اور پرہیز گار ہے۔''

(الحجرات:13)

نفس کی حقیقت کی مزید پڑتال کے لئے واضح کر دوں کہ نفس کی پختگی کے لئے اللہ رب العزت نے اسے بے شمار آزمائشوں سے عبارت کر دیا ہے۔ فطرت کائنات کو دیکھیں کہ جہاں اس نے جمادات و نباتات پیدا کئے تو ان میں نفس کی کسی صورت کا احساس نظر نہیں آتا۔ اس لئے اللہ نے ان تخلیقات کی ذمہ داری اپنے ذمے رکھی کہ میں خود ہی زمانے کے مطابق زمین پر ان کی تعداد متعین کروں گا۔ حیوانات کی طرف دیکھیں تو اللہ نے ان کو کچھ سوچنے، سمجھنے کی طاقت دی کہ وہ یہ اندازہ لگا سکیں کہ ان کو کیا کھانا ہے اور کیا نہیں، اپنے بچے کی پرورش کیسے کرنی ہے؟ اپنا گھر کیسے بنانا ہے؟ لیکن عقل سے محروم رکھا۔ اس وجہ سے عقل سے متعلق ذمہ داریاں اس نے اپنے ذمے رکھیں۔ لیکن انسان کہ جس کو اس نے

احساس، ادراک اور ارادہ جیسی دولتوں سے نوازا اور زمین اور آسمانوں میں اس کے لئے خزانے پوشیدہ کئے اور کہا کہ زمین سے آسمان تک کی تمام حقیقتوں کو اس کے لئے تسخیر کر دیا گیا۔ اب یہ انسان کی استطاعت ہے کہ وہ اپنی عقل سے حقائق زمان و مکان کو کس حد تک افشاں کرتا ہے۔ دوسری جانب اس نے انسان کو ایک عنصر عطا کیا جو کہ باقی مخلوقات میں نہیں ہے اور وہ ہے "نفس" اور ساتھ ہی اُسے تسخیر کرنے کے لئے اس نے اپنے پیغمبروں علیہم السلام کے ذریعے ہر دور میں احکامات جاری کئے کہ ان لوگوں کی ہدایت کرو اور ان کو باور کرو کہ وہ کس طرح سے احکامات الٰہی پر عمل پیرا ہو کر اپنے نفس پر قابو پا سکتے ہیں۔

جیسا کہ سورۃ شمس میں ارشاد ہوتا ہے۔

"قسم ہے نفس کی اور اس کے ٹھیک بنائے جانے کی پھر ہم نے سمجھ دے دی اس کو بدی اور نیکی کی تو کامیاب ہے وہ جس نے اس کو پاک رکھا اور نا کام ہوا وہ جس نے اس کو مبتلا کر دیا۔" (شمس:7-10)

اس کے بعد اب خدائے بزرگ و برتر نے اپنے بندے کو ایک اور مقام پر لا کھڑا کیا ہے اور یہ ہے وہ آزمائش کی گھڑی کہ جس میں اس کی ابدی زندگی کا فیصلہ کیا جائے گا۔ اس ازلی زندگی کو مدنظر رکھتے ہوئے کہ جس میں اللہ نے اس کو ایک نفس عطا کیا تھا اور اس سے کہا تھا کہ اب یہ تم پر منحصر ہے کہ تم اپنی فہم و فراست سے اس دنیا کی بادشاہت اور عیش کو تسخیر کرتے ہو اور اپنے نفس کے غلام ہو جاتے ہو یا اس ادراک اور ارادے کے بل پر جو اللہ نے تم کو عطاء کیا ہے، اپنے نفس پر قابو پاتے ہو۔ تو اگر تم قابو پا لیتے ہو ان احکامات کے ذریعے جو اللہ نے تمہاری طرف بھیجے تو تم پر آخرت کے عذاب کو حرام کر دیا جائے گا۔

شہنشاہ ولائت حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم فرماتے ہیں۔

"دنیا اور آخرت کی مثال ایسی ہے کہ جس طرح ایک شخص کی دو بیویاں ہوں اگر ان میں سے ایک کو خوش کرو گے تو دوسری ناراض ہو جائے گی۔"

ایک اور مقام پر دنیا کے کھوئے نفس کو مخاطب کرتے ہوئے علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

''اے اہل غرور! تمہیں دنیا کی کس چیز نے مغرور بنا رکھا ہے؟ حالانکہ یہ ایسا گھر ہے کہ اس میں بھلائی بہت قلیل، اس میں طرح طرح کے شر موجود، اس کی نعمتیں سریع الزوال ہیں، اس سے صلح رکھنے والا مغلوب، اس کا مالک درحقیقت ملوک اوراس کا سامان آخرت کا متروک ہے۔''

حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم نے دنیا کو مخاطب کر کے بارہا کہا ہے۔

''اے دنیا! جا میرے علاوہ کسی اور کو دھوکا دے، میں نے تجھے طلاق بائن دی ہے۔ جس کے بعد رجوع کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔''

حضرت ابن طلحہ شافعی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ ایک دن حضرت علی علیہ السلام نے جابر بن عبداللہ انصاری رضی اللہ عنہ کو لمبی لمبی سانس لیتے ہوئے دیکھا تو پوچھا، اے جابر! کیا یہ تمہاری ٹھنڈی سانس دنیا کے لئے ہے؟ عرض کی، مولا! ہے تو ایسا ہی۔ آپ نے فرمایا! جابر سنو! انسان کی زندگی کا دارومدار سات چیزوں پر ہے اور یہی سات چیزیں وہ ہیں جن پر لذتوں کا خاتمہ ہے، جن کی تفصیل یہ ہے۔

☆ کھانے والی چیزیں۔

☆ پینے والی چیزیں۔

☆ پہننے والی چیزیں۔

☆ لذت نکاح والی چیزیں۔

☆ سواری والی چیزیں۔

☆ سونگھنے والی چیزیں۔

☆ سننے والی چیزیں۔

اے جابر رضی اللہ عنہ! اب ذرا ان کی حقیقتوں پر غور کر۔ کھانے میں بہترین چیز شہد ہے اور یہ مکھی کا لعاب دہن ہے۔ اور بہترین پینے کی چیز پانی ہے، یہ مارا مارا زمین پر پھرتا ہے۔ بہترین پہننے کی چیز دیباج ہے، یہ کیڑے کا لعاب ہے اور بہترین منکوحات عورت ہے جس

کی حد پیشاب کا مقام ہوتا ہے۔ دنیا اُس کی جس چیز کو اچھی نگاہ سے دیکھتی ہے وہ وہی ہے جو اس کے جسم میں سب سے ناپاک ہے۔ اور بہترین سواری کی چیز گھوڑا ہے جو قتل وقتال کا مرکز ہے اور بہترین سونگھنے کی چیز مشک ہے جو ایک جانور کے ناف کا سوکھا ہوا خون ہے اور بہترین سننے کی چیز غنا (گانا) ہے جو انتہائی گناہ ہے۔ اے جابر رضی اللہ عنہ! ایسی چیزوں کے لئے عاقل ٹھنڈی سانس کیوں لے؟ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ اس ارشاد کے بعد میں نے کبھی دنیا کا خیال تک نہ کیا۔ (مطالب السوئل ص ۱۹۱)

ایک اور مقام پر حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم اس کی حقیقت کو اس طرح واضح کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

''دنیا ایک ایسا گھر ہے جس کا اول تکلیف اور اس کا آخر خوفناک ہے۔ اس کی حلال چیزوں پر حساب اور حرام پر عذاب ہوگا۔ جو شخص اس میں غنی ہے وہ اکثر فتنے میں مبتلا ہے اور جو فقیر ومحتاج ہے وہ غم میں گرفتار ہے۔''

پھر فرماتے ہیں۔

''دین کی درستگی دنیا کے نقصان کرنے سے حاصل ہوتی ہے۔''

حضرت علی علیہ السلام کے بیان میں لفظ ''دنیا'' کی تشریح کرنا ضروری سمجھوں گا۔ کیونکہ مختلف اوقات میں زندگی کا اصل راز یہ ہے کہ دنیا کو قلب سے نکالو گو ہاتھ میں بقدر ضرورت موجود ہو۔ دنیا کا ہاتھ میں ہونا مضر نہیں بلکہ دل میں سمانا مضر ہے۔ قلب تو بس حق تعالیٰ ہی کے رہنے کی جگہ ہے اور اس قلب کو ہمہ وقت صاف رہنا چاہئے نہ معلوم کس وقت نور حق اور رحمت الٰہی قلب پر جلوہ گر ہو جائے۔ جس طرح فقیر اپنے برتن کو خالی رکھتا ہے کہ نہ معلوم کس وقت کسی سخی کی نظر عنایت ہو جائے۔ دوسری جانب جناب علی علیہ السلام نے ''دنیا'' کا لفظ جس مفہوم کو واضح کرنے کے لئے استعمال کیا ہے اس سے مراد دنیا کی عیش و عشرت ہے کہ جس میں بندہ اپنے رب کو بھلا دیتا ہے اور اپنی نفسانی خواہشات کا غلام ہو جاتا ہے۔ لیکن اگر اس دنیا کی بات کریں جس میں ہم اپنا مقصد حیات تلاش کرتے ہیں تو وہ خدا

نے ہم پر اسی لئے حلال کی ہے کہ ہم اس میں رہ کر اپنے "حقوق" پورے کریں اور دنیا کے اس تمام علم کو جاننے کی کوشش کریں کہ جو اللہ نے اس کی خلوتوں، جلوتوں میں چھپا رکھا ہے۔

جیسا کہ سورۃ حج میں ارشاد ہوتا ہے۔

"کیا تم نے نہیں دیکھا کہ خدا نے جو کچھ زمین میں ہے سب تمہارے بس میں دے دیا۔" (حج:65)

سورۃ بقر میں اس طرح ارشاد ہوتا ہے۔

"وہ جس نے تمہارے لئے جو کچھ زمین میں ہے بنایا۔" (بقرہ:29)

جس وقت میں نے اوپر دنیا کے حقوق کا ذکر کیا تو اس سے مراد حقوق اللہ بھی ہے اور حقوق العباد بھی۔ تزکیہ نفس صرف اس صورت میں ممکن ہے کہ جب ہم اس دنیا میں رہ کر ان دونوں حقوق کا حق ادا کریں۔

اس ضمن میں حضرت غوث الاعظم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

"اگر تو خالق کے ساتھ ہے تو اس کا بندہ ہے اور اگر مخلوق کے ساتھ ہے تو مخلوق کا بندہ۔"

ان میں سے ایک کی بھی غفلت انسان کے کامل ایمان کو ڈگمگا دیتی ہے۔ بعض مقامات پر حقوق العباد کو فوقیت دی گئی ہے کیونکہ اللہ فرماتے ہے کہ میں اپنے حقوق تو معاف فرما سکتا ہوں لیکن لوگوں کے حقوق معاف نہیں کر سکتا۔ جب تک کہ وہ خود معاف نہ کریں۔ حصول خدا اور حصول نفس کی تشریح اس واقعہ سے بھی عیاں ہے۔

"ایک دفعہ حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت عثمان الخیری رحمۃ اللہ علیہ اکٹھے نماز ادا کر رہے تھے۔ حضرت عثمان رحمۃ اللہ علیہ نے نماز کے بعد دعا کی کہ اے اللہ! مجھے وہ تمام عطا کر جو میں چاہتا ہوں اور حضرت بایزید رحمۃ اللہ علیہ نے دعا کی کہ اے اللہ! مجھے اس سب سے علیحدہ کر دے کہ جس کی میں خواہش کرتا ہوں۔ حضرت عثمان رحمۃ اللہ علیہ نے انتہائی تجسس سے پوچھا کہ یہ

کیسی دعا ہے؟ تو حضرت بایزید رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ خدا کی جستجو کرنے
والے کو دنیا کی خواہشات سے کیا لینا۔"

اپنے نفس پر قابو پانا ہی اپنے رب کو پانا ہے۔

جیسا کہ حضرت بایزید رحمۃ اللہ علیہ ایک اور موقعہ پر فرماتے ہیں۔

"میں نے اللہ کو دو اطراف سے پایا ہے جس کے دوران میرا ایک قدم میرے
اپنے نفس پر ہوتا ہے اور دوسرا اپنے محبوب کی گلی میں۔"

اس حقیقت کو مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ اس طرح بیان فرماتے ہیں کہ انسان دو عالموں میں بیک وقت زندگی بسر کرتا ہے۔ ایک عالم مادی ہے اور ایک روحانی۔ جو زمان و مکان سے ماوراء ہے۔ شائد ہی کوئی تیرہ ضمیر انسان ہو جس کے دل میں کبھی بھی روحانی زندگی کی لہر نہ اٹھتی ہو۔ چوروں، ڈاکوؤں اور قاتلوں کے نفس کو بھی جن لوگوں نے ہمدردی سے ٹٹولا ہے ان کے اندر بھی کسی نہ کسی اخلاقی فضیلت کے اظہار نا یافتہ میلان کا کھوج لگایا ہے جو نامساعد احوال سے عمل میں صورت پذیر نہ ہو سکا۔ مولانا کو اس بارے میں ایک عجیب و غریب مثال سوجھی ہے۔ بطخ کے انڈے کو اگر گھر کی مرغی کے نیچے سینے کے لئے رکھ دیا جائے تو اس میں سے بطخ کا بچہ پیدا ہو گا۔ اس کا فطری میلان پانی میں تیرا کی ہے حالانکہ جس مرغی نے بطور دایہ اس کو جنوایا ہے وہ خشکی کا جانور ہے اور دریا سے گھبراتا ہے۔ مولانا فرماتے ہیں کہ انسان عالم خاکی میں جنم لیتا ہے لیکن اس کی اصل فطرت روحانیت کے دریا کی شناوری ہے۔ بطخ کا بچہ بڑا ہو کر تو یہ دھوکا نہیں کھاتا کہ میں مرغی کا بچہ ہوں۔ لہٰذا مجھے پانی کی طرف نہیں جانا چاہئے۔ لیکن عالم مادی میں جنم لینے اور جسمانیت کی ادائیگی سے انسان اکثر اوقات اپنی اصلیت اور جبلت کو بھول کر اپنے آپ کو عالم جسمانی یعنی خشکی کا جانور سمجھ لیتا ہے اور روحانیت کے دریا کی طرف جاتے ہوئے جھجکنے لگتا ہے۔ انسان اس جانور کی طرح ہے جو خشکی اور تری دونوں میں زندہ رہ سکتا ہے۔ جیسے بطخ، کبھی زمین پر چلتی ہے اور کبھی پانی میں تیرتی ہے۔

یہ ظاہر کرتا ہے کہ انسان ایک طرف اپنے میں پائی جانے والی ''میں'' اور اپنی حقیقت کو جانے اور دوسری طرف اپنے رب کی جستجو کرے تو ہی اپنی منزل کو حاصل کرتا ہے۔ یہاں پر ایک وضاحت کرتا چلوں کہ نفس کو راہ راست پر لانے کے لئے صرف اخلاق، تہذیب، فلسفہ، قانون اور فہم وفراست کی ضرورت نہیں ہوتی۔ بلکہ اس میں ذکر الٰہی اور تصوف کے عناصر کا ہونا بہت ضروری ہے۔ اگر میں آپ سے یہ پوچھوں کہ آپ مجھے چند ایسی شخصیات کے نام گنوائیں کہ جو مہذب، فلسفی اور اعلیٰ اخلاق کے مالک ہوں تو آپ کہیں گے کہ سقراط، ارسطو، بقراط، افلاطون حتیٰ کہ ابوجہل بھی بہت بڑا عالم تھا۔ لیکن ان میں سے کوئی ایک بھی ایسا بتائیں کہ جس نے اپنی فہم وفراست کے بل بوتے پر لوگوں کے نفوس کو قابو کر لیا ہو اور ان کی تعلیمات پر بعد میں آنے والے لوگوں نے کتنا عمل کیا۔ بلکہ کیا ہی سچ ہو کہ اگر میں یوں کہوں کہ اب تو ان کے ناموں کی پہچان بھی خطرے میں پڑتی جا رہی ہے۔ نفس کو پاک کرنے کیلئے صرف اخلاق آمیز اسباب کی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ اس کے پیچھے کسی شیخ کامل کی جستجو ضروری ہے۔

سید سلمان ندوی اپنی کتاب ''خطابات مدارس'' میں ایک واقعہ تحریر کرتے ہیں۔

''میں جہاز (کروکودیا) نامی سے اوائل فروری ۱۹۲۴ء میں حجاز و مصر سے واپس آ رہا تھا۔ اتفاق سے مشہور شاعر ڈاکٹر ٹیگور بھی امریکہ کے سفر سے واپس ہو رہے تھے۔ ایک رفیق سفر نے ان سے سوال کیا کہ برہمو سماج کی ناکامی کا سبب کیا ہے؟ حالانکہ اس کے اصول بہت منصفانہ صلح کل تھے۔ اس میں عقل اور منطق کے خلاف کوئی چیز نہ تھی۔ وہ موجودہ تمدن، موجودہ فلسفہ اور موجودہ حالات کو دیکھ کر بنایا گیا تھا۔ تاہم اس نے کامیابی حاصل نہ کی۔ فلسفی شاعر نے جواب میں کتنا اچھا نقطہ بیان کیا کہ یہ اس لئے ناکام ہوا کہ اس کے پیچھے کوئی شخصی زندگی اور عملی سیرت نہ تھی جو ہماری توجہ کا مرکز بنتی اور نیکوکاری کا نمونہ بنتی۔''

دنیا میں ہر قسم کے علم وفن کے حصول کے لئے استاد اور مرشد کی ضرورت ہے۔ شاگرد

اور مرید کو مرشد کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنا لازم ہے۔ حلم کے بغیر علم حاصل نہیں ہوسکتا۔ کبر و ناز کو برطرف کر کے ہی کچھ حاصل ہوتا ہے۔ متکبر اور خود بین جہل مرکب میں مبتلا رہتا ہے۔ اگر کوئی چمڑا رنگنے والا کام کے وقت کوئی پھٹا پرانا کپڑا پہن لیتا ہے تو اس میں اس کی خواجگی میں کیا فرق آتا ہے؟ اس طرح اگر لوہار بھٹی کو دھونکتے ہوئے پیوند والا کرتہ پہن لیتا ہے تو اس سے لوگ اس کو ذلیل و قلاش تو نہیں سمجھ لیتے۔ سعی حصول کمال میں جامۂ افتخار و تکبر کو اتار دینا چاہئے۔ کیونکہ خود کمال ہی انسان کا بہتر لباس ہے۔ انسان کو جو کچھ سیکھنا چاہئے اس کی تین قسمیں ہیں۔ علم، عمل اور صحبت اولیاء۔ علوم کا اکتساب قول سے ہوتا ہے۔ اقوال استاد کی زبان سے بھی سیکھے جاتے ہیں اور ماہرین علوم کی تصانیف سے بھی۔ لیکن بہرحال تمام نظری علوم قولی ہیں مگر جسے ''حرفت یا صناعی'' کہتے ہیں وہ محض سننے یا پڑھنے سے نہیں آتی یہ کرنے سے آتی ہے۔ فن زرگری کی کتاب پڑھنے سے کوئی زرگر نہیں بن سکتا۔ اس کے لئے عمل مسلسل کی ضرورت ہے لیکن جسے درویشی یا فقر کہتے ہیں اور جس کا مقصد تنویر و تزکیہ باطن ہے اگرچہ اچھے اقوال و افعال اس میں معاون ہو سکتے ہیں۔ لیکن اس میں اصل فیضان کسی اہل دل کی صحبت سے ہی حاصل ہوتا ہے۔ اگر کسی شخص کو علم بھی حاصل ہوا اور اس کے اعمال بھی اچھے ہوں مگر کسی برگزیدہ روحانی انسان کی صحبت اسے نصیب نہ ہوئی ہو تو اسے فقر کا کوئی اعلیٰ درجہ حاصل نہیں ہوسکتا۔ اگر علم و عمل اور صحبت اولیاء تینوں چیزیں میسر آ جائیں تو زہے قسمت۔ فیضان صحبت سے جب انشراح پیدا ہوتا ہے تو خود انسان کے اندر سے آب حیات کا چشمہ پھوٹ پڑتا ہے۔ یہ چشمہ اندر کے بحر بیکراں سے ہم کنار ہے۔ روحانیت سینوں سے سینوں میں منتقل ہوتی ہے۔ یہ علم سینہ، علم سفینہ نہیں۔

اس نکتے سے ظاہر ہوتا ہے کہ نفس کی بہتر تربیت کے لئے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت اور عملی زندگی کا ہونا کس قدر ضروری ہے کہ جو کسی شیخ کامل کی بارگاہ سے ہی حاصل ہو سکتی ہے۔ بعض اوقات شیخ کامل کی فقط ایک نگاہ ہی ایک سرکش کو قابو کرنے کیلئے کافی ہوتی ہے کہ جو ایک بڑے سے بڑا ارسطو یا افلاطون بھی کئی سالوں کی جہد و ریاضت کے بعد شائد

ہی کر سکے۔

خواجہ نور محمد تیراہی رحمۃ اللہ علیہ کی بارگاہ میں یاران طریقت اور خلفائے کرام کا بھرپور اجتماع تھا۔ خواجہ ہادی نامدار نتھیالوی رحمۃ اللہ علیہ بھی اپنے خلفائے خاص خواجہ سید چنن شاہ نوری رحمۃ اللہ علیہ (آلومہار شریف) اور خلیفہ خان عالم رحمۃ اللہ علیہ کے ہمراہ تشریف فرما تھے۔ اسی مجلس میں ایک مولوی صاحب حاضر ہوئے کہ جو حج بیت اللہ کے لئے جا رہے تھے وہ دعائے خیر کے لئے حاضر ہوئے۔ مولوی صاحب نے جب مجلس میں بے پناہ رونق دیکھی اور سامنے نذرانوں کے ڈھیر دیکھا تو سوچنے لگے کہ یہ تو اچھا کاروبار ہے اور دکانداری معلوم ہوتی ہے۔ یہاں معرفت الٰہیہ کا کیا تصور ہو سکتا ہے۔ جب کچھ دیر کے بعد مولوی صاحب جانے لگے تو خیال آیا کہ ذرا ایک مسئلہ پوچھ لوں۔ کہنے لگے کہ ایمان کیا چیز ہے؟ تو خواجہ تیراہی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ مولوی صاحب! ''ایمان کھانے پینے کا نام ہے۔'' مولوی صاحب جلتے ہوئے اٹھے کہ یہاں بزرگی کہاں کہ ان کو تو ایمان کا بھی پتہ نہیں۔ مطلق بے علم ہیں یہ سوچ کر غصے میں اٹھے اور چلتے بنے۔ واپس گھر آ کر حج کی تیاری میں مصروف ہو گئے اور قافلے کے ساتھ حج کے لئے روانہ ہو گئے۔ حج سے فارغ ہو کر اسی قافلے کے ہمراہ وطن کی طرف چل پڑے۔ مولوی صاحب ریگستانی علاقے میں قافلے کے ساتھ سفر کر رہے تھے کہ اچانک قضائے حاجت کے سلسلے میں کسی پہاڑی کی اوٹ میں چلے گئے اور جب اٹھے تو قافلے سے بچھڑ گئے۔ قافلے کی تلاش میں بڑی دور بھاگے مگر ناکام رہے۔ گرمی کی شدت اس پر بھوک اور پیاس کا غلبہ بالآخر وہ تھک گئے اور ضعف طاری ہوا۔ مولوی صاحب کی آنکھوں کے سامنے موت رقص کرنے لگی۔ اتنے میں مولوی صاحب دیکھتے ہیں کہ چرواہا بکریاں چراتا ہوا ٹیلوں کی اوٹ سے نکلا۔ مولوی صاحب کی آنکھیں چرواہے کو دیکھ کر کچھ کھانے پینے کے لئے کھل گئیں۔ فوراً چرواہے سے کہا اے اللہ کے بندے مجھے دودھ نکال کر پلاؤ کہ میں بھوک و پیاس کی شدت سے اپنی مرگ کے قریب ہوں۔ چرواہے نے کہا دودھ مفت نہیں ملتا اس کی قیمت ادا کرنی پڑے گی۔ حاجی صاحب

بولے میں قافلے سے بچھڑ گیا ہوں، میرے پاس کچھ نہیں مسافر اور غریب ہوں، فی سبیل اللہ تھوڑا سا دودھ پلا دو۔ چرواہا بولا کہ تم بڑے امیر ہو تمہارے پاس تو بہترین دولت ''حج بیت اللہ'' ہے جس کی دربار الٰہی میں بڑی قیمت ہے، اپنا حج میری ملک کر دو۔ مولوی صاحب تڑپ کر بولے میں اپنا میان بیچ کر یہ سودا کیسے کروں؟ چرواہے نے کہا پھر دودھ نہیں مل سکتا۔ مولوی صاحب بے تابی کے عالم میں بولے کہ اچھا چوتھا حصہ حج کا لے لو اور دودھ پلا دو۔ چرواہے نے کہا کہ ہرگز نہیں ایک گھونٹ کی امید نہ رکھنا خواہ آپ میرے سامنے تڑپ تڑپ کر مر جائیں۔ حاجی صاحب کی جان لبوں پر آئی ہوئی تھی تو بولے کہ اچھا آدھا حج ہی لے لو۔ چرواہے نے کہا ہرگز نہیں میں تو پورے حج کے بدلے ہی سودا کروں گا۔ آخر کار مولوی صاحب سوچنے پر مجبور ہو گئے کہ فی الحال جان بچائی جائے زندگی رہی تو پھر حج ہو جائے گا۔ چنانچہ حاجی صاحب نے مجبوراً دودھ کے بدلے اپنا سارا حج چرواہے کی ملک کر دیا۔ دودھ پینے کے بعد حواس بحال ہوئے تو دل میں خیال آیا کہ جب میں ایک مرد فقیر کی بارگاہ میں گیا تھا اور انہوں نے مجھے کہا تھا کہ ''ایمان کھانے پینے کا نام ہے'' اس مرد فقیر کی بات تو بالکل درست نکلی اور وہ مسئلہ تو مجھ پر صادق آیا۔ ادھر مولوی صاحب سوچتے رہے اور چرواہا بکریوں سمیت نظروں سے غائب ہو گیا۔ چنانچہ مشیت خداوندی کے مطابق وہ وطن واپس پہنچا تو سیدھا خواجہ تیراہی رحمۃ اللہ علیہ کی بارگاہ میں حاضر ہوا۔ دیکھا کہ اسی طرح محفل سجی ہوئی ہے تو مولوی صاحب نے وہاں رونا چلانا شروع کر دیا۔ خواجہ صاحب نے کہا کہ مولوی صاحب حج کے کھو جانے کی خاطر اس قدر پریشان ہو رہے ہیں، ذرا ان آدمیوں میں پہچانئے کون سا آدمی ہے کہ جس کے ساتھ آپ نے سودا کیا تھا۔ مولوی صاحب نے کہا حضور وہ تو اعرابی تھا وہ یہاں کس طرح آ سکتا ہے؟ آپ نے مسکراتے ہوئے فرمایا کہ ذرا غور تو کرو۔ اب مولوی صاحب نے غور سے مجمع پر نظر دوڑائی تو ہادی نامدار نتھیالوی رحمۃ اللہ علیہ کو دیکھ کر پکار اٹھے کہ یہی ہے جس نے میرا حج لیا ہے۔ تو خواجہ صاحب نے ہادی نامدار رحمۃ اللہ علیہ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا کہ غریب ملاں کے حج

سے فقیر کو کیا لینا کہ اس کو جو سبق حاصل ہونا تھا ہو گیا اب اس کا جج واپس کر دیجئے۔ جس پر ہادی نامدار رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے مرشد کامل کے حکم کی تعمیل فرمائی۔ وہ مولوی تائب ہو کر خواجہ صاحب کے حلقہ بیعت میں داخل ہوئے اور آپ کی تربیت میں ایک باعمل عالم دین اور مرد فقیر بن کر اس دنیا سے رخصت ہوئے۔

اس واقعہ سے ہمیں دو حقیقتوں کا نچوڑ حاصل ہوتا ہے۔ پہلی یہ کہ انسان کا نفس کس قدر کمزور ہے کہ افلاس میں اس کا ایمان بھی اپنے رب سے اٹھ جاتا ہے کہ وہی اسے روزی دینے والا اور زندہ رکھنے والا ہے اور صبر کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دیتا ہے اور اپنا ایمان مادیت کے آگے بیچ دیتا ہے۔ دوسرا یہ کہ ایک مرد فقیر کی نگاہ تمام مذاہب واخلاق کی انسائیکلوپیڈیا کے مطالعے سے بڑھ کر ہے کہ کس مہارت سے انسانی نفس کو قابو کرتی ہے۔

حضرت مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ بندگان خدا کی نیک صفت اور ان کے طریقہ اصلاح نفس کا تذکرہ اس طرح سے فرماتے ہیں کہ اکثر صوفیاء اپنا تجربہ بیان کرتے ہیں کہ ہر شخص بلکہ ہر جامد شے سے بھی مخصوص قسم کی لہریں ارتعاشات صادر ہوتے ہیں۔ ہر شخص کے گرد اِن ارتعاشات کا ایک ہالہ ہوتا ہے جو حساس نفوس کے لئے مرئی محسوس ہوتا ہے اکثر اوقات ایسے لوگ جن کی حس خاص طور پر تیز نہیں ہوتی کسی اجنبی شخص کو دیکھتے ہی یا تو کچھ کشش محسوس کرتے ہیں یا کم وبیش منافرت۔ عام نفسیات نے بھی اس کی توجیہ کی کوشش کی ہے مگر یہ نفسیات اہل دل کے تجربات تک نہیں پہنچتی۔

حضرت مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ نے ایک جگہ ان تموجات کا ذکر کیا ہے۔

''چیزوں اور اشخاص کو جو ہم محسوس کرتے ہیں وہ بھی تموجات ہی ہوتے ہیں جو ہماری خاک کی اندرونی سطح سے ٹکراتے ہیں تو ہمیں خوشگوار یا ناگوار بو محسوس ہوتی ہے۔ ایک حساس اہل دل جب کسی شخص سے ملتا ہے تو اس کے ارتعاشات سے اس کی سیرت کو پہچان لیتا ہے جس طرح کہ بو سے چیزیں پہچانی جاتی ہیں۔ لیکن خدا کی شان ستاری کی صفت مردان خدا میں بھی پائی جاتی ہے اس لئے وہ

ہر شخص پر اس کی سیرت کا عیب دار پہلو منکشف نہیں کرتے اور بیان نہیں کرتے کہ اس شخص کی دل آزاری نہ ہو کیونکہ دل آزاری اکثر اوقات اصلاح نفس میں مانع ہوتی ہے۔ حضرت مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ہر وقت انسان سے یہ تموجات بو بن کر نکلتے رہتے ہیں خواہ وہ جاگتا ہو اور خواہ سوتا ہو، خواہ بات کر رہا ہو یا خاموش ہو۔ غرور اور حرص و ہوس کی بو تو بات کرتے ہی منہ سے نکلتی ہے اور مخاطب اگر حساس ہو تو محسوس کر لیتا ہے خواہ کہنے والا اس کے خلاف ہی دعویٰ کر رہا ہو تو میں تو بہت عاجز اور خاک ہوں اور مجھے تو کسی قسم کی لالچ نہیں۔ اس کی مثال مولانا یہ دیتے ہیں کہ اگر کوئی شخص پیاز اور لہسن کھا کر زور شور سے قسمیں کھا کر اس کا انکار کرے تو اس کے بیان کو کون سچ مانے گا؟ کیونکہ اس کی بو اس کی غمازی کر رہی ہے۔ بد سیرت آدمی کی دعائیں بھی اسی بد بو کی وجہ سے رد ہو جاتی ہیں۔ بارگاہ الٰہی میں صرف طیبات صعود کر سکتے ہیں۔"

اب تک میں نے حقیقت نفس اور تزکیہ نفس کو آپ کے سامنے مختلف زاویوں سے پیش کیا۔ لیکن نیکی میں تزکیہ نفس کس طرح حاصل ہوتی ہے اس پر چند سطریں لکھنے کی جسارت چاہوں گا۔ "نیکی" کا مفہوم واضح کرنے کے لئے اس کو دو قسموں میں تقسیم کرنا ہوگا۔ ایک قسم سلبی اور ایک ایجابی۔ اگر میں یہ کہوں آپ تمام دنیا سے غافل ہو کر ایک غار میں جا کر عبادت شروع کر دیں تو اس سے جو نیکی آپ کو حاصل ہوگی وہ سلبی ہوگی۔ اس کے دوران آپ نے اپنے آپ کو تمام برائیوں سے محفوظ رکھا اور پرہیزگاری اختیار کی۔ لیکن اس نیکی کو اختیار کرنے کے بعد آپ نے نہ تو غریبوں کو کھانا کھلایا، نہ بے کسوں کی مدد کی، نہ ہی اپنے ہمسائے کی خبر لی اور نہ آپ نے اپنے اہل گھر کی خبر لی تو یہ حالت ایجابی کہلائے گی کہ جس کو ادا کرنے میں آپ غافل رہے۔ آپ اگرچہ سلبی نیکی تو رکھتے ہیں لیکن ایجابی نہیں۔ تو اس صورت میں آپ کا تزکیہ نفس مکمل نہ ہوگا۔ جیسا کہ میں مندرجہ بالا واقعہ سے واضح کر چکا ہوں کہ اس میں سیرت اور عملی زندگی دونوں کا کردار اہم ہے۔ اگر سیرت کے باوجود آپ

عملی زندگی سے عاری ہیں تو حصول منزل مشکل ہی نہیں ناممکن ہوگی۔ اس کیفیت کی بہترین مثال آپ کو ہمارے درمیان ابھرنے والی ایک نئی جماعت سے دینا چاہوں گا کہ جو بغل میں بستر دبائے ایک ہاتھ میں لوٹا پکڑے گلی گلی پھر کر صرف نیکی کی سلبی قسم کی جانب رغبت دلانے کی صدائیں لگاتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ان کی ایجابی نیکی سے غفلت کچھ اس قسم کی ہے کہ ایک دفعہ میری ملاقات ایک ایسی عورت سے ہوگئی کہ جس کا خاوند اس جماعت کے ساتھ ہولیا تھا۔ اس عورت نے شکایتاً مجھ سے اس کا ذکر کیا اور مجھے اپنے گھر آنے کی دعوت دی۔ میں جب اپنے چند رفقاء کے ہمراہ اس کے گھر میں گیا تو اس گھر کی در و دیوار اور صحن میں کھیلنے والے معصوم بچے اپنی شکستہ حالت زار کی منہ بولتی تصویر تھے۔ اس گھر کے مالک نے اپنے بیوی بچوں کی خبر تک نہ لی تھی فقط یہ کہہ کر کہ "میں مسلمان کو تبلیغ کرنے جا رہا ہوں۔"

اس جملے کی بلاغت جہالت کو محسوس کیجئے کہ تبلیغ کس کو کی جا رہی ہے؟ مجھے یہ بھی بتایا گیا کہ وہ عورت پابند تھی کہ وہ اپنے بھائیوں کے سامنے پردہ کیا کرے۔ قصہ مختصر میں نے یہ سب کچھ دیکھا اور فقط یہ دعا کی کہ یارب اس کے شوہر کے باطن قلب میں ایجابی نیکی کو بھی اجاگر فرما۔

نفسانی پختگی کے حوالے سے اگر ہم گزشتہ امتوں کی زندگیوں کا مطالعہ کریں۔ اور یہ کھوج لگانے کی کوشش کریں کہ ان امتوں پر مبعوث ہونے والے انبیاء کرام علیہ السلام نے کس حد تک اپنے اپنے لوگوں کی نفسانی ورزش کروائی تو ان سب میں سے افضل ہمیں ذات محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہی نظر آئے گی۔ یہ دعویٰ بے بنیادی پر گھڑا نہیں گیا بلکہ یہ ہماری موجودہ زندگی کے مشاہدے میں ہے۔ آج اگرچہ عیسائیت کے پیروکار سب سے زیادہ ہیں لیکن ان لوگوں کی تعداد ہمیں یہ بتانے سے قاصر ہے کہ ان کے پیغمبر علیہ السلام نے ان کے نفس کو کس قدر ہدایت بخشی۔ بلکہ جس چیز کا مطالعہ اور مشاہدہ ضروری ہے وہ اس بات میں مضمر ہے کہ ان لوگوں نے اپنی الہامی تعلیمات کو اپنے اوپر کس قدر لاگو کیا اور کیا ان تعلیمات کے بل بوتے پر یہ لوگ اپنے نفس پر قابو پانے میں کامیاب ہوگئے۔

آپ مغرب کی ترقی سے متاثر مت ہوئیے۔ میں پہلے اوپر بیان کر چکا ہوں کہ ترقیاں تو ارسطو اور سقراط نے بھی بہت کیں۔ لیکن کس نے ان کی تعلیمات کو اپنے اوپر لاگو کیا اور آج کل وہ محض یونیورسٹیوں کی کتابوں میں ایک حوالہ بن کر رہ گئے ہیں۔ عمارت کی مضبوطی کا اندازہ اس کی بنیادوں سے لگایا جاتا ہے۔ مگر جب بنیاد ہی ٹھیک طریقے سے نہ بیٹھی ہو تو عمارت ہوا کے تند و تیز جھونکوں میں ڈگمگانے لگتی ہے۔ اس ضمن میں انبیاء کرام علیہ السلام کی زندگی کا مطالعہ کریں تو سوائے ذات محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے باقی تمام پیغمبر علیہ السلام اپنی اپنی امتوں کی ہٹ دھرمی کو برداشت نہ کر سکے۔ کسی نے تو اپنے رب سے بڑے بڑے طوفانوں کی دعا کر کے اپنی سرکش قوم کو تباہ کر دیا اور کس نے دل برداشتہ ہو کر سولی کو اپنا ٹھکانہ بنا لیا۔ یہ ذات محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہی تھی کہ جس نے تمام مظالم قریش کے باوجود اپنی قوم کے سرکش گھوڑوں کی مانند نفوس کو قابو کیا۔

اب جبکہ اس تمام بحث و مباحثہ سے ہم نے حقیقت نفس کا نچوڑ حاصل کر لیا ہے تو میں آپ کی توجہ سورۃ بقرہ کی طرف لے جانا چاہوں گا کہ جس میں خداوند کریم فرماتا ہے۔

''خدا کسی نفس کو تکلیف نہیں دیتا مگر اس کی وسعت کے مطابق۔'' (بقرہ:286)

اس آیت کے پہلے حصے کی تشریح کچھ اس طرح سے کروں گا کہ جب تک کوئی انسان اپنے نفس پر قابو نہ پانا چاہے تو اللہ تب تک اس کے نفس کو کئی آزمائش میں نہیں ڈالتا۔ بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ اپنے نفس کو آزمائش میں ڈالنے سے مراد یہ ہے کہ انسان کی دعا قبول ہو گئی۔ لیکن جو اس کی آزمائش سے محفوظ رہتے ہیں پھر ان کو روز محشر جواب دہ ہونا پڑے گا۔

جیسا کہ حضرت ابو سعید خدری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

''جو کوشش سے حق کو پہنچنے کا گمان کرے وہ بے حد رنج و آزمائش میں پڑتا ہے اور جو بغیر سعی کے اس منزل پر پہنچنے کا خیال رکھے وہ بے انتہا تمنا میں پڑتا ہے۔''

اس کے برعکس آیت کا دوسرا حصہ ہمیں میدان کربلا کی طرف لے جاتا ہے۔ کیونکہ قرآن کی اس آیت میں جس وسعت کا ذکر کیا گیا وہ ہمیں کہیں اور نظر نہیں آسکتی۔ امام عالی

مقام جناب حسین علیہ السلام جب رضائے الٰہی کی خاطر اپنے آپ کو یزیدی لشکر کے سامنے تن تنہا لے کر جاتے ہیں تو اس وقت ان کی آنکھوں کے سامنے علی اکبر رضی اللہ عنہ کی لاش بھی پڑی ہے، معصوم علی اصغر رضی اللہ عنہ کی لاش بھی پڑی ہے، اپنے بھائی غازی عباس رضی اللہ عنہ علمدار کی لاش بھی پڑی ہے اور اپنے بھانجوں عون رضی اللہ عنہ ومحمد رضی اللہ عنہ کی لاشیں بھی پڑی ہیں۔ لیکن اس وقت جتنی وسعت حضرت حسین علیہ السلام کے ضبط نفس اور تزکیہ نفس کی تھی اتنی تو شائد تاریخ کائنات اور وسعت کائنات کے نفوس کو جمع کرنے سے بھی نہیں ملتی۔

اپنے موضوع کی تحریروں کو سمیٹتے ہوئے قرآن کریم کی چند آیات کا ترجمہ پیش کروں گا کہ جن میں اللہ بزرگ و برتر نے مندرجہ بالا تمام تفصیل کو فقط دو جملوں میں واضح کر دیا ہے۔ (حدیث)

ارشاد ہوتا ہے۔

''جس نے اپنے نفس کی حقیقت سمجھ لی اس نے خدا کی حقیقت سمجھ لی۔''

دوسری جگہ پر آتا ہے۔

''بیشک مراد کو پہنچا جس نے نفس کو ستھرا کیا اور نامراد ہوا جس نے اسے معصیت میں چھپایا۔'' (شمس:9-10)

ان آیات کو اس مثال سے بھی واضح کر سکتے ہیں کہ ایک پھل دار درخت جب پھل دیتا ہے تو اس پھل کو اپنی حقیقت کو جاننے کے لئے پہلے پھول میں اپنے آپ کو تلاش کرنا ہوگا پھر شاخوں کی خصوصیات کو جان کر اپنے تصور پر غور کرنا ہوگا۔ جب وہ یہ کر چکے تو اس پر یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ اس کی اصل حقیقت بیج سے ہے اور وہ اپنے آپ کو ایک پورا درخت تصور کرے گا۔ جب وہ ان تمام مراحل سے گزر جائے گا اور اپنے آپ کو شاخوں پتوں میں تلاش کرے گا تو اس پر واضح ہو جائے گا کہ وہ بیج سے ہے اور بیج اس سے ہے۔ اس طرح جب بندہ اللہ کی جستجو میں گم ہو جاتا ہے تو اس کی حقیقت یا نفس اللہ میں گم ہو جاتا

ہے اور اللہ کی حقیقت اس میں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اس درخت کو ناپسند کیا ہے کہ جو پھل نہیں دیتا اور یہ انسان کا اپنا ہی نفس ہوتا ہے جو اس کو اس کی زندگی کے مقصد اور پھل سے محروم رکھتا ہے۔

اپنے نفس کی حقیقت کو جاننے اور اس میں ''میں'' کے تصور کو مٹانے کیلئے صرف دین داری کی ضرورت نہیں ہوتی کہ انسان باقی دنیا سے قطع تعلق ہو کر صرف گوشہ نشین رہے۔ ایسا کرنے سے انسان اپنے ذہن کو تو مطمئن کر سکتا ہے لیکن دل کو نہیں۔ دل و دماغ کے باہمی ربط کے لئے ایک جستجو کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایسی جستجو کہ جس سے انسان حقیقی معنوں میں یہ محسوس کر سکے کہ وہ دین و دنیا دونوں میں سرخرو ہوا ہے۔ حالانکہ یہ امر نہایت ہی مشقت طلب ہے اور کم و بیش تمام اولیائے کرام نے اپنی تمام زندگیاں اس جستجو میں گزار دیں۔ لیکن پھر بھی وہ اس جستجو میں اپنے آپ کو نا مکمل تصور کرتے رہے اور اپنے رب سے مغفرت اور دین و دنیا کی سلامتی طلب کرتے رہے۔ انسان کی عبادت ذکر الٰہی میں جستجو کا عنصر صرف اس وقت پیدا ہو سکتا ہے کہ جب اللہ کا بندہ اپنے دینی اصولوں پر کار بند رہ کر اس کو اپنی دنیا پر لاگو کرے اور پھر جو نتائج سامنے آئیں ان میں اپنی کامیابی کے معیار کا تعین کرے کہ وہ کس حد تک کامیاب ہوا ہے۔ اگر وہ ناکام ہوتا ہے تو اس میں قصور ان اسلامی پہلوؤں کا نہیں ہے کہ جس کو اس نے لاگو کیا ہے بلکہ اس نفس کا ہے کہ جس نے اس کو راہ مستقیم سے بھٹکا دیا۔

جس طرح پہلے مذکور ہو چکا ہے کہ اولیاء کرام خواہ جتنی بھی عبادت کر لیں اور قرب کی جستجو میں لگے رہیں ان کے نزدیک ان کی جستجو مکمل نہیں ہوتی اور وہ اپنے نفس کو جھٹلانے کی سعی مسلسل میں رہتے ہیں۔ اس بات کا اندازہ اس واقعہ سے ہو سکتا ہے۔

''محمود غزنوی نے جب کچھ علاقوں کو فتح کیا تو تمام شرفاء اور رئیس اس کو مبارک باد دینے کے لئے آئے۔ لیکن حضرت ابوالحسن خرقانی رحمۃ اللہ علیہ جو ہر وقت عبادت الٰہی اور ذکر الٰہی میں مصروف رہتے تھے وہ تشریف نہ لائے۔ غزنوی کو جب یہ خبر ہوئی تو اس نے ایک رقعہ قاصد کے ذریعے آپ کی طرف روانہ کیا۔

حضرت ابوالحسن خرقانی رحمۃ اللہ علیہ نے جب یہ رقعہ پڑھا تو اس پر لکھا تھا کہ
''اللہ کی اطاعت کرو، اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کرو اور حاکم
وقت کی اطاعت کرو۔'' اس آیت کو پڑھ کر آپ نے قاصد سے کہا کہ محمود کو کہہ
دینا کہ میں تو ابھی تک اسی جستجو میں ہوں کہ اپنے آپ کو اللہ کی اطاعت کے قابل
بنا سکوں اور جب یہ سمجھوں گا کہ میں اس میں کامیاب ہو گیا تو تب رسول اللہ صلی
اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کے لئے جستجو کروں گا اور جب پھر ان سے فارغ ہوا تو
تمہاری اطاعت بھی کر لوں گا۔ محمود غزنوی نے جب حضرت ابوالحسن خرقانی رحمۃ
اللہ علیہ کا یہ پیغام سنا تو خود آپ کے پاس آ گیا اور معذرت کا طلبگار ہوا۔ اس
کے بعد آپ کی خدمت میں اشرفیوں کی تھیلی پیش کی جس کو آپ نے لینے سے
انکار کر دیا۔ کہا کہ وہ سامنے کچھ کھانا پڑا ہے اسے کھا لو۔ غزنوی نے جس وقت
سوکھی روٹی کا ٹکڑا چبانے کی کوشش کی تو اس کے دانتوں میں تکلیف محسوس ہوئی۔
اس پر حضرت ابوالحسن خرقانی رحمۃ اللہ علیہ نے دریافت کیا تو محمود نے کہا میں
کوشش کر رہا ہوں لیکن یہ روٹی مجھ سے چبائی نہیں جاتی۔ تو آپ نے جواب دیا
کہ جس طرح ہماری روٹی تمہارے حلق سے گزرنا مشکل ہے اسی طرح تمہاری
روٹی ہمارے حلق سے گزرنا محال ہے۔''

پرخلوص قلب کی جستجو کبھی ختم نہیں ہوتی اور جب یہ اپنے نفوس پر حاوی ہو جاتے ہیں تو دنیاوی لذتوں اور خواہشوں کو بے معنی تصور کرتے ہیں۔ یہ سب کچھ کسی دکھاوے یا مصلحت کے تحت نہیں ہوتا۔ بلکہ فقط رضائے الٰہی مقصود ہوتی ہے۔ رضائے الٰہی انسانی نفس میں جن چیزوں میں پوشیدہ ہے اس کی وضاحت حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم کی روایت کردہ اس حدیث سے ہوتی ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جن چیزوں کو اپنے نفس سے دور کیا ان میں پہلی ''بحث ومباحثہ'' دوسری ''ضرورت سے زیادہ بات کرنا'' اور تیسری ''جو بات مطلب کی نہ ہو اس میں نہ پڑنا'' ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم دوسروں

کے بارے میں بھی تین ہی باتوں سے پرہیز کرتے تھے۔

☆ کسی کو برا نہیں کہتے۔

☆ کسی کی عیب جوئی نہیں کرتے تھے۔

☆ کسی کے اندرونی حالات کی ٹوہ میں نہیں رہتے تھے۔

حضرت ذوالنون مصری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

''اللہ تعالیٰ کی صحبت اور تزکیہ نفس کی علامات اس امر میں پوشیدہ ہیں کہ جس سے جناب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق اور افعال میں ان کی مطابقت کی جائے۔''

اب سوچنا چاہئے کہ آج کے یہ لوگ جو علماء طریقت ومشائخ ملت وکبرائے حقیقت ہیں اور یہ سب کے سب شریعت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعظیم کرتے ہیں اور اپنے باطنی علوم کو ملت حنفیہ وسیرت احمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تابع لازم سمجھتے ہیں تو ان کے مدمقابل وہ جہلاء قوم جو شریعت کی کچھ پرواہ نہیں کرتے، نماز اور روزے پر تمسخر اڑاتے ہیں، داڑیاں چٹ کر کے دن رات بھنگ اور چرس پیتے ہیں۔ اپنے آپ کو خدا رسیدہ سمجھتے ہیں۔ اپنے نفوس کو پاک خیال کرتے ہیں، کہتے ہیں کہ شرع کی اور فقیر کی قدیم سے مخالفت چلی آئی ہے اور کہتے ہیں کہ ظاہر علم کے ترک سے وصول الی اللہ حاصل ہوتا ہے، وغیرہ۔ ''ذلک من الخرفات'' کیونکر درجہ ولایت کو پہنچ سکتے ہیں۔ ایسے لوگوں کی صحبت سے پرہیز لازم ہے۔

اپنے موضوع سے ہٹ کر اس لئے آپ کو اس نکتے کی طرف لایا ہوں کہ عام فہم لوگ مزید گمراہ نہ ہوسکیں۔ کیونکہ مسئلہ طریقت پر یہ لوگ تنقید کی وجہ بنتے ہیں۔ اس لئے ان کا سدباب ضروری ہے۔ موضوع کی جانب لوٹتے ہوئے عرض کروں گا کہ جس جستجو کا ذکر میں اوپر کرتا آیا ہوں اس میں ایک خاص پہلو اخلاص کا بھی ہے کہ جس کو تمام بزرگان دین نے اپنی اپنی کاوشوں میں شامل کیا۔ اگر کسی شخص نے اس جستجو میں اخلاص کو اپنایا اور وہ اس کے باوجود بھی اپنے مقصد کو حاصل نہ کر پایا تو اس کی وجہ فقط ''ریاکاری'' ہے جس کا ذکر میں

موضوع کے ساتھ ساتھ کرتا چلوں گا۔ سلف صالحین اپنی عبادات مبارکہ میں اخلاص کو خاص طور پر مدنظر رکھتے ہیں اور ریا کا شائبہ بھی ان کے دلوں میں پیدا نہیں ہوتا۔ وہ جانتے ہیں کہ کوئی عمل بغیر اخلاص مقبول نہیں۔ وہ لوگوں میں زاہد اور عابد بننے کے لئے کوئی کام نہیں کرتے تھے، انہیں اس بات کی کچھ پرواہ نہیں ہوتی کہ لوگ انہیں اچھا سمجھیں یا برا۔ ان کا مقصد صرف رضائے الٰہی ہوتا ہے۔ ساری دنیا ان کی نظروں میں ہیچ ہوتی ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ اخلاص کے ساتھ عمل قلیل بھی کافی ہوتا ہے اور اگر اخلاص کے بغیر چاہے دن رات عبادت کی جائے تو اس سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کو جب یمن بھیجا تو فرمایا۔

''اپنے دین میں اخلاص کر تجھے تھوڑا عمل بھی کافی ہوگا۔''

حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم کا اخلاص بھی حضرات کے سامنے ہے کہ ایک لڑائی میں ایک کافر پر آپ نے قابو پالیا تو اس نے آپ کے منہ مبارک پر تھوک دیا تو آپ نے اسے چھوڑ دیا۔ وہ حیران ہو کر پوچھتا ہے کہ میرے اس عمل سے آپ کو غصہ آنا چاہئے تھا اور مجھے قتل کر دیتے تو آپ فرماتے ہیں۔

''میں نے محض رضائے حق کے لئے تلوار پکڑی ہے۔ میں خدا کے حکم کا بندہ ہوں۔ اپنے نفس کے بدلے کیلئے مامور نہیں ہوں۔ میں خدا کا شیر ہوں اپنی خواہش کا شیر نہیں۔ چونکہ میرے منہ پر تو نے تھوکا ہے اس لئے اب اس لڑائی میں میرا نفس، داخل ہوگیا ہے اس لئے میں نے تجھے چھوڑ دیا کہ میرا عمل اخلاص سے خالی نہ ہو جائے۔''

وہ کافر آپ کے اس اخلاص سے اس قدر متاثر ہوا کہ اس نے اسلام قبول کر لیا۔

مولانا تمثیل رحمۃ اللہ علیہ اس ضمن میں بیان فرماتے ہیں۔

''اس کافر نے کیا مبارک گناہ کیا کہ تھوکنا اس کے حق میں مبارک ہوگیا اور اسے اسلام نصیب ہوا۔ معلوم اس طرح ہوتا ہے کہ جیسے کانٹوں سے گل سرخ کے پتے

نکل آئے ہوں''۔

منافق اور ریاکار یعنی اخلاص سے عاری حرص کی بناء پر اپنی طبیعت اور فطرت میں بوزینہ طبع ہے۔ یعنی جیسے بوزینہ جلدی جلدی کھاتا بھی جاتا ہے اور اپنی گالوں میں بھرتا بھی جاتا ہے اور منہ بھی بہت جلدی جلدی چلاتا ہے۔ کیونکہ خالق کائنات نے اس کے سینہ میں بجائے طبع کے ایک آفت بھردی ہے۔ اسی طرح سے بندر بھی ہے کہ جو آدمی کرتے ہیں وہی وہ بھی کرتا ہے اور یہ بھی جانتا ہے کہ جس طرح آدمی نے کیا ہے اسی طرح میں نے بھی کرلیا ہے۔ لیکن وہ مقاصد کہ جس کی خاطر فعل انسانی تکمیل پاتا ہے اس سے وہ بندر ناواقف ہوتا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ بندر کی یہ عادت ستیزہ جوئی کی ہے۔ مومن اور کافر میں بھی یہی فرق ہے کہ مومن کا ہر فعل امر الٰہی سے انجام پذیر ہوتا ہے اور کافر کا ستیزہ جوئی سے (ستیزہ جوئی سے مراد لڑائی ابھارنا ہے)۔ اب پھر کبھی اس منافق کی جانب غور تو کرو کہ جو موافق کے ساتھ حالت نماز میں ہوتا ہے۔ تو کیا وہ حقیقت میں اس خدائے بزرگ و برتر کے حضور اپنی نیازمندی بجالاتا ہے۔ نہیں بلکہ وہ تو لڑائی و خصومت کے واسطے آتا ہے تاکہ ریاکاری سے اپنا مقام ظاہری نماز کی آڑ میں بڑھا سکے اور پھر اس مقام کی خاطر میں لاتے ہوئے فتنہ وفساد پھیلا سکے۔ اب موافق و منافق ہوتے تو دونوں ہی بندگی میں ہیں۔ خواہ حج ہو، خواہ زکوٰۃ ہو اور خواہ روزہ۔ لیکن مومن اس منافق کے ساتھ بردومات میں ہوتا ہے اور یہ کہ مومن کی عاقبت میں برد ہے یعنی جنت اور منافق کو آخرت میں مات یعنی شکست یا یوں سمجھ لیں کہ وہ ایک شطرنج کی بازی پر بیٹھے ہیں اور وہ بازی ایک قسم کی طاعت مذکور سے ہے۔ لیکن دونوں ایک دوسرے سے متضاد ہیں۔ یعنی ایک کے لئے رب فرماتا ہے ''الدرک الاسفل من النار'' اور دوسرے کے لئے فرماتا ہے ''اعلی علیین''۔ جہاں تک موافق اور منافق کے اعمال کا تعلق ہے تو جب تک زر، چاہے وہ کھوٹا ہو یا کھرا۔ اس کو کسی کسوٹی پر پرکھا نہیں جاتا تب تک وہ پایہ اعتبار سے ساقط ہی رہتا ہے۔ اسی طرح سے آدمی کا ہر عمل و فعل جانچا اور پرکھا جائے گا کہ با اخلاص ہے یا بے اخلاص اور خدا کی جانب سے جانچنے پرکھنے سے قبل

اس ذات باصفات نے خود انسان کو بھی اپنے حواس سے مزین کیا ہے کہ جس پر رہتے ہوئے وہ اخلاصیت کے عنصر کو جانچ پرکھ سکتا ہے۔ اس ضمن میں وہ کسوٹی اس کی عقل ہے اور دوسری جانب ایمان بھی ہے کہ جس سے وہ اپنے عقائد کو جانچتا پرکھتا ہے اور جس کو رب کی جانب سے یہ توفیق ملی ہے تو وہ اپنے شک کو بھی جانتا سمجھتا ہے اور اپنے یقین کو بھی اور اصلاً غش و آلودگی سے اپنا دامن صاف رکھتا ہے اور یہی مومن کی صفت اول و آخر ہے۔

اسی بناء پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی فرمایا۔

''اپنے دل سے فتویٰ پوچھ اور اس کے موافق عمل کر۔''

اور ایسا وہی کر سکتا ہے جو وفا سے بھرپور ہو اور اپنے مالک کے حکم پر بلا کسی نقصان پورا پورا عمل کرنے کے لئے کوشاں ہو۔

جیسا کہ خاقانی فرماتے ہیں۔

دل برصد گا دہر بیش بہا گوہر لسیت
دخل آبد عشر آن فیض ازل کان او

جب کبھی انسان کچھ تناول کرتا ہے تو اس دوران اگر کوئی تنکا یا کوئی ناگوار اور نامرغوب شے منہ میں چلی جائے تو جب تک اس کو نکال نہیں ڈالتا تو تب تک چین نہیں لیتا۔ اب اگر غور کیا جائے تو وہ تنکا ہزاروں لقموں میں ایک خاشاک خرد تھا۔ لیکن جس وقت زندہ کے پاس آیا تو اس نے اپنی حس سے اس کا پتہ لگایا۔ تو پھر کہنا یہی ہے کہ انسان کو اپنی حس عقلی کو صاف کر لینا چاہئے تا کہ تمام ناگوار و نامرغوب اعمال مکمل طور پر جانچ سکے اور ان کو نکال باہر کرے۔ تو بس جو صحت حس تخریب بدن سے ہے وہ اس بناء پر کہ جان جو کہ جسم کی بادشاہ ہے اول تو اسی جسم کو ویران و خراب کرتی ہے اور پھر بعد ویرانی کے پھر آباد کرتی ہے اور نور معرفت و عرفان سے بھرپور کرتی ہے۔ اور یہ اسی طرح ہے کہ جس طرح کسی بند نہر میں سڑا سڑا یا پانی جمع ہوتا ہے پھر اس نہر کو کاٹ کر وہ پانی نکال دیا جاتا ہے اور نیا اور صاف پانی اس میں رواں کیا جاتا ہے۔ اس دوران میں اس حقیقت کو بھی ذہین نشین رکھنا لازم ہے کہ خشم و

شہوت جو خواہش نفسانی ہے، آدمی کے باطن کو بدحال کر دیتی ہیں۔ جب ان کا غلبہ ہوتا ہے تو افزونی وطغیانی کے درپے ہو جاتا ہے اور اس کا باطن استقامت وراستی سے بدل جاتا ہے اور جب بھی مطلب وحاجت پیدا ہوتی ہے تو سارے ہنر چھپ جاتے ہیں اور جتنی باتیں عقل وشرع کی ہیں ان پر سینکڑوں پردے حوادث کے پڑ جاتے ہیں۔ مثلاً قاضی جب دل میں رشوت ٹھان لے تو پھر ظالم ومظلوم کو کیسے پہچان پائے گا؟ ایسا ہی حال اہل غرض کے دل کا ہوتا ہے کہ حصول غرض میں دیوانہ بن جاتا ہے۔

حضرت علی علیہ السلام نفس اور صبر کے تعلق کو واضح کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

''حرام کاموں سے نفس کو روکنا بھی صبر کی دوسری قسم ہے۔''

حضرت معروف کرخی رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے۔

''اے نفس! اخلاص کر، تاکہ خلاصی پائے، مخلص وہ شخص ہے جو اپنی نیکیوں کو بھی ایسے ہی چھپائے جیسے کہ اپنی برائیوں کو چھپاتا ہے۔''

حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ ہمیشہ اپنے نفس کو مخاطب کر کے فرمایا کرتے تھے۔

''اے نفس! تو باتیں تو ایسے کرتا ہے جیسے بڑا ہی کوئی صالح، عابد اور زاہد ہے۔ لیکن تیرے کام ریاکار، فاسقوں اور منافقوں کے ہیں۔ خدا کی قسم! مخلص لوگوں کی یہ صفات نہیں کہ ان میں باتیں ہوں اور عمل نہ ہو۔''

حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کا یہ قول اس واقعہ سے مزید واضح ہوتا ہے کہ ایک شیخ کامل کے چالیس ہزار مرید ہمہ وقت ان سے حصول فیض کی خاطر ان کے ہمراہ رہتے تھے۔ ایک مرتبہ وہ شیخ کامل ایک جنگل سے گزر رہے تھے۔ اتفاق سے بادشاہ وقت وہاں شکار کی غرض سے آیا ہوا تھا۔ بادشاہ نے جب شیخ کامل کے ہمراہ کثیر مجمع دیکھا تو جانا کہ یہ تو کوئی بہت خدا رسیدہ بندہ ہے۔ غرضیکہ بادشاہ نے اس شیخ کامل کے پاس جا کر کہا کہ حضور آپ کا فیض تو بڑا جاری ہے اور اتنی خلقت آپ پر جاں نثار ہے۔ اس پر شیخ نے کہا کہ یہ تو تیری نظر کا دھوکا ہے، میری نظر میں تو صرف ڈیڑھ ہی سچا ہے۔ بادشاہ یہ سن کر متجسس ہوا اور سوالیہ انداز

میں عرض کی کہ یا شیخ! اپنے اس قول کو ذرا مزید واضح کریں۔ شیخ نے کہا کہ ایک خیمہ لگاؤ اور دو بھیڑیں لا کر اس میں باندھ دو اور یہ تمام انتظام ان مریدین سے پوشیدہ رکھو۔ چنانچہ بادشاہ نے تمام انتظام کر دیا۔ پھر شیخ نے اپنے مریدین کو کہا کہ اس خیمہ کے پاس جمع ہو جائیں اور پھر ان سے مخاطب ہوئے کہ اللہ رب العزت کی جانب سے ایک آزمائش آن پڑی ہے اور اس کا ازالہ صرف اسی صورت میں ہے کہ آپ میں سے کسی ایک کو جان کی قربانی دینی پڑے گی۔ یہ سن کر تمام مریدین پر سکتہ طاری ہو گیا کیونکہ وہ اپنے شیخ کی جانب سے اس قسم کی فرمائش کی توقع نہ رکھتے تھے۔ پھر جب شیخ نے اپنے بیان پر مزید زور دیا تو ایک ضعیف شخص اٹھا اور حالت خوف میں کہا کہ حضور میں حاضر ہوں۔ چنانچہ شیخ اس شخص اور بادشاہ کے ہمراہ خیمہ میں چلا گیا اور اس شخص کو ایک جانب کھڑا کر دیا اور ایک بھیڑ لے کر اس کو ذبح کر دیا۔ جب بھیڑ کا خون خیمہ سے باہر کو بہہ گیا تو تمام مریدین پر لرزہ طاری ہو گیا اور ان میں سے آدھے مرید بھاگ کھڑے ہوئے کہ یہ تو شیخ نے واقعی اس شخص کو ذبح کر ڈالا۔ پھر شیخ خیمہ سے باہر آئے اور بچے کچے مریدین سے مخاطب ہو کر کہا کہ ابھی بھی آزمائش نہیں ٹلی اور یہ کہ ایک اور شخص کی قربانی مقصود ہے۔ یہ سننا تھا کہ مریدین نے آہستہ آہستہ سرکنا شروع کر دیا۔ بہرکیف کچھ دیر بعد ایک عورت اٹھی اور اپنے آپ کو قربانی کے لئے پیش کر دیا۔ شیخ اس عورت کو بھی خیمہ میں لے گئے اور اس کو بھی پہلے شخص کی طرح ایک طرف کھڑا کر دیا اور دوسری بھیڑ لے کر اس کو بھی ذبح کر دیا۔ جب اس بھیڑ کا خون بھی خیمہ سے باہر نکلا تو بچے کچے مریدین بھی پاؤں سر پر رکھ کر بھاگ کھڑے ہوئے اور میدان صاف ہو گیا۔ چنانچہ شیخ بادشاہ سے مخاطب ہوا کہ دیکھا میں نہ کہتا تھا کہ میری نظر سے دیکھو تو چالیس ہزار میں سے صرف ڈیڑھ ہی سچا ہے۔ بادشاہ نے کہا یا شیخ! آپ سچ فرماتے ہیں اور ڈیڑھ ہی سچا نکلا یعنی مرد پورا اور عورت آدھی۔ اس پر شیخ نے کہا اے بادشاہ! عورت آدھی نہیں بلکہ مرد آدھا ہے کیونکہ مرد نے پہلے قربانی ہوتی نہ دیکھی تھی لیکن عورت نے تو قربانی ہوتی دیکھی اور اس کے باوجود اپنی جانب کا نذرانہ پیش کرنے پر راضی ہوئی۔ پھر کہا کہ دیکھا

یہ دنیا گفتار کی غازی تو ہے لیکن عمل سے عاری ہے۔ بقول اقبال

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری

غور فرمائیے کہ حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ وہ شخص ہیں کہ جنہوں نے حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کا دودھ پیا، حضرت علی علیہ السلام سے خرقہ خلافت پہنا، سلسلہ چشتیہ، قادریہ اور سہروردیہ کے شیخ ہوئے۔ مگر نفس کو ہمیشہ ایسے ہی جھڑکا کرتے تھے تاکہ اس میں ریا پیدا نہ ہو اور ایک ہم نادان ہیں کہ اگر کسی پر احسان کرتے ہیں تو پھر اپنے اخلاص کا چرچا ڈنکے کی چوٹ پر کرتے ہیں۔

حضرت عیسیٰ بن معاذ رحمۃ اللہ علیہ سے کسی نے دریافت کیا کہ جب انسان اپنے نفس پر قابو پاتا ہے تو اس کی حالت کیا ہوتی ہے؟ تو آپ نے جواب دیا۔

''جب شیر خوار بچے کی طرح اس کی عادت ہو، شیر خوار بچے کی اگر کوئی تعریف کرے تو اسے خوشی نہیں لگتی، اگر خدمت کرے تو اسے بری نہیں معلوم ہوتی۔ جس طرح وہ اپنی خوشی اور دکھ سے بے پرواہ ہوتا ہے اسی طرح انسان جب مدح وذم کی پرواہ نہ کرے تو اس کو مخلص کہا جاسکتا ہے۔''

حضرت مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ''ذوق مدح، آفت نفس ہے'' اس سے تکبر وغرور پیدا ہوتا ہے۔ اس فریب انگیز اور ریا آمیز مدح کی مثال ایسے لقمہ خوش کی ہے جس کے اندر میٹھا زہر ملا ہو۔ اس کا مزہ تو آشکار ہے لیکن اس کی جاں سوز اور سیرت گداز سمیت پنہاں ہے۔ تیرا نفس تجھے دھوکا دیتا ہے کہ میں اس مداحی کا خریدار اور اس تعریف و توصیف کا طلب گار نہیں۔ یہ مداح تو محض اپنی غرض سے خوشامد کر رہا ہے۔ مگر میں اس سے کوئی اثر قبول نہیں کرتا۔ ذرا اس پر غور کرو کہ اگر وہ مداح انعام نہ پا کر تمہاری ہجو کرنے لگے تو تم کو اس سے دکھ ہوگا یا نہیں۔ مدح سے تو تب بے نیاز ہوسکتا ہے جب ہجو وذم کا بھی تیرے اوپر کوئی اثر نہ ہو۔ مدح، حلوے کی طرح میٹھی اور ہجو، خراب اور تلخ غذا کی طرح بدمزہ اور

کڑوی محسوس ہوتی ہے۔لیکن انجام کار نتیجہ دونوں کا خراب ہے۔زیادہ حلوا کھاتے رہنے سے بھی خون میں خرابی پیدا ہوتی ہے اور جسم پر پھوڑے نکل آتے ہیں اسی طرح اپنی تعریف سننے کا شوق بھی رفتہ رفتہ روح میں سرایت کرتا رہتا ہے اور انسان کی روحانی زندگی مسموم بناتا ہے۔خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ پسند نہ تھا کہ ان کے اصحاب رضی اللہ عنہما ان کو آتا دیکھ کر تعظیماً کھڑے ہو جائیں۔

امیر معاویہ سے روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

''جس شخص کو یہ بات مرغوب ہو کہ لوگ اس کی خدمت میں کھڑے رہیں، اس کا ٹھکانہ جہنم میں ہے۔''

حضرت ابو عبداللہ انطاکی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ قیامت کے دن ریاکار کو حکم ہوگا کہ جس شخص کو دکھانے کے لئے تو نے عمل کیا اس کا اجر اسی سے مانگ۔

حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

''جو شخص مجالس میں اپنے نفس کی مذمت کرے تو اس نے گویا مدح کی اور یہ ریا کی علامت ہے۔''

ان مثالوں اور اقوال سے ان مولویوں اور واعظوں کو یہ سبق لینا چاہئے کہ جو منبر پر کھڑے ہو کر اپنے تزکیہ نفس کی نمائش کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ میں ان حضرات کے سامنے کیا جرات رکھتا ہوں کہ بولوں، میں ان کے سامنے ہیچ ہوں، یہ ہوں اور وہ ہوں۔یہ سب کچھ کہہ کر یہ لوگ اپنے آپ کو اصل میں نیچا دکھانے کی کوشش نہیں کرتے ہیں اور یہ ان کی مدح بن جاتی ہے اور یہ سب کچھ دکھاوے اور ریا کے ضمن میں ہی آتا ہے۔

حضرت عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

''ایک شخص کعبے کا طواف کرتا ہے اور وہ خراسان کے لوگوں کیلئے ریا کرتا ہے۔ لوگوں نے آپ سے پوچھا کہ یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ تو آپ نے فرمایا کہ وہ طواف کرنے والا اس بات کی محبت رکھتا ہے کہ اہل خراسان اسے دیکھیں اور ایک

پاک نفس رکھنے والا تصور کریں اور یہ کہیں کہ یہ شخص مکے شریف کا مجاور ہے اور ہر وقت طواف وسعی میں رہتا ہے۔ جب اس نے یہ خیال کیا تو اس کے طواف میں سے اخلاص جاتا رہا۔''

حضرت غوث الاعظم رحمۃ اللہ علیہ پاکیزگی نفس کی نمائش کی مذمت کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

''اگر تو نے اللہ بھی بآواز بلند کہا تو اس کی بھی تجھ سے باز پرس ہوگی کہ خالصتاً کہا ہے یا فقط نفس کی پاکیزگی کو ظاہر کیا ہے۔''

حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں کہ ریاکار کی تین علامتیں ہیں۔ ''جب اکیلا ہو تو عبادت میں سستی کرے اور نوافل بیٹھ کر پڑھے اور جب لوگوں میں ہو تو سستی نہ کرے بلکہ عمل زیادہ کرے اور جب لوگ اس کی تعریف کریں تو عبادت زیادہ کرے اگر لوگ مذمت کریں تو چھوڑ دے۔''

حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت طاؤس رحمۃ اللہ علیہ کو دیکھا وہ حرم شریف میں ایک بہت بڑے حلقہ درس میں حدیث کی املاء فرما رہے تھے۔ حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نے قریب ہو کر ان کے کان میں کہا کہ اگر تیرا نفس تجھے عیب میں ڈالے یعنی اگر تیرے نفس کو یہ بات پسندیدہ معلوم ہوتی ہے تو اس مجلس سے اٹھ کھڑا ہو۔ حضرت طاؤس رحمۃ اللہ علیہ اسی وقت اٹھ کھڑے ہوئے اور حضرت ابراہیم بن ادھم رحمۃ اللہ علیہ کے حلقے میں تشریف لے گئے۔ تو آپ کے حلقہ درس کو دیکھ کر فرمانے لگے اگر یہ حلقہ کسی صحابی کا ہوتا تو اپنے نفس پر عجب سے بے خوف نہ ہوتا۔

حضرت سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ جب حدیث کی املاء کے لئے بیٹھتے تو نہایت خائف اور مرعوب بیٹھتے۔ اگر ان کے اوپر سے بادل گزرتا تو خاموش ہو جاتے اور فرماتے کہ میں ڈرتا ہوں کہ اس بادل میں پتھر نہ ہوں جو ہم پر برسائے جائیں۔

ایک شخص حضرت اعمش رحمۃ اللہ علیہ کے حلقے میں ہنسا تو آپ نے اس کو جھڑکا اور اٹھا

دیااور فرمایا۔

"تو علم طلب کرتا ہوا ہنستا ہے جس علم کی طلب کے لئے اللہ تعالیٰ نے تجھے مکلف فرمایا۔ پھر آپ نے دو ماہ تک اس کے ساتھ کلام نہ کیا۔"

حضرت سفیان بن عیینہ رحمۃ اللہ علیہ کو کہا گیا کہ آپ کیوں ہمارے ساتھ بیٹھ کر حدیثیں بیان نہیں کرتے؟ تو آپ نے فرمایا۔

"خدا کی قسم! میں تم کو اس بات کا اہل نہیں سمجھتا کہ تمہیں حدیثیں بیان کروں اور میں اپنے نفس کو بھی اہل نہیں سمجھتا کہ تم میرے جیسے شخص سے حدیثیں سنو۔"

حضرت عیسیٰ علیہ السلام اپنے حواریوں کو فرمایا کرتے تھے "جب تم روزہ رکھو تو سر اور داڑھی کو تیل لگاؤ اور اپنی حالت کو ایسی رکھو کہ کوئی معلوم نہ کر سکے کہ یہ روزے دار ہے۔"

حضرت عکرمہ رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے۔

"میں نے کوئی شخص اس شخص سے زیادہ بے عقل نہیں دیکھا جو اپنے نفس کی برائی جانتا ہے پھر وہ چاہتا ہے کہ لوگ مجھے عالم اور صالح سمجھیں۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ کوئی شخص کانٹے بوتا ہے اور چاہتا ہے کہ اس میں کھجوروں کا پھل لگے۔"

حضرت امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ "احیاء العلوم" میں رقم کرتے ہیں کہ ایک عابد کو جو کہ عرصہ دراز سے عبادت الٰہی میں مشغول تھا۔ لوگوں نے کہا کہ یہاں ایک قوم ہے جو ایک درخت کی پرستش کرتی ہے۔ عابد سن کر غضب میں آیا اور اس درخت کو کاٹنے کے لئے تیار ہو گیا۔ اس کو ابلیس ایک شخص کی صورت میں ملا اور پوچھا کہ کہاں جاتا ہے؟ عابد نے کہا کہ میں اس درخت کو کاٹنے کو جاتا ہوں جس کی لوگ پرستش کرتے ہیں۔ وہ کہنے لگا کہ تو فقیر آدمی ہے تمہیں ایسی کیا ضرورت پیش آگئی کہ تم نے اپنی عبادت اور ذکر و فکر کو چھوڑا اور اس کام میں لگ پڑا؟ عابد بولا یہ بھی میری عبادت ہے۔ ابلیس نے کہا میں تجھے ہرگز درخت کاٹنے نہیں دوں گا۔ اس پر دونوں میں لڑائی شروع ہو گئی۔ عابد نے شیطان کو نیچے ڈال لیا اور سینے پر بیٹھ گیا۔ ابلیس نے کہا کہ مجھے چھوڑ دے میں تیرے ساتھ ایک بات کرنا چاہتا

ہوں۔ وہ ہٹ گیا تو شیطان نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے تم پر اس درخت کا کاٹنا فرض نہیں کیا اور تو خود اس کی پوجا نہیں کرتا، پھر تجھے کیا ضرورت ہے کہ اس میں دخل دیتا ہے؟ کیا تو نبی ہے یا تجھے خدا نے حکم دیا ہے؟ اگر خدا کو اس درخت کا کاٹنا منظور ہوتا تو کسی اپنے نبی کو حکم بھیج کر کٹوا دیتا۔ عابد نے کہا میں ضرور کاٹوں گا پھر ان دونوں میں جنگ شروع ہوگئی اور عابد ایک بار پھر اس پر غالب آ گیا اور اس کو گرا کر اس کے سینے پر بیٹھ گیا۔ ابلیس عاجز آ گیا اور اس نے ایک اور تدبیر سوچی۔ کہا کہ میں ایک ایسی بات بتاتا ہوں جو میرے اور تیرے درمیان فیصلہ کرنے والی ہو اور وہ تیرے لئے بہت بہتر اور نافع ہے۔ عابد نے پوچھا وہ کیا ہے؟ اس نے کہا کہ مجھے چھوڑ دے تو میں تجھے بتاؤں۔ اس نے چھوڑ دیا تو ابلیس نے کہا کہ تو ایک فقیر آدمی ہے تیرے پاس کوئی شے نہیں اور لوگ تیرے نان و نفقہ کا خیال رکھتے ہیں۔ کیا تو نہیں چاہتا کہ تیرے پاس مال ہو اور تو اس سے اپنے خویش و اقارب کی خبر رکھے اور خود بھی لوگوں سے بے پرواہ ہو کر زندگی بسر کرے؟ اس نے کہا ہاں یہ بات تو دل چاہتا ہے۔ تو ابلیس نے کہا کہ اس درخت کو کاٹنے کے ارادے سے باز آ جاؤ تو میں ہر رات کو تیرے سر کے پاس دو دینار رکھ دیا کروں گا، سویرے اٹھ کر لے لیا کرنا۔ اپنے نفس پر اپنے اہل و عیال و دیگر اقارب و ہمسائے پر خرچ کیا کر، تیرے لئے یہ کام بہت مفید اور مسلمانوں کے لئے بہت نافع ہوگا۔ اگر یہ درخت تو کاٹے گا تو وہ اس کی جگہ اور درخت لگا لیں گے تو پھر اس میں کیا فائدہ ہوگا؟ عابد نے تھوڑا فکر کیا اور کہا کہ شیخ (ابلیس) نے سچ کہا میں کوئی نبی نہیں ہوں کہ اس کا قاطعہ مجھ پر لازم ہو اور نہ مجھے سبحانہ تعالیٰ نے اس کے کاٹنے کا امر فرمایا ہے کہ میں نہ کاٹنے سے گنہگار رہوں گا، جس بات کا اس شیخ نے ذکر کیا ہے وہ بے شک مفید ہے۔ یہ سوچ کر عابد نے منظور کر لیا اور پورا عہد کر کے واپس آ گیا۔ رات کو سویا، صبح اٹھا تو دو دینار اپنے سرہانے پا کر بہت خوش ہوا۔ اسی طرح دوسرے دن بھی دو دینار مل گئے۔ لیکن پھر، تیسرے دن کچھ نہ ملا تو عابد کو غصہ آیا اور پھر درخت کاٹنے کے ارادے سے اٹھ کھڑا ہوا۔ پھر ابلیس اسی صورت میں سامنے آ گیا اور کہنے لگا کہ اب کہاں کا ارادہ ہے؟ عابد نے کہا میں درخت

کاٹوں گا۔ اس نے کہا میں ہرگز نہیں جانے دوں گا۔ اسی تکرار میں ان دونوں میں کشتی ہوئی۔ ابلیس نے عابد کو گرا لیا اور سینے پر بیٹھ گیا اور کہنے لگا کہ اگر اس ارادے سے باز آ جاؤ تو بہتر ہے ورنہ تجھے ذبح کر ڈالوں گا۔ عابد نے معلوم کیا کہ مجھ میں اب اس کے مقابلے کی طاقت نہیں تو کہنے لگا کی وجہ بتاؤ کہ کل تم کو میں نے بچھاڑ لیا تھا، آج تو غالب آ گیا ہے۔ شیطان بولا کہ کل تو خالص خدا کے لئے درخت کاٹنے کو نکلا تھا اور تیری نیت میں اخلاص تھا۔ لیکن آج تو اپنے نفس کا غلام ہو کر آ رہا ہے اور تیرے ارادے میں راہ خدا نہیں۔ بلکہ دو دیناروں کے نہ ملنے کا غصہ ہے اس لئے میں آج تجھ پر غالب آ گیا ہوں۔

اس حکایت سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ شیطان، نفس سے آزاد مخلص بندوں پر غلبہ حاصل نہیں کر سکتا۔ ایک اور روایت میں آتا ہے کہ ایک دفعہ حضرت علی علیہ السلام مسجد میں لیٹے آرام فرما رہے تھے اور ایک شخص ان کے پاس نماز ادا کر رہا تھا۔ اسی اثناء میں شیطان ایک اعرابی کا روپ دھار کر مسجد کے دروازے پر آن کھڑا ہوا۔ ایک شخص نے اس سے پوچھا کہ بھائی یہاں دروازے میں کیوں کھڑے ہو؟ تو شیطان نے جواب دیا کہ میں اس شخص کی نماز میں خلل پیدا کرنا چاہتا ہوں۔ تو اس شخص نے کہا کہ پھر آگے بڑھ کر کیوں ایسا نہیں کرتے؟ تو شیطان نے جواب دیا کہ اس کے پاس جو شخص لیٹا ہوا ہے، میں اس سے خوف زدہ ہوں۔

اس لئے اللہ ارشاد فرماتا ہے۔

"تو معلوم ہوا کہ بندہ شیطان سے اخلاص کے سوا بچ نہیں سکتا۔"

حضرت مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ اس حقیقت کو یوں بیان کرتے ہیں۔

"شیطان، انسان سے کوئی مستقل وجود نہیں رکھتا۔ نفس امارہ اور شیطان ایک ہی معنی کی دو مختلف صورتیں ہیں۔ اسی طرح عقل جو حیات و کائنات میں کارفرما ہے وہ ملائکہ کی ہم ذات اور ہم زاد ہے۔ قادر مطلق نے ایک ہی حقیقت کی دو صورتیں بنا دی ہیں۔ مولانا کا یہی عقیدہ ان کے ملفوظات "فیہ ما فیہ" میں بھی ملتا

ہے۔ جہاں وہ ملائکہ کو عقل کل کی صورتیں قرار دیتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ موم کے پرندے بنائے جا سکتے ہیں لیکن جب ان کو پگھلاؤ گے تو ان میں سے موم کے سوا کچھ نہ نکلے گا۔ اسی طرح ملائکہ کی صورتوں کو اگر ایک معنی میں ضم کر دیا جائے تو عقل کے سوا اور کچھ ان میں نہ ہوگا۔ شیطان، انسان کے اندر ہی ہے اور اس نفس کے باہر اس کا کوئی مقام نہیں۔ وہ خون کی طرح انسان کے رگ و پے میں گردش کرتا ہے۔"

ذوق کا شعر ہے۔

کیا ہنسی آتی ہے مجھ کو حضرت انسان پر
فعل بد تو خود کریں لعنت کریں شیطان پر

عقل حقیقت شناس اور نفس امارہ کی پیکار سے مولانا نے نادر نکات پیدا کئے ہیں۔ لیکن مجنوں اور اس کی اونٹنی کی مثال لاجواب ہے۔

فرماتے ہیں کہ مجنوں اپنی اونٹنی پر سوار ہو کر لیلیٰ کی ملاقات کے لئے جا رہا تھا۔ لیکن اونٹنی جو اپنا بچہ مجنوں کے گھر چھوڑ آئی تھی وہ بچے کی کشش کی وجہ سے آگے بڑھنا نہ چاہتی تھی۔ جہاں مجنوں اپنی دھن میں غافل ہوا اور مہار ڈھیلی ہوئی وہیں اونٹنی منزل لیلیٰ کی طرف گام فرسا ہونے کی بجائے الٹی اپنے گھر کی طرف پھری۔ پھر مجنوں ذرا ہوشیار ہوا اور اس کو راہ پر ڈالا۔ لیکن تھوڑی دور جانے کے بعد وہی معاملہ ہوا کہ مجنوں کی غفلت کی وجہ سے ناقۂ مجنوں واپس۔ غرض یہ کہ منزل مقصود پر پہنچنا محال ہو گیا۔ یہی حال عقل اور نفس امارہ کے جذبات کا ہے۔ عقل انسان کو راہ راست پر لانا چاہتی ہے تا کہ انسان اپنی منزل مقصود پر پہنچے۔ لیکن ذرا سی غفلت سے طے کیا ہوا راستہ دوبارہ طے کرنا پڑتا ہے اور انسان کولہو کے بیل کی طرح وہیں چکر کھاتا رہتا ہے۔ نفس امارہ سے خدا تک دو قدم کا راستہ ہے لیکن انسان حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم کی طرح برسوں بیاباں میں سرگرداں گھومتا رہتا ہے۔ مجنوں نے آخر تنگ آ کر اپنے آپ کو اس اونٹنی سے نیچے گرا دیا کہ اس قسم کی متضاد میلان سواری

سے تو پیدل چلنا بہتر ہے۔ زور سے جو گرا تو اس کے پاؤں ٹوٹ گئے۔ اس پر بھی وہ منزل لیلیٰ کی طرف بڑھنے سے باز نہ آیا اور کہا کہ اچھا پاؤں نہیں تو میں گیند کی طرح لڑھکتا ہوا سفر طے کر لوں گا۔ بہر حال اس نفس امارہ سے نجات خشوع و خضوع، ذکر و فکر، توبہ، تقویٰ اور توکل سے لائے گئے انقلاب میں مضمر ہے۔ وہ انقلاب ایسا ہے کہ نفس امارہ نفس لوامہ میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ نفس امارہ وہ ہے جو شر پر اکساتا ہے اور نفس لوامہ وہ ہے کہ شر پر تو اس طرح نادم ہو کہ کیوں کیا اور خیر پر اس طرح نادم ہو کہ کیوں نہ کیا۔ ترقی کی راہ پر یہ محض پہلا اور ابتدائی قدم ہے، اصل مقصد تو نفس مطمئنہ کا حصول ہے۔

احادیث سے ثابت ہے کہ انسان کو عبودیت بجالانے اور نفس کو پاک اور صاف کرنے کا اختیار ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے بالکل صاف صاف ارشاد فرمایا ہے۔

"البتہ اس نے فلاح پائی جس نے (اپنے نفس) کا تزکیہ کیا۔" (اعلیٰ:14)

یعنی مجاہدہ کی تلوار اور خواہشات نفس کی مخالفت سے نفس کی کدورتوں اور آلائشوں کو کاٹ کر صاف کر دیا۔

حضرت امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عبداللہ بن ہشام رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کیا ہے۔

"حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! آپ میرے نزدیک ہر چیز سے زیادہ محبوب ہیں۔ بجز میرے نفس کے جو میرے پہلو میں ہے (یعنی وہ تو بہت ہی محبوب ہے)۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم میں کوئی مومن نہیں ہو سکتا کہ جب تک خود اس کے نفس سے زیادہ اس کو محبوب نہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ قسم ہے اس ذات کی جس نے آپ پر کتاب نازل فرمائی کہ آپ میرے نزدیک میرے اس نفس سے بھی زیادہ محبوب ہیں جو میرے پہلو میں ہے۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بس اب بات ٹھیک ہوئی۔"

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اول محبت بلا اسباب کو محبت بالاسباب سے اقوی سمجھ کر نفس کو مستثنیٰ کیا۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے کہ "اسے نفس سے بھی زیادہ محبوب رکھنا ضروری ہے۔" یہ سمجھ گئے کہ اقوی ہونے کا مدار کوئی ایسا امر ہے کہ اس کے اعتبار سے کوئی چیز نفس سے بھی زیادہ محبوب ہو سکتی ہے۔ مثلاً یہ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خوشی کو نفس کی خوشی پر طبعاً مقدم پایا۔

حضرت محمد بن علیان نسوی رحمۃ اللہ علیہ جو حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ کے لائق احترام دوستوں میں سے تھے۔ بیان کرتے ہیں کہ ایک روز میں نے نفس کو لومڑی کے بچے کی شکل میں دیکھا اور اس پر پاؤں رکھ کر اس کو روندے رکھا مگر وہ پھیلتا ہی گیا۔ میں نے پوچھا اے نفس! ہر چیز مارنے اور مجروح ہونے سے ہلاک ہو جاتی ہے لیکن تو کیوں پھیلتا جا رہا ہے؟ نفس نے کہا اس لئے کہ میری پیدائش الٹی ہے اور دل کو جو چیز تکلیف پہنچاتی ہے اس سے مجھے راحت ہوتی ہے اور جو چیز دوسروں کو راحت دیتی ہے اس سے مجھے تکلیف ہوتی ہے۔

ایک دوسرے بزرگ نے نفس کو چوہے کی شکل میں دیکھا اور پوچھا تو کون ہے؟ اس نے جواب دیا میں غافلوں کو ہلاکت میں پھنسانے والا اور شرارت اور برائی کی راہ پر چلانے والا ہوں۔ مگر خدا کے دوستوں کی نجات بھی ہوں کیونکہ میرا وجود آفت سے ہے۔ اگر میں اس کے ساتھ نہ ہوں تو اپنی پاکیزگی اور طہارت پر مغرور ہو کر اپنے افعال پر تکبر کرنے لگوں۔

حضرت ذوالنون مصری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں نے ایک شخص کو ہوا میں اڑتے دیکھا اور اس سے پوچھا کہ تمہیں یہ درجہ کیسے حاصل ہوا؟ اس نے جواب دیا میں ہوائے نفس پر پاؤں رکھ کر ہوا میں اڑا جاتا ہوں۔ ایک دوسری روایت کے مطابق یہ ہوا تین سو ساٹھ قسم کی الوہیت کا لباس پہن کر انسان کو ہر روز گمراہی کی طرف بلاتی ہے۔

مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ اس حقیقت کو اس طرح سے بیان فرماتے ہیں۔

''جس طرح انسان کے جسم کے اندر کوئی باریک کانٹا چبھ کر زیر جلد چھپ جاتا ہے اور اس کا نکلنا دشوار ہو جاتا ہے۔اسی طرح انسان کی نفسی زندگی میں بعض ناقابل اظہار آرزوؤں اور خواہشوں کے باریک کانٹے دل کے اندر چبھ کر چھپ جاتے ہیں۔جس کے نفس میں یہ کانٹے چبھتے ہیں اس میں بے حد خلش اور بے چینی پیدا کرتے ہیں۔لیکن خود مظلوم کی نظر سے اوجھل ہوتے ہیں کیونکہ تحت الشعور میں گھس گئے ہیں اور شعور کی دسترس سے باہر ہو گئے ہیں۔جب تک کوئی طبیب نفسی، سوزن تحقیق سے ان کو نہ نکالے وہ برابر تکلیف دیتے رہتے ہیں۔انسان اضطراب میں جتنے ہاتھ پاؤں مارتا ہے اتنا ہی مرض میں اور اضافہ ہوتا ہے یعنی انسان اپنی نفسانی خواہشات کی تسلی کے لئے جب ان خواہشات پر پانی ڈالنے کی کوشش کرتا ہے تو وہ پانی ان پر تیل کا کام کرتا ہے۔''

حضرت غوث الاعظم رحمۃ اللہ علیہ دنیا میں ڈوبے نفس سے مخاطب ہو کر فرماتے ہیں۔

''تجھ جیسے ہزاروں کو دنیا نے موٹا کیا اور پھر نگل گئی۔''

یہ انسان کا دل ہی تو ہے جس میں برائی اور بھلائی دونوں قسم کی خواہشیں ابھرتی ہیں۔ مگر جہاں بری خواہشوں نے سر نکالا، وہاں انسان کے ہاتھ پیر بھی ان کے ساتھ چل نکلے۔ انسان نے وہ کر دکھایا جو اس نے دیکھا نہ تھا۔لیکن جہاں بھی تمنائیں ابھریں انسان کے اعضاء بھی ان کے ساتھ ہو گئے۔اب اسی انسان نے وہ کر دکھایا جس کے لئے وہ پیدا کیا گیا تھا۔یعنی اپنے لئے بھلائی اور دوسرے کے لئے نیکی۔فرعون کو اس دبی ہوئی خواہشوں ہی نے تو اس حد تک پہنچا دیا کہ کج فہم نفس کے دھوکے میں آ کر خود کو خدا سمجھ بیٹھا۔

اللہ تعالیٰ کے دامن رحمت کی وسعت دیکھئے، اپنے حریف کو سمجھانے میں بھی دریغ روا نہیں اور حضرت موسیٰ علیہ السلام سے فرمایا۔

''فرعون سرکشی میں اتر آیا ہے۔اے موسیٰ علیہ السلام! اس سے کہئے کہ کیا تم اپنے دل کو پاکیزگی سے مالا مال نہیں کرو گے۔''

یعنی فرعون کے دل سے غرور اور تکبر کا بھوت نکال کر اسے پاک کیجئے۔ مگر بدنصیب فرعون بری طرح نفس امارہ کے پھندے میں الجھ چکا تھا۔ اس نے الٹا رسول خدا حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جادوگر اور ساحر بتایا۔ یہی حال ہر اس شخص کا ہے جو قرآن مجید کی کسی ایک بات کا انکار کرتا ہے۔ یعنی وہ اس حقیقت میں فرعون سے مشابہ ہے، اس کا دل پاک نہیں۔ بلکہ اس میں بڑی خواہشوں کا غلبہ ہے۔ ایسے شخص کا علاج یہ ہے کہ وہ اپنے دل کو قرآن مجید کی ہر وہ بات تسلیم کر کے اس پر عمل کرے جس سے اس کا دل انکار کرتا ہے۔ غور فرمائیے! اگر دل ہی کی حکمرانی صحیح ہوتی تو اس دنیا کا نقشہ کیا ہوتا؟ کس کا دل نہیں چاہتا کہ اپنے دشمن کو قتل کر کے اپنا کلیجہ ٹھنڈا کرے۔ مگر قانون اسے ڈراتا ہے کہ اگر تم نے ایسا کیا تو تم بھی قتل کئے جاؤ گے۔ اسی طرح دل کے فرمان بھی اور ہیں۔ جن پر چل کر انسان تباہی کرنے کے باوجود بھی نفع حاصل نہیں کر سکتا اور دوسری طرف قانون ہے، یعنی خدا کا قانون۔

جیسا کہ حدیث مصطفیٰ ﷺ میں ہے۔

''قومیں ترقی کرتی ہیں اور اسے (قرآن کو) چھوڑ کر تنزلی سے دوچار ہوتی ہیں۔'' (مسلم، صفحہ 272، جلد اول)

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اللہ کے اس قانون پر عمل کیا اور وہ دنیا پر غالب آئے۔ پھر انہوں نے جس قوم پر حکومت کی خود اس قوم نے انہیں اپنے لئے سبب رحمت سمجھا۔ لیکن تزکیہ نفس کا مدار مشیت الٰہی پر ہے اور قیام صلوٰۃ پر منحصر ہے اور خوف عاقبت پر موقوف ہے۔

ارشاد الٰہی ہے۔

''اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم! آپ صلی اللہ علیہ وسلم انہی لوگوں کو خدا سے ڈرا سکتے ہیں جو اسے بے دیکھے مان چکے ہیں اور وہ نمازیں باقاعدگی سے ادا کرتے ہیں اور جو شخص خود کو گناہوں سے پاک کرے خود اسی کا تو اس میں بھلا ہے اور (بھلے برے سب کو) لوٹنا ہے حضور الٰہی میں۔ اور جس شخص نے اپنے قلب کو گناہوں پر راغب ہونے سے بچا لیا وہ کامیاب ہوا اور خود کو دل کے بھروسے پر چھوڑ دینے

والا بد نصیب تباہ و برباد ہو کر رہ گیا۔'' فاطر:18)

ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

''وہ کامیاب ہوا جس نے دل کو پاک کر لیا اور نامراد ہے جس نے اسے معصیت میں چھپایا۔'' (شمس:9-10)

دل ذکر الٰہی سے نیکی کی طرف راغب ہوتا ہے اور ذکر اللہ اس کی عبادت بھی ہے۔ اس کے بندوں کے ساتھ نیک برتاؤ بھی گویا اس کا ذکر ہے۔ دنیا میں رہ کر ہر شے کا مناسب استعمال بھی اللہ کی عبادت ہی ہے اور ذکر سے دل کو سکون حاصل ہوتا ہے۔ البتہ ذکر کی قسموں میں بہتر قسم عبادت میں اللہ تعالیٰ کا ذکر سب سے افضل ہے کہ اسی سے دوسری باتوں پر توجہ ہو سکتی ہے۔

ارشاد ہوتا ہے۔

''جو لوگ ایمان لے آئے اور (اب) ان کے دل بھی ذکر الٰہی سے تسکین حاصل کرنے لگے۔ (اے لوگو!) تم آگاہ رہو کہ اللہ کا ذکر دلوں کی ڈھارس۔''

(رعد:28)

اس کی یاد سے دلوں کا زنگ دور ہوتا ہے۔ یہی معنی ہیں کہ ذکر الٰہی سے قلوب کی تسکین حاصل ہوتی ہے۔

فتوح الغیب میں حضرت سید عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ جہاد اکبر کی تعریف کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

''تو ایک مرتبہ نفس سے مجاہدہ کر کے مخالفت کی تلوار سے اس کو قتل کر دے گا تو اللہ تعالیٰ پھر اس کو زندہ کر دے گا تا کہ وہ نفس پھر تجھ سے لڑے اور حرام و حلال اور خواہشوں اور لذتوں وغیرہ کا طالب ہو۔''

مطلب یہ کہ دوبارہ مجاہدہ کرے اور یہ ثواب دائمی لکھا جائے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے بھی یہی معنی ہیں۔

''ہم چھوٹے جہاد سے بڑے جہاد کی طرف پھرے ہیں۔''

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مراد اس سے جہاد نفس ہے۔ اس لئے کہ وہ ہمیشہ شہوتوں، لذتوں اور نافرمانیوں میں غرق رہتا ہے اور یہی معنی ارشاد الٰہی کے ہیں۔

''اپنے رب کی عبادت کر حتیٰ کہ تجھ کو یقین (یعنی موت) آجائے۔'' (الحجر:99)

اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب کو عبادت کا حکم فرمایا اور وہ عبادت نفس کی مخالفت ہے۔ کیونکہ نفس تمام عبادتوں کا انکار کرتا ہے اس کی ضد کا طالب ہوتا ہے۔ حالانکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے اپنا نفس ہی نہیں۔

ارشاد الٰہی ہے۔

''وہ (حبیب صلی اللہ علیہ وسلم) نہیں بولتا اپنی خواہش سے مگر وہ جو انہیں وحی کی جاتی ہے۔'' (نجم:3)

اس لئے کہا جا سکتا ہے کہ اللہ رب العزت نے اپنے محبوب محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کو اس خطاب ''و اعبد ربک حتیٰ یاتیک الیقین'' سے مخاطب فرمایا ہے کہ اس کی شرع مقرر ہو جائے اور امت کے درمیان حکم عام ہو جائے حتیٰ کہ روز آخر آجائے اور اپنے نبی کو ہوائے نفس پر قوت عطا فرمائی کہ اس کو ضرر نہ پہنچا سکے اور اس کو جنگ اور لڑائی کی جانب محتاج نہ کریں، بخلاف اس کی امت کے۔ پس اگر ہمیشہ مومن نفس کے ساتھ مجاہدہ کرتا رہے حتیٰ کہ اس کو موت آجائے اور اللہ تعالیٰ سے ملے مع اس تلوار کے جو خواہشوں کے خون میں تر ہو تو اسے اللہ عطا فرمائے گا کہ جس کے لئے وہ ضامن ہوا ہے یعنی ''راحت القلوب''۔

حضرت بابا فرید گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ کا یہ ارشاد حضرت نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ رقم فرماتے ہیں کہ میرے شیخ نے ارشاد فرمایا۔

''اسرار العارفین میں لکھا ہے کہ خلوت چالیس روز کی ہوتی ہے اور بعض نے کہا کہ ستر روز کی بعض کی رائے ہے کہ ننانوے روز کی۔ لیکن معتبر وہی ہے جو شیخ عبداللہ تشتری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے۔ مگر طبقہ جنیدیہ میں بارہ سال ہے اور

بصریہ کے نزدیک بیس سال۔'' (ملفوظات بابا فرید گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ)

اہل سلوک کے قول کے مطابق یقین سے مقصود یہ ہے کہ نفس امارہ کو عبادت کے سبب زیر کیا جائے اور نفس کے کتے کو قید کیا جائے۔

حضرت بابا فرید گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ کا یہ ارشاد حضرت نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں کہ بابا فرید گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا

''میں نے بغداد کے باہر نماز میں ایک درویش دیکھا جس کے بدن پر ہڈیاں اور چمڑا تھا، گوشت کا نام تک نہیں تھا۔ میرے دل میں خیال آیا کہ بزرگ جنگل میں رہتا ہے اس کی کیا حالت ہو گئی ہے۔ مجھے مخاطب کر کے بزرگ نے فرمایا اے فرید! چالیس سال سے میں اس غار میں رہتا ہوں، گھاس اور تنکوں پر میرا گزارہ ہے۔ جب بھید کھلا تو میں آداب بجالایا اور کہانی الواقع ایسا ہی ہے۔ چند روز رہ کر ورزش نفس کی اور پھر وہاں سے چل دیا۔''

ایک انگریزی تصنیف Message of the Prophet میں حضرت امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کا تبصرہ نفس کچھ اس انداز میں پیش کیا گیا ہے۔

"There are three stages for the human soul through which it passes on to perfection these stages are derived from the content of the Quran. The first stage is "Al Nafs-Alamarah". The irrational in man It often commands to evil and whispers dark suggestions to man It's desires are solely geared to the satisfaction of the flesh. This characteristic of the soul must be restrained by man, with due patience and contentment in seeking God's grace. while shunning the pomp and glitter of thie life.

The second stage is "Nafs Al-Lawwamah". The self reproaching soul in which the conscience of man often corrects the down ward trends of his behaviour. At this stage, man is often in a dilema between the two attractions of good and evil. Whenever he succumbs to an evil deed his soul becomes constrained as if he were in poor spirit amidst wordly affluence. Then he repents, turns towards. God and makes amends. He stives to shunn evil prctices in favour of good ones, and eventually gains for giveness and reward from God. The third and final stage of progressive righteousness in man is called "Nafs al-mutmainnah" The soul at complete rest and satisfaction with God. This is the highest soul in man, at which stage he avoids evil and does the right as a matter of course; as if righteousness of avoidences and evil have become part of his mature. At this stage man is evidently superior to the angels. This is the highest level of dignith that man can possess in relation to God, his creator"

حضرت یعقوب علیہ السلام کے بارہ لڑکے تھے۔ ایک ان میں سے غائب ہو گیا اور اس کے غائب ہونے سے حضرت یعقوب علیہ السلام کا جو حال ہوا وہ صرف ایک باپ ہی جان سکتا ہے۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کو ہوش آیا تو اولاد کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا اے بیٹو! مجھے تم سے یہ گمان نہ تھا کہ تمہارے نفس نے تمہارے لئے بری بات بنائی ہے۔ حضرت یعقوب علیہ السلام نے ان کے گناہ کی نسبت ان کے نفس کی طرف اس سبب سے کی کہ سب

عیب اور بیماریاں نفس ہی میں ہیں اور یہ تو مشہور ہے کہ "نفس ہی خدا سے شرمندہ ہے۔"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"بدگمانی حرام ہے۔"

بعض عالموں نے کہا کہ

"نفس، خدا کی درگاہ میں شرمندہ ہے اور احباب کی اس پر لعنت ہے۔"

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

"نفس برائی کا حکم کرتا ہے۔" (یوسف:53)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔

"جو شخص اپنے نفس اور اپنی خواہشات پر غالب نہیں اس کا آخرت میں کچھ حصہ نہیں۔"

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

"جو اللہ کی حدوں سے آگے بڑھا بیشک اس نے اپنی جان پر ظلم کیا۔" (طلاق:1)

یعنی جس نے اپنے نفس کے ارادے اور اپنے نفس کی خواہشات کو اختیار کیا اس کا ٹھکانہ جہنم ہے۔

روایت ہے کہ حسن بن زید رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے باپ کے مرنے کے دو برس بعد اس کو خواب میں دیکھا کہ لال رنگ کے کپڑے پہنے ہوئے ہے۔ دریافت کیا کہ کیا سبب ہے کہ آپ کو دوزخیوں کی شکل میں دیکھتا ہوں؟ باپ نے جواب دیا کہ میرا نفس اور میری خواہش مجھے دوزخ کی طرف کھینچ لائی ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"اپنے آستین اس سے بچا کہ تیرا نفس تجھ پر غالب ہو جائے۔"

پھر ایک اور جگہ فرمایا۔

"تیرا سب سے بڑا دشمن تیرا نفس ہے جو تیرے دونوں پہلوؤں کے درمیان ہے۔"

حضرت مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ انسانی نفس کو حیوان سے تشبیہ دیتے ہوئے فرماتے ہیں۔

"ہر انسان میں ایک جانور کی صفت نمایاں ہو جاتی ہے۔ کوئی صفت کے لحاظ سے مکاری میں لومڑ، کوئی بہادری میں شیر، کوئی بزدلی میں بکرا اور کوئی ہم جنسوں کے ساتھ لڑنے اور غیروں کے ساتھ وفاداری برتنے میں کتا ہے۔"

کہتے ہیں کہ صوفیاء اور انبیاء علیہ السلام کو عالم مثال میں اکثر انسانوں کی سیرتیں اسی طرح متمثل نظر آتی ہیں۔ جس میں جس جانور کی صفت ہے ان کو وہ ویسا ہی دکھائی دیتا ہے۔ حشر میں بھی انسانوں کی یہی مثالیں نظر آئیں گی۔ مولانا فرماتے ہیں کہ اپنے وجود کی اس کیفیت سے بے خوف نہ رہو۔ یہ نہ سمجھو کہ میں انسان کی صورت میں آ کر تمام حیوانوں سے افضل ہو گیا ہوں کیونکہ سب حیوانات تمہارے اندر ابھی تک موجود ہیں۔ اس زندگی میں جو سیرت تم پر غالب ہو گی تمہارا حشر بھی اسی صورت پر ہو گا۔ لیکن اکثر انسانوں کے اندر اچھے اور برے معاملات ملے جلے پائے جاتے ہیں۔ مطلق نیکی اور مطلق بدی کی توقع خلاف واقعہ ہے۔ انسانوں کی حالت بدلتی رہتی ہے۔ کسی وقت وہی انسان بھیڑیا معلوم ہوتا ہے اور دوسرے وقت یوسف کنعان کا سا کوئی اچھا عمل کر دکھاتا ہے۔ لہٰذا ہر انسان کو بحیثیت مجموعی دیکھنا چاہئے کہ کون سی صفت اس کے اندر غالب ہے اور اس پر حکم لگانا چاہئے۔ حشر میں بھی انسان کی صورت اس کی غالب سیرت کے مطابق ہو گی۔ اگر سونے میں تھوڑا سا تانبا بھی ملا ہو تو بھی لوگ اسے سونا ہی شمار کرتے ہیں۔ اگرچہ یہ کہتے ہیں کہ یہ سونا خالص نہیں، کوئی اس سونے کی ڈلی کو تانبا نہیں کہتا

ہم زماں در سینہ نوح سر کند
گاہ دیو و گہ ملک کے دام و در

حکم خود آں راست کو غالب تر است
چوں کہ از بیں از مس آمد آن زر است
ساعتے گرگے در آید در بشر
ساعتے یوسف رخے ہمچو قمر
سیرتے کاں در و جودت غالب است
ہم برآں تصویر وحشت واجب است

حضرت سہیل بن عبداللہ تشتری رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں۔

''نفس خواہشوں سے بھرا ہوتا ہے اور دنیا آفتوں سے بھری ہوئی ہے اگر تو اس کی کچھ تدبیر نہیں کرے گا تو دوزخ کی طبقات میں گر پڑے گا۔''

حضرت ابوالحسن خرقانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

''اگر کوئی ایک آرزو نفس کی پوری کرے تو اس کے لئے سینکڑوں خشتے (کانٹے) اللہ تعالیٰ کی راہ میں پیدا ہو جاتے ہیں۔''

ایک اور بزرگ خوف خدا میں اپنی حقیقت کو بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

''میں چار چیزوں میں مبتلا ہوں اور یہ چاروں چیزیں میری بدبختی اور امتحان کے لئے مقرر کی گئی ہیں۔ وہ چاروں چیزیں یہ ہیں۔ ابلیس، نفس، دنیا اور خواہش۔ میری رہائی کیونکر ممکن ہے جبکہ سب کے سب میرے دشمن ہیں۔ ابلیس ہلا کی کی سی راہ میں مجھے لے جاتا ہے، نفس مجھے معصیت کا حکم کرتا ہے، دل کے خیالات مجھے خواہش کی طرف بلاتے ہیں اور دنیا کی آرائش وزیبائش کہتی ہے کہ تو میرا لباس فاخرہ اور میرا حسن نہیں دیکھتا۔ اے خدا! تو ہر حالت میں میرا کارساز ہے۔ ان سب کے لشکروں نے میرے شہر کی فصیل کا احاطہ اور محاصرہ کرلیا ہے، سختی کے وقت ان دشمنوں سے بچا۔''

روایت ہے کہ ہارون الرشید نے قسم کھائی کہ اگر میں اہل جنت میں سے نہ ہوں تو

میری بیوی پر طلاق ہے۔ سب مفتیوں کو جمع کیا کسی نے اس کو فتویٰ نہ دیا۔ اتفاقاً ابن سماک، ہارون الرشید کے پاس آئے اور کہا اے ہارون! میں تم کو غمگین اور فکر مند دیکھتا ہوں، اس کا کیا سبب ہے؟ ہارون الرشید نے اپنا حال بیان کیا۔ ابن سماک نے ہارون الرشید سے کہا میں آپ سے ایک بات پوچھتا ہوں اگر آپ نے سچ بتا دیا تو میں آپ کو آپ کی بیوی کے ساتھ رہنے کی اجازت دے دوں گا۔ ہارون الرشید نے کہا جو چاہے پوچھئے۔ ابن سماک نے دریافت کیا کبھی ایسا اتفاق ہوا ہے کہ قدرت کی حالت میں کسی قسم کی لغزش یا کسی قسم کے گناہ کا آپ نے قصداً ارادہ کیا ہو اور پھر خدا کے ڈر سے اسے چھوڑ دیا اور اس سے نفرت کی ہو؟ ہارون الرشید نے کہا ہاں، ایسا اتفاق ہوا ہے۔ میں ایک عورت پر فدا اور عاشق ہو گیا تھا اور میں اس عورت کے پاس آیا اور وہ شب، شب جمعہ تھی اور جب وہ عورت میرے پاس آئی اور میرا بھی قصداً ارادہ ہو گیا تو اس وقت مجھے جمعے کی رات کی فضیلت یاد آئی، میں نے خوف خدا سے اسے چھوڑ دیا اور اپنے نفس کی مخالفت کی۔ ابن سماک نے کہا اے ہارون! تو اہل جنت میں سے ہے۔ طلاق واقع نہیں ہوئی۔ سارے فقیہ غل مچانے لگے اور کہنے لگے یہ فتویٰ آپ نے کہاں سے دیا؟ ابن سماک نے کہا اللہ تعالیٰ کے قول یعنی ''جو شخص خدا کے سامنے سے ڈرا اور اس نے اپنے نفس کو خواہش سے روکا اس کا ٹھکانہ جنت ہے۔'' (النازعات: 40-41) سب عالموں نے یہ سن کر سر جھکا لیا اور ہارون الرشید بہت خوش ہوا اور ابن سماک کو بہت انعام دیا۔

حضرت یعقوب علیہ السلام نے ارشاد فرمایا:

''صبر کے سوا میرے لئے اور کوئی تدبیر نہیں۔''

اب جبکہ ہم کسی حد تک حقیقت نفس اور تزکیہ نفس کی خصوصیات کو سمجھ چکے ہیں تو ضروری ہے کہ مجاہدہ نفس کے فلسفہ سے بھی مختصراً جانچ حاصل کر لی جائے۔

مجاہدہ دو طریق پر رہتے ہوئے کیا جا سکتا ہے۔ ایک وہ کہ جب عقل راضی ہو لیکن دل برخلاف ہو۔ دوسرے وہ کہ جب دل راضی ہو لیکن عقل کا سرکش گھوڑا بے قابو ہو۔ ان

دونوں صورتوں میں مجاہدہ فقط اسی وقت کامل کہلائے گا کہ جب دونوں ایک نقطہ پر متفق ہوں۔لیکن دل کو راضی کرنا زیادہ مشقت طلب ہے کیونکہ دل سوز مانگتا ہے۔لیکن عقل دلائل پر اپنی حقیقت منواتی ہے۔ دلائل ذاتی مفادات کی بناء پر من گھڑت بھی ہو سکتے ہیں۔لیکن دل کا سوز من گھڑت نہیں ہوسکتا۔ بلکہ ایک مکمل حقیقت کا عکاس ہوتا ہے اور خالصیت رکھتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ صوفیاء نے توجہ قلب پر بہت اہمیت دی ہے۔ چونکہ یہ عمل مشقت طلب ہے اس لئے اس کیفیت میں استحکام اور پائیداری زیادہ ہے بہ نسبت دلائل کے۔ کیونکہ دلائل آسانی سے جنم لیتے ہیں اس لئے مشقت کم رکھتے ہیں۔جس بناء پر غیر پائیدار ہوتے ہیں اور ہلکی سی چوٹ پر اپنی حقیقت کھو سکتے ہیں۔جس بناء پر فکر عقل بہل جاتی ہے۔ یہ اس طرح ہے کہ جس طرح ارسطو اور افلاطون جیسے نامور فلسفہ دانوں کے فلسفہ کو وقت کے دھاروں نے بدل کر رکھ دیا۔ کیونکہ ان کی بنیاد دلائل پر تھی اور وہ اپنے فلسفہ کو کسی معاشرہ میں عملی جامہ نہ پہنا سکے۔لیکن خیال رہے کہ دل کو راضی کرنے کے لئے ہمیں ایک بار مضبوط دلائل کا سہارا ضرور لینا پڑتا ہے۔ایسے دلائل کہ جو عقل کے شانے پر اپنی بندوق رکھ کر چلائیں اور دل پر کاری ضرب لگائیں کہ جس بناء پر دل کی دنیا بدل جائے۔لیکن جو دلائل دل کو بدلنے کی اہمیت رکھتے ہیں وہ کبھی حق کے منافی نہیں ہو سکتے۔ اگر وہ حق کے منحرف ہوں گے تو یہ پتھر پر لکیر ہے کہ وہ کبھی بھی دل کی کیفیت کو نہیں بدل سکتے۔ کیونکہ دل کو حق کے ساتھ پیدا کیا گیا ہے۔لیکن اس مقام پر آ کر ایک عجیب فلسفہ پیدا ہوتا ہے کہ پہلے تو دلائل ہی کے سہارے دل کو راضی کیا۔لیکن جب دل راضی ہو گیا تو پھر وہی بعد میں اپنے سوز کے گرداب میں دلائل کو غرق کرنے کی اہلیت رکھتا ہے۔لیکن صرف انہی دلائل کو غرق کرتا ہے جو حق سے منافی ہوں۔ جب تک بادل نہ برسے چمن نہیں پھوٹتا، جب تک بچہ نہ بلکے ماں کا دودھ جوش نہیں مارتا اور جب تک انسانی چشم تر نہ ہو تو دعا قبولیت کو نہیں پہنچتی، یہ سب سوز کی علامتیں ہیں۔یہی وجہ ہے کہ جب آتش فشاں پہاڑ صدیوں تک اپنے باطن میں لاوے کو گرماتا ہے تو ایک وقت ایسا آتا ہے کہ وہ پہاڑ جو اکثر اپنی ظاہری ہیبت کی بناء پر دیکھنے

والوں کی عقلوں پر مضبوطی کی دلیل کو ثابت کرتا ہے، وہ اپنے اندر کے لاوے (سوز) کی شدت کو برداشت نہیں کر پاتا اور مضبوطی کی تمام دلیلوں کو پاش پاش کر دیتا ہے۔ یہاں ایک چیز کا خیال رکھیں کہ ظاہر کا تعلق عقل سے ہے، یہی وجہ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے عقلوں کی بجائے لوگوں کے دلوں پر اثر کیا۔ کیونکہ اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم عقل پر اپنی توجہ مرکوز کرتے تو شائد لوگوں کے ایمان اس قدر مضبوط نہ رہتے اور وہ کچھ ہی عرصہ بعد ڈگمگا جاتے۔ جیسا کہ ہمیں سپین (Spain) کی تاریخ میں ملتا ہے کہ وہاں اسلام بزور شمشیر آیا اور چونکہ حقیقی سوز سے خالی تھا اور لوگوں کے قلوب پر اثر نہ کر سکا، یہی وجہ ہے کہ تھوڑے ہی عرصے بعد اپنی حقیقت کو کھو دیا۔ لیکن حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دلوں پر اثرات نے لوگوں کو ایک مضبوط رویہ عطا کیا۔

اس ضمن میں اب اگر ہم ظاہر سے باطن پر اثرات کی پائیداری کا مشاہدہ کریں تو بھی مقاصد کی کاملیت کو پایا جا سکتا ہے لیکن اس کے لئے وہ اصول زیر غور رکھنا ہوگا کہ جس کے تحت آب کا سنگ پر ایک مستقل رفتار سے رسنا، اس میں شق پیدا کر دیتا ہے۔ کیونکہ اس عمل میں مشقت بھی ہے اور ایک سچی دلیل کے تحت ہے۔ یعنی عمل پیہم اور یہی عمل پیہم ایک ایسے سوز کو جنم دیتا ہے کہ جس کے تحت پھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر اور ایک دلیل یہ بھی ہے کہ چیونٹی اگر ہاتھی کی سونڈ ھ تک پہنچ جائے تو اس کی موت کا سبب بن سکتی ہے۔ چنانچہ جب نیت سچی ہو، مشقت بھی ہو اور دلیل بھی حق پر ہو تو پتھر کا ٹوٹ جانا بھی اصول فطرت پر ہے۔

ظاہر ہے باطن پر عمل کا یہ رویہ اس واقعہ سے بھی واضح ہوتا ہے کہ ایک مرتبہ ایک لکڑ ہارا ایک شہزادی پر عاشق ہو گیا، اپنی اس کیفیت کا اس نے اپنی ماں کے سامنے اظہار کیا اور اس سے کہا کہ وہ اس شہزادی سے نکاح کا خواہش مند ہے۔ اس کی ماں اپنے بیٹے کی اس انوکھی ضد پر بہت پریشان ہوئی۔ ہر چند کوشش کی کہ کسی طرح سے بیٹے کو سمجھا سکے کہ یہ محال ہے۔ لیکن لکڑ ہارا تو ایک جنونی کیفیت میں گرفتار تھا اور کہتا تھا کہ اگر ایسا نہ ہوا تو وہ خود سوزی کر

لے گا۔ ماں کی ممتا یہ سن کر تڑپ اٹھی اور اپنے بیٹے کی خواہش کی تکمیل کی خاطر اپنی عزت اپنے دامن میں سمیٹے بادشاہ وقت کے محل میں جا پہنچی۔ وہاں جا کر شہزادی کے سامنے اپنا مدعا بیان کیا۔ شہزادی یہ سن کر حیران ہوئی اور کہا کہ یہ کس طرح ممکن ہے؟ لیکن جب لکڑ ہارے کی ماں اپنے فرزند کی خودسوزی کے خوف سے گڑگڑائی تو شہزادی کو اس پر رحم آیا اور کہنے لگی کہ ایک راستہ ہے کہ جس کے تحت تیرے فرزند کی یہ خواہش پایہ تکمیل کو پہنچ سکتی ہے۔ کہا کہ اپنے بیٹے کو کہہ کر ایک ڈھونگی فقیر و درویش کا روپ دھار کر کسی ٹیلے کو اپنا مسکن بنا لے اور عوام الناس میں اپنی فقیری کا چرچا کرے۔ جب اس کی شہرت پھیلے گی اور محل تک پہنچے گی تو میرا باپ جو کہ پیروں فقیروں پر بڑا اعتقاد رکھتا ہے وہ ملنے کی خاطر اس کے پاس جائے گا اور جب تیرا بیٹا اپنی چرب زبانی سے میرے باپ کو متاثر کرے گا تو میرا باپ مجھے بھی اس کے پاس جانے کو کہے گا اور اس طرح سے تیرے فرزند سے میری ملاقات ممکن ہے۔

لکڑ ہارے کی ماں اس ترکیب پر راضی ہوئی اور جا کر اپنے بیٹے سے بیان کی، لکڑ ہارا راضی ہو گیا۔ چنانچہ اس نے ایک ڈھونگی فقیر کا لبادہ اوڑھا اور شہر سے کچھ باہر ایک ٹیلے کو اپنا مسکن بنا لیا اور ہر وقت دکھاوے کے ذکر وفکر میں مشغول رہنے لگا۔ کئی ماہ گزرنے کے بعد اس کا چرچا زبان زد عام ہو گیا اور اس طرح سے یہ خبر محل تک پہنچی کہ ایک بڑا ولی کامل علاقہ غیر سے یہاں آ کر آباد ہوا ہے۔ بادشاہ وقت اس ولی سے فیض یاب ہونے کی خاطر اس کے پاس گیا اور اس سے بہت متاثر ہوا۔ چنانچہ بادشاہ نے آ کر اپنی بیٹی سے اس ولی کامل کا ذکر کیا اور کہا کہ تو بھی جا کر اس مرد درویش سے فیض یاب ہو۔ شہزادی تو تمام صورتحال سے واقف تھی کہ یہ تمام تو ایک ٹوپی ڈرامہ ہے اور لکڑ ہارا بالآخر اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا۔ بہرکیف شہزادی اپنی چند سہیلیوں کے ہمراہ اس لکڑ ہارے کے مسکن پر گئی۔ کیا دیکھتی ہے کہ وہ باریش ہو گیا ہے اور پیوند شدہ لباس اوڑھے، گردن نیچے کیے اور آنکھیں بند کیے بیٹھا ہے۔ شہزادی نے اسے مخاطب ہو کر کہا کہ اے ڈھونگی! دیکھ آج تیری مراد برآئی اور تیری ترکیب کامیاب رہی۔ تو نے میری خاطر ایک عرصہ تک یہ ڈرامہ رچایا اور بالآخر مجھے پالیا، آج مجھ

سے مل کر اپنی دیرینہ خواہش کو پورا کر۔ لیکن وہ لکڑ ہارا بدستور اپنی حالت میں رہا اور اس نے شہزادی کی جانب آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ شہزادی کو بڑا ناگوار گزرا کہ کیا وجہ ہے کہ اس کی آنکھیں میرے حسن کی جانب نہیں اٹھتیں۔ بالآخر اس لکڑ ہارے نے اپنی آنکھیں کھولیں اور شہزادی سے کہا کہ اے شہزادی! بلاشبہ ترکیب تیری ہی تھی اور تیری ہی خاطر تھی لیکن جس حقیقی حسن کو میں نے پانا تھا اسے پالیا، اب تیرے عارضی حسن سے کیا لینا؟

چنانچہ آپ نے غور کیا کہ کس طرح سے اس لکڑ ہارے کے عمل کا ظاہری سوز اس کے باطن میں اتر گیا اور اس کے قلب کی دنیا کو بدل دیا اور مقام کثرت سے مقام وحدت کی حقیقت کو پالیا۔

بحوالہ حقائق روزمرہ

یہ مجاہدہ نفس درحقیقت ضبط نفس پر ہی رہ کر ادا ہوسکتا ہے۔ اس ضمن میں اب تک ہم نے جتنی بھی بحث کی ہے وہ قرآن وسنت اور بزرگان دین کی جستجو کو اپنے سامنے مثال رکھ کر کی ہے۔ لیکن اس کے بعد کی بحث ہم آج کل کے دور میں اپنی عام زندگی کی حقیقتوں کو سامنے رکھ کر کریں گے اور ضبط نفس کے طریق کو واضح کریں گے۔ اس دوران میں بیسویں صدی کے معجزات کا ذکر کروں گا اور اگر آپ ان میں شامل نہیں تو آپ خوش نصیب ہیں اور اگر آپ اس میں شامل ہیں تو جلدًا اپنے آپ کو اس مصیبت سے نکالئے ورنہ بہت سی نئی مصیبتوں کا پیش خیمہ بن جائے گی اور آپ تباہ و برباد ہو جائیں گے۔

ہر انسان کے اندر فطرتاً ایک جوش و خروش موجود ہوتا ہے کہ جو موقع اور وقت کی مناسبت سے کبھی ابھرتا اور زور پکڑتا ہے تو کبھی ٹھنڈا پڑ جاتا ہے۔ ضبط نفس ہی ایک ایسی قوت ہے کہ جس کے ذریعے جوش کو قابو میں لا کر مفید کاموں میں لگایا جا سکتا ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ جوش کی مثال اس اسٹیم کی سی ہے جو انجن کو چلاتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اگر اسٹیم نہ ہو تو انجن ایک قدم آگے نہیں بڑھ سکتا۔ لیکن اس سے بھی بڑی حقیقت یہ ہے کہ اسٹیم کی اس عظیم قوت کو ہم مختلف طریقوں سے کام میں لا سکتے ہیں اور اگر اس پر ٹھیک طریقے

سے قابو نہ پایا جائے تو یہی اسٹیم ایک بہت بڑے نقصان کا بھی پیش خیمہ ثابت ہوسکتی ہے۔ اسی طرح ہم روزمرہ کے کاموں میں بجلی کا استعمال کرتے ہیں اوراس سے کئی مفید پہلو تلاش کرتے ہیں۔لیکن اگر یہی بجلی بے قابو ہو جائے تو اپنی افادیت سے زیادہ نقصان کا باعث بھی بن سکتی ہے۔

اس بجلی کی مثال ہم اپنے جوش سے بھی دے سکتے ہیں کہ اگر اس جوش کو قابو میں نہ کیا جائے تو یہ اس انسان کی اپنی ذات اور دوسروں کے لئے وبال جان بن سکتا ہے۔جوش وولولہ ہی انسان کے اندر وہ خصوصیت ہے جو اس کو عمل پر اکساتی ہے۔لیکن ضبط نفس وہ پہیہ ہے کہ جس کے ذریعے جوش وخروش کی گرمی کو صحیح مقام پر پہنچایا جاتا ہے تا کہ اس سے کام لیا جائے۔

جن لوگوں کے دماغ صحیح تربیت یافتہ نہیں ہوتے ہیں ان کو یہ عادت بڑا نقصان پہنچاتی ہے۔

وہ قوت جس کے ذریعے انسان نے ستاروں کو اپنا محکوم بنایا، فضاؤں اور ہواؤں پر اپنا تسلط جمایا، پہاڑوں کو فتح کیا اور سمندر کے سینے میں اتر گیا، ایسی قوت کے غلط استعمال سے وہ اپنے لئے ہزاروں مصیبتیں پیدا کر لیتا ہے۔اگر آپ کسی جیل خانے میں جائیں اور وہاں کے قیدیوں سے ملاقات کریں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ آزادی جیسی نعمت سے محروم ہونے اور قید وبند کی صعوبتیں برداشت کرنے میں جوش وخروش کے غلط استعمال کا کتنا بڑا ہاتھ ہے۔ ٪۹۶ لوگ اس لئے جیل جاتے ہیں کہ وہ اپنے نفس پر قابو نہیں رکھ سکتے اور آسانی سے بھڑک اٹھتے ہیں اور ذرا سے واقعہ سے بہت زیادہ متاثر ہو کر بڑے سے بڑا اقدام کر گزرتے ہیں۔ جس کا نتیجہ دائمی تباہی، ذلت ورسوائی کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ ہمارے زیادہ تر رنج وغم ہمارے عدم ضبط نفس کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ دنیا کے ہر مذہب نے غیض وغضب اور آپے سے باہر ہونے کی مذمت کی ہے اور انسان کو اس لعنت سے بچنے کی تلقین کی ہے۔انجیل وقرآن میں یہاں تک ہے کہ ہمیں اپنے دشمنوں سے بھی محبت کرنی چاہئے اور ان لوگوں کو معاف کر دینا چاہئے جو ہم کو تکلیف پہنچاتے ہیں۔ حالات فتح مکہ

ہمارے سامنے ہیں۔

دنیا کے ہر بڑے انسان نے نہ صرف یہ کہ بے جا غیض وغضب کی برائی کی بلکہ انہوں نے ضبط نفس کی عادت ڈالی۔ دنیا کا کوئی بڑا قائد، ادیب یا مصلح ایسا نہیں ہوا جو بغیر صبر وضبط کے کامیاب ہوا ہو۔ آپ ان لوگوں کی زندگیوں کا جائزہ لیجئے جن کو دنیا بڑا انسان سمجھتی ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ ان میں ہر ایک میں یہ صفت پائی جاتی ہے۔ اگر آپ لنکن کی زندگی کا جائزہ لیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ وہ بڑا متحمل مزاج، صابر اور پورے نظم وضبط کا انسان تھا۔

جو لوگ اپنے نفس پر قابو نہیں رکھتے وہ اپنے مقصد حیات سے دور ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اگر آپ ضبط نفس کے عادی نہیں ہیں تو اس سے آپ دوسروں کے جذبات اور احساسات ہی کو ٹھیس نہیں پہنچا رہے بلکہ آپ خود اپنی ذات کو بہت بڑا نقصان پہنچا رہے ہیں۔ یہ ضبط نفس کا ہی کرشمہ تھا کہ جس نے موہن چند کرم داس گاندھی کو ہندوستان کا عظیم رہنما اور دیوتا بنا دیا۔

اس قسم کے واقعات نے ایک بہت بڑے علم کی کنجی میرے حوالے کر دی، اس نے ہمیشہ میری رہنمائی کی اور جو آئندہ بھی میری رہنمائی کرتا رہے گا۔

مثال کے طور پر ایک کامیاب سیلز مین کے لئے لازمی ہے کہ وہ جس طرح بھی ہو سکے اپنے آپ کو اس کمزوری سے نجات دلائے۔ چونکہ جب وہ اپنے گاہک سے کوئی سودا کرتا ہے تو بعض وقت گاہک ایسی بات کہہ دیتا ہے جو سیلز مین کے لئے سخت کڑوی اور ناخوش ہوتی ہے۔ اگر سیلز مین میں ضبط نفس کا مادہ نہیں تو وہ بھی جوابی حملہ کر دے گا جو دونوں کے لئے تباہ کن ہوگا۔ انسان بحیثیت مجموعی انسان سے نفرت کرتا ہے۔ اس کا اندازہ آپ کو روزانہ بسوں اور ریل گاڑیوں وغیرہ پر ہوتا ہے۔ انسان صرف اس انسان سے پیار کرتا ہے جسے وہ پہلے سے جانتا ہو، ورنہ ذرا سی جگہ کے لئے انسان دوسرے انسان کو چلتی ہوئی بس یا ٹرین سے دھکیلنے سے بھی باز نہیں رہتا۔ لیکن اگر یہی انسان غیض وغضب میں جاتا ہے تو پھر یہ اپنے مفاد کے لئے قوموں کو لڑوا بھی سکتا ہے، اپنے کلیجے کی آگ بجھانے کے لئے ہزاروں

انسانوں کے سروں کو قلم بھی کر سکتا ہے، اس کی غصے کی آگ افراد کو فتح کرتی ہے، خاندانوں کو تباہ کرتی ہے، قبیلوں کو تہس نہس کرتی ہے، قوموں کو ٹکراتی ہے، ملکوں کو لڑاتی اور دنیا کو جنگ کے شعلوں میں لپیٹ لیتی ہے۔ اس لئے افراد کی بقاء اور ملک وقوم کی بقاء اور اپنی فلاح و بہبود کے لئے ضروری ہے کہ انسان جہاں تک ہو سکے غلط غیض و غضب سے بچتا رہے اور ضبط نفس کی تربیت حاصل کرے۔

جو لوگ وکلاء کو قریب سے جانتے ہیں وہ یہ بھی اچھی طرح سے جانتے ہوں گے کہ وکلاء جرح کے موقع پر حریف، حلیف، ملزم یا گواہ کو طیش میں لانے کی کوشش کرتے ہیں تا کہ وہ اس کو ٹھیک باتیں عالم غیض وغضب میں بتلا دے۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ وہ گواہ جو ہر بات کا جواب یہی دیتے ہیں کہ ''ہم کو یاد نہیں'' یا ''ممکن ہے ایسا ہی ہو'' اور بڑا پھونک پھونک کر قدم رکھتے ہیں۔ وکلاء اس قسم کے گواہوں سے ایسے بے تکے سوال کرتے ہیں کہ جس سے وہ آپے سے باہر ہو جاتے ہیں اور عقل، مصلحت اور دور بینی کے سارے پردے چاک ہو جاتے ہیں اور وہ گواہ سے وہ بات اگلوانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں جو وہ اپنے ہوش وحواس میں شائد کبھی نہ کہتا۔ ہم میں اکثریت ایسے افراد کی ہے جو گھر سے شائد یہ سوچ کر نکلتے ہیں کہ وہ کسی نہ کسی سے ضرور لڑائی مول لیں گے۔ ہمارے اس عدم ضبط نفس کا یہ نتیجہ ہے کہ ہم صبح وشام تک اپنا تمام وقت اپنی تمام صلاحیتیں لڑنے، جھگڑنے، دوسروں کو برا بھلا کہنے اور دوسروں کے اعمال پر نکتہ چینی کرنے میں گزار دیتے ہیں۔

آپ کسی دس آدمیوں میں جن سے آپ کی ملاقات ہو یہ سوال کریں کہ وہ زندگی میں کامیاب کیوں نہیں ہیں؟ تو آپ کو ان دس آدمیوں میں سے نو آدمی یہی کہتے ہوئے ملیں گے کہ ہم بدقسمت اور بدنصیب ہیں، ظالم زندگی نے ہمارے ساتھ اچھا برتاؤ نہیں کیا اور ان کو وہ مواقع حاصل نہ ہو سکے جو دوسروں کو حاصل ہیں۔ اگر آپ اور آگے بڑھنا چاہیں تو آپ ان کا نفسیاتی تجزیہ کیجئے اور ان کے ایک دن کے کاموں کا جائزہ لیجئے۔ آپ کو معلوم ہو گا کہ مواقع ان کے چاروں طرف بکھرے ہوئے ہیں اور یہ کہ ان میں ہر شخص ان مواقعوں کو

اپنے سے دور ہٹانے کی کوشش کر رہا ہے۔ مواقع آپ کی زندگی میں بے شمار ہیں، شائد وہ آتے ہیں اور گزر جاتے ہیں لیکن آپ میں ان کو سمجھنے کی صلاحیت نہیں۔ انسان کے لئے مواقعوں کا سب سے بڑا ذریعہ تخیلات ہیں۔ اسی کے ذریعے ہم موقع کی تلاش میں رہتے ہیں۔ بلکہ ہم مواقع کو اپنا منتظر بنا لیتے ہیں۔ اگر آپ نے زندگی کا مقصد بنا لیا ہے اور اگر آپ نے اپنے اندر خود اعتمادی پیدا کر لی ہے اور اگر آپ عمل کی قوت سے واقف ہو گئے ہیں تو آپ کو دنیا میں آگے بڑھنے سے کوئی قوت نہیں روک سکتی۔

اب ضبط نفس کی تعریف کو ایک مرتبہ پھر واضح کرنا چاہوں گا تا کہ وہ صورتحال کے مطابق اس کے معنی کو ڈھال سکیں۔ اس سے مراد ہے کہ انسان کسی دوسرے انسان سے نفرت، حسد، خوف، انتقام یا اس قسم کا کوئی برا جذبہ نہیں رکھتا ہے۔ وہ شخص جو اپنے اوپر قابو رکھتا ہے وہ چھوٹے موٹے واقعات سے آپے سے باہر نہیں ہو جاتا، وہ دوسروں کی کڑی بات بھی سن کر خاموش ہو جاتا ہے، لالچ، خود غرضی اور انا ہمارے عدم تربیت نفس کی بدترین مثال ہیں۔ خود اعتمادی بہت اچھی چیز ہے اگر انسان کو اپنی ذات پر بھروسہ نہ ہو تو وہ پہاڑوں کو نہیں کاٹ سکتا اور ہواؤں اور فضاؤں کو تسخیر نہیں کر سکتا۔ ہر بڑی کامیابی کے لئے خود اعتمادی لازمی اور ضروری ہے۔ لیکن جب یہ خود اعتمادی خود پرستی میں تبدیل ہو جاتی ہے تو یہ تباہی اور بربادی کا پیش خیمہ بن جاتی ہے۔ وہ آدمی جو انا کی پرستش کرتا ہے اور جس میں انانیت آ جاتی ہے وہ اپنے دوستوں کو دشمن اور ہمدردوں کو اپنے سے دور کر لیتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ انانیت اس کو بے ہوش کر دیتی ہے۔ بندہ خود کو خدا تصور کرنے لگ جاتا ہے۔ جو شخص ضبط نفس کی دولت سے مالا مال ہوتا ہے وہ کبھی ان لوگوں سے مخیر نہیں ہوتا جو ہر مسئلے میں تقدیر و تدبیر اور قضا و قدر کے مسئلے لا کھڑا کر دیتے ہیں۔ قضاء و قدر کا مسئلہ انسان کی ذہنی اختراع ہے۔ انسان کو یہ یقین کر لینا چاہئے کہ وہ جس حال میں ہے یا جس مقام پر فائز ہے تو یہ اس کے اپنے انداز فکر کی بدولت ہے۔ اگر وہ اپنا یہ انداز فکر بدل دے اور اپنے لئے ایک منزل کا تعین کرے اور اس منزل تک رسائی کے لئے جدوجہد کرے تو وہ خود کو تہ

فرش سے اٹھا کر سر عرش تک پہنچا سکتا ہے۔ ضبط نفس کا عادی انسان کبھی یہ گوارہ نہ کرے گا کہ کوئی غیر انسان اپنی کاوش سے اس کے لئے راستہ متعین کرے۔ بلکہ وہ از خود راہِ نجات باوسیلہ خوداری اپنے لئے خون جگر سے سینچتا ہے۔ یہ راز حقیقت ہے کہ کوئی آپ سے کتنا ہی قریب کیوں نہ ہو اور آپ کے تمام رازوں سے باخبر ہو لیکن وہ آپ کے لئے زندگی کا کوئی نصب العین بنا کر پیش نہیں کر سکتا۔

وہ شخص جس کا نفس تربیت یافتہ ہے وہ کسی بھی حالات میں کبھی کسی کا برا بھلا نہیں کہتا اور وہ بڑے سے بڑے معاملے میں بھی کسی سے انتقام نہیں لیتا۔ ایسا شخص ان لوگوں سے نفرت کرتا ہے جو اس کے ہم خیال نہیں ہوتے بلکہ وہ اس مخالفت کے اسباب کو جاننے کی کوشش کرتا ہے اور اس سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتا ہے۔ اب ہم ان باتوں کا ذکر کریں گے جو عدم ضبط نفس سے پیدا ہوتی ہیں۔ دنیا میں کسی چیز سے انسان کو اتنا صدمہ نہیں ہوتا جتنا اس عادت سے پہنچتا ہے۔ یہ حقائق کو معلوم کئے بغیر کسی کے متعلق رائے قائم کرنے کی عادت ہے۔ یہ ایسی لعنت ہے جس میں کم و بیش ہم سب مبتلا ہیں۔ کسی کہ یہ حق نہیں کہ وہ کسی دوسرے انسان کے متعلق کوئی ایسی رائے قائم کرے جس کو وہ حقائق سے ثابت نہ کر سکتا ہو۔ اگر آپ اپنا مطالعہ کریں تو آپ دیکھیں گے کہ آپ ہر چیز کو اپنے نکتۂ نظر سے دیکھنے کے عادی ہیں اور آپ جب کسی کے متعلق رائے قائم کرتے ہیں تو اس میں آپ اچھائی اور برائی کے اپنے انداز و فکر کو کام میں لا کر اس چیز کو اپنی خواہش کے مطابق دیکھنا چاہتے ہیں۔ عدم تربیت نفس سے جو دوسری تباہ کن عادت پیدا ہوتی ہے وہ ہماری اسراف کی عادت ہے۔ ہم میں سے ہر شخص خرچ کرنے کے فن سے پوری طرح واقف ہے۔ اگر دس آدمیوں کو بلا کر یہ کہا جائے کہ اگر ان کو دس دس ہزار روپے دیئے جائیں تو وہ کیا کریں گے؟ ان میں سے شائد نو آدمی ایسے ہوں گے جو دس ہزار روپے خرچ کرنے کی ترکیبیں بتائیں گے اور یہ بتائیں گے کہ کس طرح وہ اس روپے سے دادِ عیش دے سکتے ہیں اور شائد ان میں سے ایک آدمی ایسا ہو کہ وہ یہ کہہ سکے کہ وہ اس میں سے پانچ ہزار روپے کسی بینک میں ڈال دے گا اور

باقی پانچ ہزار روپے سے وہ کوئی ایسا کام شروع کرے جس سے آئندہ زندگی بہتر ہو سکے۔

ہم سب اسراف پسند ہیں یہ عادت ہم گھٹی میں لے کر پیدا ہوئے ہیں کیونکہ ہمارے والدین ہماری طرح اسراف پسند تھے اور ہم نے یہ عادت ان سے ورثے میں پائی ہے۔ ہم لوگ بہت جلد دوسری چیزوں سے متاثر ہو جاتے ہیں۔ ہم جب کسی دوسرے کو کام کرتے ہوئے دیکھتے ہیں تو ہمارے لئے دوسرے کے لئے جذبات پر قابو پانا مشکل ہو جاتا ہے۔ اگر ہمارے پڑوسی کے پاس ایک کرولا گاڑی ہے تو ہم اس کی نقل کرنا چاہتے ہیں اور اگر کرولا نہیں تو سوزوکی خریدنے میں ضرور کامیاب ہو جاتے ہیں۔ اس چکر میں ہم کبھی کل کا خیال نہیں کرتے۔ ہم کبھی یہ نہیں سوچتے کہ زندگی میں برا وقت آ سکتا ہے۔ ہم روزانہ زندہ رہنے کے عادی ہو گئے ہیں۔ ہم اس قسم کے بے جا اسراف میں مبتلا رہتے ہیں۔ یہ باتیں ہم ان لوگوں کے لئے لکھ رہے ہیں جو اپنی چادر سے باہر پیر نکال دیتے ہیں اور اپنے آپ کو غربت کی زنجیروں میں جکڑ لیتے ہیں۔ ان کو یہ معلوم نہیں کہ کچھ ایسے اصول بھی ہیں جن پر سختی سے عمل کرنا پڑتا ہے ورنہ انسان وہ کامیابی حاصل نہیں کرتا جو برابر اس کے دل میں چٹکیاں لیتی رہتی ہے۔ ہم لوگ زیادہ تر تفریحات میں اپنا پیسہ ضائع کر دیتے ہیں۔ اگر ہمارے خرچ کرنے کی یہی رفتار رہی تو ہمارا ملک مفلس ومحتاج ہو جائے گا۔

ہمارے یہاں تو نوکر پیشہ حضرات کی ذہنیت بھی بہت بلند ہے۔ اگر کسی شخص کا تقرر پانچ سو روپے ماہانہ پر ہوتا ہے تو اس میں گزر کرتا ہے اور اگر اس کی آمدنی میں سال سال کے بعد تین سو روپے کا اضافہ ہو جاتا ہے تو وہ اس اضافے کو قدرتی نگاہ سے نہیں دیکھتا بلکہ اس کو بھی خرچ کر دیتا ہے۔ وہ یہ نہیں کرتا کہ پانچ سو روپے میں اپنا خرچ پہلے کی طرح پورا کرے اور باقی تین سو روپیہ پس انداز کر دے۔ لیکن وہ ایسا کبھی نہیں کرے گا کیونکہ وہ ہر سال آمدنی کے ساتھ اپنا خرچ بھی بڑھاتا چلا جاتا ہے۔ گویا اس نے قسم کھائی ہے کہ اپنی آمدنی میں سے ایک پیسہ بھی پس انداز نہیں کرے گا۔ اسی طرح جب اس کی تنخواہ تیرہ سو یا پندرہ سو روپے ماہوار ہو جاتی ہے تب بھی وہ کل تنخواہ خرچ کرنے سے باز نہیں رہتا۔ اس کی

وجہ یہ ہے کہ وہ شروع سے خرچ کرنے کی عادت ڈالتا ہے اور پس انداز کرنے کی عادت کو کمزور کرتا چلا جاتا ہے۔

ان کے خرچ کرنے کی عادت مرتے دم تک باقی رہتی ہے اور وہ زندگی بھر فضول خرچی، قرض، بیماری اور دوسری خود ساختہ مصیبتوں میں گھرے رہتے ہیں۔

حضرت مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ اس حقیقت کو اس طرح بیان کرتے ہیں۔

''انسان کی خود غرضیاں اور ناروا خواہشیں کس طرح اس کی روح کے گرد لپٹی چلی جاتی ہیں اور کس طرح اس کے اوپر ایک ایسا غلاف چڑھا دیتی ہیں جو اس کی روحانی موت کا باعث ہوتا ہے۔ اس کی بہترین مثال ریشم کے کیڑے کی ہے جو اپنے لعاب کا تار نکال کر اپنے اوپر لپیٹتا ہے یہی لعاب باریک ریشمی غلاف ہے جسے ''کویا'' کہتے ہیں۔ آخر کار یہ کیڑا اسی غلاف میں دم گھٹ کر مر جاتا ہے۔ یہی حالت انسان کی ہے کہ تعیّشات اور شہوات کے ریشمی غلاف میں اپنے آپ کو لپیٹتا ہوا اپنی روح کو آخر کار مردہ بنا دیتا ہے۔ اس لئے نصیحت فرماتے ہیں کہ ''گرد خود چوں کرم پیلہ برمتن'' اس تشبیہ میں خوبی یہ ہے کہ اس سے اعمال و نتائج اعمال کی کیفیت واضح ہو جاتی ہے۔ اعمال قبیحہ کی سزا کہیں خارج سے انسان پر وارد نہیں ہوتی بلکہ ایسے اعمال خود روح کا احاطہ کرتے ہوئے اس کا جہنم بن جاتے ہیں۔ نیک عمل خود ہی اپنی جزا اور بدعمل خود ہی اپنی سزا بن جاتا ہے۔''

بقول میر۔

بارہا دیکھا ہے اس دار مکافات میں میر
اینٹ اٹھا بھی نہ پائے تھے کہ پتھر آیا

ایک طرف تو یہ صورت حال ہے اور دوسری طرف وہ کنجوس ہے جو ہر جائز اور ناجائز طریقے سے روپیہ حاصل کرتا ہے اور اس کو جوڑ جوڑ کر مر جاتا ہے۔ نہ اس روپے سے اس کو

کچھ حاصل ہوتا ہے اور نہ دوسرے اس سے مستفیض ہو سکتے ہیں۔

حضرت شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ، کنجوس کے متعلق ایک شعر کہتے ہیں جو آب زر سے لکھے جانے کے قابل ہے، وہ کہتے ہیں

سیم بخیل از خاک وقتے برآمد کہ او در خاک آدر

پرانے زمانے میں بینک نہ تھے اس لئے بہت سے لوگ روپیہ گھر میں دفن کر دیتے تھے اور بوقت ضرورت نکال لیتے تھے۔ حضرت شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ کنجوس کا روپیہ اس وقت باہر نکلتا ہے جب اس کا جسم مٹی میں مل جاتا ہے۔

تو ایک طرف کنجوس ہے جو صرف روپیہ جمع کرنے میں اتنی لذت پاتا ہے کہ انسانیت اور شرافت کو ہاتھ سے دے دیتا ہے۔ اس کا کھانا پینا، اوڑھنا بچھونا صرف روپیہ ہے۔ وہ رات دن اسی روپے سے نہ کوئی دنیاوی عیش حاصل کرتا ہے اور نہ کسی غریب و مسکین کی مدد کرتا ہے۔ یہ عادت بھی ایک بیماری ہے اور جن کو یہ بیماری ہوتی ہے وہ ہماری معاشرت میں ناسور کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ دوسری طرف وہ افراد ہیں جو اپنی کمائی کی ایک ایک پائی کو خرچ کر دینا تو خیال کرتے ہیں لیکن کبھی پس انداز کرنے کے متعلق نہیں سوچتے۔ بلکہ ہمیشہ اپنی فضول خرچیوں اور بے انتہاء عیش کی وجہ سے مقروض رہتے ہیں۔ ان دونوں کے درمیان ایک متوسط راستہ ہے اگر آپ چاہیں تو بڑے اطمینان سے روپیہ پس انداز کرنے کی لذت اور خرچ کرنے کی خوشی دونوں سے لطف اٹھا سکتے ہیں۔ یہی وہ راستہ ہے جو آپ کو سکون قلبی اور مسرت روحانی دے گا، یہی وہ راستہ ہے جو آپ میں خود اعتمادی پیدا کرے گا، یہی وہ راستہ ہے جو آپ میں جوش و خروش پیدا کرے گا، یہی وہ راستہ ہے جو آپ کو آگے بڑھائے گا، یہی وہ راستہ ہے جو آپ کی ہر طرح رہنمائی کرے گا اور یہی راستہ ہے جو آپ میں عزم و جرات، ثبات قدم، قوت اور آگے بڑھنے کا ولولہ پیدا کرے گا اور یہی وہ راستہ ہے جو آپ کو ضبط نفس کی تعلیم دے گا۔

تربیت نفس ہمارے عزم اور استقلال کو بڑھانے میں ہمارے بڑے کام آتی ہے۔

انسانی فطرت ہے کہ ہر خواہش پوری ہونے کے بعد اپنی جاذبیت کھو دیتی ہے اور اس کے علاوہ ایک دوسری خواہش جنم لیتی ہے۔ تربیت نفس ہمارے بہت سے ارمانوں اور آرزوؤں کا جس میں بے جا اسراف ہوتا ہے، خون کر دیتی ہے۔ یہی عادت ہماری برائیوں کے لئے سم قاتل ہے، یہی عادت ہم کو ہماری چادر سے باہر پاؤں پھیلانے سے روکتی ہے، یہی ہماری عادت ہم کو دوسروں کی کڑوی بات سن کر غصہ پی جانے کا عادی بناتی ہے، یہی عادت ہم کو برائی کا جواب برائی سے دینے سے روکتی ہے اور یہی عادت ہمارے جذبہ انتقام کو سرد کر دیتی ہے۔ اس کے فوائد بے شمار ہیں، اس کی بڑی خوبی یہ ہے کہ یہ جرم کو معاف کر دیتی ہے، یہی وہ ملکوتی خوبی ہے جس کا بیان غالب نے اشعار میں کیا ہے۔

روک لو گر غلط چلے کوئی
بخش دو گر خطا کرے کوئی
نا سنو گر برا کہے کوئی
نہ کہو گر برا ہے کوئی

آپ کو یہ سن کر اذیت ہو گی کہ ہم میں سے اکثر ہر وقت کسی نہ کسی ایسے کام میں مصروف رہتے ہیں جس سے دوسروں کی برائی اور تکلیف پہنچانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس کا نتیجہ لازمی طور پر یہ نکلتا ہے کہ دوسرا شخص بھی اپنی تمام کوششیں دوسروں سے اپنی ہتک کا انتقام لینے میں صرف کر دیتا ہے۔

ہم اس حقیقت سے واقف نہیں کہ ہم جس کو اپنا دشمن سمجھ رہے ہیں وہ ہماری طرح ایک انسان ہے، اس کے دل میں بھی درد ہے، وہ بھی ہماری طرح رنج و غم کا شکار ہے، اس کو بھی اچھی باتوں سے خوشی اور بری باتوں سے تکلیف ہوتی ہے۔ ہم اس سے واقف نہیں ممکن ہے کہ وہ ہم سے زیادہ تکلیف میں مبتلا ہو اور بہت ممکن ہے کہ وہ کسی ایسی الجھن میں پھنسا ہو کہ اپنے ہوش و حواس کھو چکا ہو۔ اگر آپ اس نظریئے سے اپنے دشمن پر نظر ڈالیں تو آپ دشمنی کی بجائے اپنے دل میں اس کے لئے ہمدردی پائیں گے۔ ہر شخص اپنے عمل سے پہچانا جاتا

ہے۔ اگر آپ کا عمل صحیح ہے اور آپ اپنے آپ سے مطمئن ہیں اور آہستہ آہستہ اپنی منزل کی طرف بڑھ رہے ہیں تو آپ کو اس بات کی ضرورت نہیں کہ آپ دوسروں کو اپنا مقصد بتاتے پھریں بلکہ وہ مقصد خود بخود ظاہر ہو جائے گا۔

حضرت شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ نے ''گلستان'' میں اس قسم کی ایک بات کی طرف اشارہ کیا ہے، وہ کہتے ہیں

''مشک آں باشد کہ خود بگوید نا کہ عطار بگوید''

یعنی اصل مشک اپنی خوشبو سے پہچانا جاتا ہے۔ اگر آپ عطار کے ہاں مشک خریدنے جائیں اور وہ آپ کو مشک دے دے تو آپ اس کی خوشبو سے یہ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ یہ مشک اچھا ہے یا خراب، اس میں عطار کو کچھ بتانے کی ضرورت نہیں۔ اسی طرح جن لوگوں کا کوئی مقصد حیات ہوتا ہے ان کو کچھ بتانے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ان کا عمل خود اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ وہ واقعی کسی جذبے میں ڈوبے ہوئے ہیں، وہ کوئی کام کرنا چاہتے ہیں۔ تو ان کے اندر بلا کی اعلیٰ صلاحیتیں موجود ہوتی ہیں اور وہ ایک دن اپنی منزل پر پہنچ کر دم لیتے ہیں۔ دنیا جلد ان لوگوں کو فراموش کر دیتی ہے جو کسی عملی انسان کی زندگی کی راہ میں کانٹے بچھاتا ہے۔ دنیا حاسدوں میں ایسے لوگوں کا کوئی خیال نہیں رکھتی جو دوسروں کو آگے بڑھنے سے روکتے ہیں بلکہ اس کے برخلاف وہ ان لوگوں کا بڑھ کر استقبال کرتی ہے جو اس کو بناتے ہیں۔ جن میں تعمیری صلاحیتیں موجود ہوتی ہیں اور جو ان تعمیری صلاحیتوں سے پورا کام لینا جانتے ہیں۔

قائداعظم محمد علی جناح نے جب پہلی مرتبہ پاکستان کا تصور دنیا کے سامنے پیش کیا تو مخالفت کا ایک طوفان امڈ آیا۔ اس مخالفت میں دنیا کا ہر ملک شامل تھا۔ اس مخالفت میں ہندوستان کے ہر فرقے اور ہر جماعت کے لیڈر موجود تھے۔ اس نظریے کی مخالفت انگریز، پنڈت جواہر لعل نہرو، مہاتما گاندھی اور کانگریس جیسا بڑا ادارہ کر رہا تھا۔ اس میں مسلمان بھی شامل تھے۔ اس میں مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا حسین مدنی جیسی شخصیتیں بھی موجود

تھیں۔لیکن قائداعظم پر ان مخالفتوں کا کوئی اثر نہ ہوا کیونکہ وہ حصول پاکستان کو اپنا مقصد بنا چکے تھے اور ہر قیمت پر اسے حاصل کرنے کے لئے تیار تھے۔ انہوں نے مخالفین کا جواب دینے میں اور ہر ایک کا فرداً فرداً مقابلہ کرنے میں اپنا وقت ضائع نہیں کیا بلکہ وہ انتہائی صبر و سکون کے ساتھ ان تلخ گھونٹوں کو پی گئے اور اس کا نتیجہ پاکستان کی شکل میں ظاہر ہوا۔ ہر وہ شخص جو زندگی میں نمایاں کامیابی حاصل کرنا چاہتا ہے، اس کو جلد یا بدیر اپنے دشمنوں کو فراموش کر دینے کی پالیسی پر عمل کرنا پڑتا ہے۔آپ اگر اس کا ثبوت چاہتے ہیں تو دنیا کے تمام بڑے آدمیوں کی زندگیوں کا جائزہ لیں، آپ کو معلوم ہوگا کہ وہ صبر وتحمل کا مجسمہ تھے اور کبھی ایسا کام نہیں کرتے تھے جس سے ان کے مقصد کو ٹھیس پہنچے۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ بغیر مخالفت اور سخت قسم کی مخالفت کے کوئی شخص زندگی میں بڑی کامیابی حاصل نہیں کرسکتا۔ میں نے قائداعظم کی مثال دی تھی۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ پاکستان بننے میں مخالفین کا بڑا ہاتھ ہے۔ ہندوستان کے تمام اخبارات میں اس موضوع پر اتنا لکھا گیا کہ بہت جلد پاکستان کا لفظ ہر دل و دماغ میں بیٹھ گیا۔ انہوں نے جتنی اس کی مخالفت کی اتنا ہی مسلمانوں میں اس کو حاصل کرنے کا جذبہ تیز سے تیز تر ہوتا چلا گیا اور اس طرح پاکستان، مخالفت کی وجہ سے مسلمانوں کا مقصد بن گیا۔ جو بات قائد اپنی صلاحیتوں کی وجہ سے نہ منوا سکے، اس کو ہندوؤں کی مخالفت نے خود بخود ان کے سامنے پیش کر دیا۔

جو شخص خدمت خلق کے لئے کھڑا ہوتا ہے اس کو طرح طرح سے ذلیل ورسوا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ اس قسم کی غلط مخالفت سے کوئی اچھا مقصد حاصل ہو سکتا ہے۔ بہرحال ہوتا یہی ہے کہ جو اس طوفان میں بہہ جاتے ہیں وہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو جاتے ہیں لیکن جو تلخ گھونٹ برداشت کر لیتے ہیں وہ اس منزل پر پہنچ جاتے ہیں جہاں ہر ایک کو ان کے آگے جھکنا پڑتا ہے۔اس کی مثال ایسی ہے کہ ایک بیماری اس میں مبتلا شخص اگر دوا کی کڑواہٹ محسوس کرے گا اور اس کو پینے سے انکار کرے گا تو اس کی بیماری پر مزید غالب آجائے گی لیکن اگر وہ دوا کی کڑواہٹ کو نظرانداز کرے گا اور اسے برداشت کرے گا اور دوا

کو پی لے گا تو وہ بیماری پر غالب آ جائے گا۔ نفرت ایک ایسا جذبہ ہے جو ہمارے تمام جسم میں آگ لگا دیتا ہے۔ یہ ہماری تمام تعمیری صلاحیتوں کو ختم کر دیتا ہے۔ نفرت کی مثال ایک ایسے بم کی ہے جو اپنے اندر انتہائی آتش گیر مادہ رکھتا ہے اور اگر اس کو پوری احتیاط کے ساتھ قابو میں نہ رکھا جائے تو ہمارے لئے بہت خطرناک ہو سکتا ہے۔ ایک بم کو اگر کسی کھلے میدان میں چھوڑ دیا جائے تو اتنا نقصان دہ نہیں ہوتا لیکن اگر یہی بم کسی اور جگہ پر پھٹ پڑے تو یہ ہماری ہلاکت کا باعث بن سکتا ہے۔ ہم نے آپ کو اس بم سے بچنے کا طریقہ بتایا ہے۔ اگر آپ کسی شخص کے خلاف نفرت کے جذبات رکھتے ہیں تو آپ ایک کاغذ پر خوب اپنے دل کا غبار نکالیئے بہت جلد آپ کو اس سے نفرت کی بجائے ہمدردی پیدا ہو جائے گی۔ یہ طریقہ ذاتی تجربہ کا ایک اصول ہے اور اس پر عمل کرنے سے آپ بہت سی ایسی ذہنی الجھنوں سے نجات حاصل کر سکتے ہیں جو آپ کے انتشار اور پریشانی کا باعث بنتی رہتی ہیں۔

ضبط نفس کا دوسرا نام اپنے خیالات پر قابو پانا ہے۔ آپ ایسی کنجی کی تلاش میں ہیں جس کے ذریعے آپ کامیابی کے تمام دروازوں کو کھولتے چلے جائیں وہ کنجی آپ کے پاس ہے۔ وہ کنجی آپ کے خیالات پر قابو پانے کی قوت ہے۔ آپ تحریک ذاتی کے ذریعے اپنے ذہن میں صرف ان بہتر اور اعلیٰ خیالات کو داخل ہونے دیجئے جو آپ کی کامیابی کے لئے ضروری ہیں اور جو آپ کے مقصد حیات سے مطابقت رکھتے ہیں۔ رفتہ رفتہ یہ خیالات آپ کے ذہن پر چھا جائیں گے اور آپ کا دماغ ان کو قبول کرے گا۔ اب آپ نے جو کچھ سوچا ہوگا وہ حقیقت بن کر آپ کی نگاہوں کے سامنے لگے گا۔ یہ سب آپ کے خیالات کا کرشمہ ہے اور یہ بھی خیالات کو قابو میں رکھنے کا دوسرا نام ہی ہے۔ جب آپ ایک مرتبہ ایسے خیالات کا انتخاب کرتے ہیں جو آپ کے ذہن پر چھائے رہیں اور باہر کی باتوں کو آپ قبول کرنے سے سختی سے انکار کر دیتے ہیں تو یہی وہ منزل ہوتی ہے جہاں آپ ضبط نفس کا اعلیٰ ترین مظاہرہ کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ انسان وہ تنہا مخلوق ہے جو یہ کام کر سکتا ہے۔

مندرجہ بالا تفصیل کو ایک عملی صورت میں واضح کرنے کے لئے میں نپولین ہل کی

کتاب سے چند واقعات پیش کروں گا۔ جس کا اس نے اپنی عام زندگی میں مشاہدہ کیا۔ بظاہر تو یہ واقعات ہمارے روزمرہ کے معمولات میں پیش آنے والے واقعات کی مانند ہیں۔ لیکن نپولین ہل نے ان سے ہمیں ضبط نفس اور اس کی افادیت سے روشناس کرانے کی کوشش کی ہے۔

واقعہ نمبر ا

ہم کو زندگی کے بیشتر حقائق کا اس وقت علم ہوتا ہے جب ہم کسی ایسے واقعہ سے خواہ وہ کتنا ہی معمولی سا کیوں نہ ہو دوچار ہوتے ہیں۔ جو ہمارے نفس کو بری طرح جھنجوڑ دیتا ہے اور اس واقعہ کی اہمیت ہماری نظروں سے بہت زیادہ ہو جاتی ہے۔ بعض اوقات یہی چھوٹے چھوٹے واقعات ہم کو زندگی کا ایسا سبق پڑھاتے ہیں کہ ہماری زندگی بالکل ایک نیا انداز اختیار کر لیتی ہے اور ہمارا انداز فکر یکسر بدل جاتا ہے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ قرض ایک بری چیز ہے۔ بعض اوقات انسان مجبور ہو کر قرض لیتا ہے لیکن رفتہ رفتہ یہی عادت اس کی فطرت بن جاتی ہے کہ جب انسان کسی ایسے غیر متوقع حادثے کا شکار ہو جاتا ہے جو قرض کا نتیجہ ہے۔ بالکل اسی طرح غیض وغضب اور ذرا سی دیر میں مشتعل ہو جانے کی عادت بھی انسان اس وقت چھوڑتا ہے جب وہ کسی واقعہ سے عبرت لینے کی کوشش کرے۔

میری ابتدائی زندگی میں بھی ایک اسی قسم کا واقعہ پیش آیا اور اس واقعہ نے مجھے زندگی کا اتنا بڑا اصول بتایا کہ میں نے ضبط نفس کو فلسفہ کامیابی کے اصولوں میں سے ایک اصول بنا لیا۔ نپولین کہتے ہیں کہ میرا جس عمارت میں دفتر تھا، ایک دن میری اس عمارت کے چوکیدار سے کسی بات پر کچھ غلط فہمی پیدا ہو گئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہم دونوں دل میں ایک دوسرے سے شدید نفرت کرنے لگے۔ چوکیدار کا معمول تھا کہ جب یہ دیکھتا تھا کہ میں اپنے کمرے میں کام کر رہا ہوں تو وہ بلڈنگ کی لائٹ ختم کر دیتا تھا۔ یہ واقعہ کئی مرتبہ پیش آیا یہاں تک کہ میں اتنا مشتعل ہوا کہ میں نے اس سے انتقام لینے کی ٹھان لی۔ مجھ کو اس کا جلد ہی موقع مل گیا۔ جب میں اپنے کمرے میں گیا تاکہ میں ایک تقریر تیار کر سکوں تو اچانک

لائٹ گل ہوگئی۔ میں کود کر باہر نکلا اور بھاگتا ہوا دروازے کے اس سمت چلا جہاں مجھ کو معلوم تھا کہ چوکیدار مل جائے گا۔ جب میں اس کے قریب پہنچا تو میں نے اس کو بھٹی میں کوئلہ ڈالنے میں مصروف پایا۔ وہ کام کے ساتھ ساتھ سیٹی بھی بجا رہا تھا اور اتنا مطمئن تھا کہ جیسے کوئی واقعہ پیش ہی نہیں آیا۔ بغیر کسی تکلف کے میں نے اس کو پکڑ کر جھنجوڑ دیا اور پانچ منٹ تک جو میرے منہ آیا بکتا رہا۔ میں نے اس کو بہت سخت کہا اور بڑی کڑوی باتیں سنائیں یہاں تک کہ میرے الفاظ کا ذخیرہ ختم ہوگیا اور مجبوراً مجھ کو خاموش ہونا پڑا۔ تب وہ شخص میری طرف آیا اور اس نے بہت آہستہ اور بڑے پیارے انداز میں مسکراتے ہوئے، مجھ سے کہا! معاف کیجئے گا مجھے آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں لگتی، آپ کو آرام کی ضرورت ہے۔ اب میرے جذبات کا اندازہ لگائیے کہ میں ایک جاہل انسان کے آگے کھڑا تھا، وہ انسان کہ جو پڑھنا لکھنا بھی نہ جانتا تھا۔ لیکن اس نے اس کمزوری کے باوجود مجھے بری طرح شکست دی تھی۔ نہ صرف میرا ضمیر مجھے ملامت کر رہا تھا بلکہ میرے دل میں بار بار یہ خیال آ رہا تھا کہ میں اس سے شکست کھا گیا ہوں۔ یہ بات اس لئے بھی بری تھی کہ میں جانتا تھا کہ ظالم ہوں، میں نے برائی کی اور خواہ مخواہ اسے سخت وسست کہا۔ نہ صرف یہ کہ میرا ضمیر مجھ کو بار بار ملامت کر رہا تھا بلکہ کچھ عجیب وغریب خیالات میرے ذہن میں چکر لگا رہے تھے اور وہ میرا مذاق اڑا رہے تھے۔ میں جو اپنے آپ کو فلسفہ اور نفسیات کا ماہر کہتا ہوں، میں جو فلسفہ کامرانی کا اصول مرتب کرتا ہوں، میں جو شیکسپیئر، سقراط، افلاطون، ایمرسن اور انجیل کو پڑھ چکا ہوں۔ میرے مقابلے میں ایک ایسا آدمی کھڑا ہے کہ جس نے دنیا کا کوئی ادب نہیں پڑھا، جس نے شیشے اور شوپن ہار کا نام بھی نہیں سنا، جس نے کیٹس، والٹس براتھ اور ٹینیسن کو نہیں پڑھا۔ ان تمام کمزوریوں کے باوجود اس نے مجھے الفاظ کی جنگ میں بچھاڑ دیا میں جس تیزی سے آیا تھا اسی تیزی سے اپنے دفتر میں واپس چلا گیا اور اس کے علاوہ میں کر بھی کیا سکتا تھا۔ جب میں نے غور کیا تو مجھے اپنی ہی غلطی نظر آئی۔ لیکن اس غلطی کے لئے مجھ کو جو کچھ کرنا تھا اس کے خیال سے بھی جھجھک رہا تھا۔ میں جانتا تھا کہ جب تک میں اس آدمی سے معافی نہیں مانگوں

گا اس وقت تک مجھ کو ذہنی اور قلبی سکون حاصل نہیں ہوگا۔

آخر میں نے تہیہ کر لیا کہ مجھ کو جا کر اس شخص سے معافی مانگ لینی چاہئے کیونکہ اس کے بغیر میں اپنی ذہنی اذیت سے محفوظ نہیں رہ سکوں گا۔ مجھ کو یہ فیصلہ کرنے میں کافی دیر لگی۔ میں پھر اٹھا اور اس مرتبہ آہستہ آہستہ اس کی طرف روانہ ہوا۔ میں سوچ رہا تھا کہ میں اس شخص سے دوبارہ کس طرح ملوں کہ مجھے کم سے کم شرمندگی اٹھانا پڑے۔ جب میں نزدیک پہنچا تو میں نے اس کو آواز دی اور اس کو دروازے پر بلایا۔ اس نے بڑے میٹھے اور نرم انداز میں مجھ سے پوچھا اب آپ کیا چاہتے ہیں؟ میں نے اس کو بتایا کہ میں اس سے اپنی غلطی کی معافی مانگنے آیا ہوں۔ ایک مسکراہٹ اس کے چہرے پر پھیل گئی اور اس نے کہا کہ اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ آپ کی گفتگو کو سوائے میرے، آپ کے اور اس چاردیواری کے کسی نے نہیں سنا۔ میں کسی سے اس کا ذکر نہیں کروں گا اور میں جانتا ہوں کہ آپ بھی اس کا تذکرہ نہ کریں گے۔ اس لئے بہتر یہ ہے کہ آپ اس واقعہ کو اپنے ذہن سے بالکل بھلا دیں۔ میں نے اس کے ہاتھ کو اپنے ہاتھوں میں لیا اور اس سے بغل گیر ہو گیا۔ اس سے خوشی خوشی رخصت ہو کر دفتر کی طرف چلا آیا کیونکہ ایک غلطی کا کفارہ ادا کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ واقعہ یہاں پر ختم نہیں ہوا بلکہ اس سے میری زندگی کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ میں اس واقعہ سے اتنا متاثر ہوا کہ میں نے تہیہ کر لیا کہ اپنی آئندہ زندگی میں کبھی کوئی ایسی حماقت نہیں کروں گا جس کی وجہ سے کسی انسان کے سامنے ذلت یا شرمندگی اٹھانا پڑے اور اس نے مجھ کو سب سے پہلے ضبط نفس کے اصول سے روشناس کرایا۔ اس فیصلے کے کچھ عرصہ بعد میرے اندر ایک عجیب انقلاب برپا ہو گیا۔ میرے قلم میں زیادہ شدت پیدا ہو گئی، میرے الفاظ زیادہ قابل توجہ بن گئے، میرے دوستوں کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہوتا چلا گیا اور دشمنوں کی تعداد گھٹتی چلی گئی۔ اس واقعہ نے میری زندگی کو یکسر بدل دیا اور مجھ کو زندگی کی ایک نئی شاہراہ پر لے آئی۔ وہ شاہراہ جو تمام گندگیوں اور آلائشوں سے پاک تھی۔ اس واقعہ نے مجھ کو یہ بھی بتایا کہ کوئی شخص اس وقت تک دوسروں پر قابو حاصل نہیں کر سکتا جب تک وہ اپنے

نفس پر قابو حاصل نہ کرلے۔ اس نے مجھ کو فلسفہ ضبط نفس کا اصول دیا۔ اس نے مجھے عدم تشدد کا سبق پڑھایا۔ اس کے بعد ان الفاظ کو اپنا نصب العین بنالیا۔

"جس شخص نے تم کو تکلیف پہنچائی ہے تم کو اس کے اوپر بہت سے فوائد حاصل ہیں۔ تم اس کو معاف کر سکتے ہو لیکن اس کو یہ حق بھی حاصل نہیں کہ وہ تم کو معاف کردے۔"

جب یہ تصویر میرے ذہن میں آئی میں نے اپنے دشمنوں کو یہ کہہ کر معاف کر دیا کہ میرے لئے دو ہی راستے ہیں۔ پہلا یہ کہ میں اپنی تمام صلاحیتیں اور اپنا پورا قیمتی وقت ان لوگوں سے لڑنے جھگڑنے میں صرف کردوں جو مجھ کو پسندیدہ نظروں سے نہیں دیکھتے ہیں یا میں اس قوت کو اپنے مقصد حیات کی تکمیل کے لئے وقف کردوں اور اس وقت کا منتظر رہوں جب میں اپنے فن کی اس منزل پر آجاؤں جہاں دوست اور دشمن سب میرے آگے جھکنے اور میری عظمت کا اعتراف کرنے پر مجبور ہو جائیں۔ میں نے دوسرے جملے کو پہلے پر ترجیح دی اور اسی پر عمل کرنے لگا۔

واقعہ نمبر ۲

نپولین کہتا ہے کہ ملک وقوم کی بقا اور افراد کی بقا اور اپنی صلاح و بہبود کے لئے ضروری ہے کہ انسان جہاں تک ہو سکے، غلط غیض وغضب سے بچتا رہے اور ضبط نفس کی تربیت حاصل کرے۔ یہاں میں آپ لوگوں کے سامنے ایک بڑا دلچسپ واقعہ بیان کرتا ہوں۔

(Chicago) شکاگو کے ایک بہت بڑے کارخانے میں، میں نے ضبط نفس کا عجب کرشمہ دیکھا۔ میں نے دیکھا کہ عورتوں کی ایک قطار ہے جو ایک عورت کو اپنی تمام تکالیف کا حال سنا رہی ہیں۔ کچھ عورتیں بری طرح گالیاں بک رہی تھیں اور بہت سی عورتیں اس عورت کے متعلق بہت رقیق اور بے ہودہ حملے کر رہی تھیں۔ لیکن وہ نوجوان عورت کامل سکون اور اطمینان کے ساتھ اپنے مقام پر بیٹھی ہوئی تھی اس کے چہرے یا حرکات وسکنات سے ذرہ برابر پتہ نہ چلتا تھا کہ وہ ذرا بھی اس سے متاثر ہے۔ اس نے ایک مسکراہٹ کے

ساتھ ان تمام عورتوں کو ان مقامات پر بھیج دیا جہاں ان کا کام ہو سکتا تھا۔ میں اس عورت کے صبر اور ضبط نفس کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اس عورت کے پیچھے ایک اور عورت تھی جو کاغذ پر لکھتی جا رہی تھی۔ وہ ہر عورت کا حال کاغذ پر لکھ کر اس عورت کے سامنے رکھ دیتی تھی۔ بڑی دیر کے بعد میں نے محسوس کیا کہ وہ جوان عورت جو کرسی پر بیٹھی دوسری عورتوں کی فریاد سننے میں مصروف تھی فی الحقیقت بالکل بہری تھی اور دوسری عورت اس کو ضروری اطلاعات لکھ کر پیش کرتی تھی۔ میں اس واقعہ سے اتنا متاثر ہوا کہ میں اس مل کے منیجر سے ملا۔ اس نے مجھے بتایا کہ انہوں نے جان بوجھ کر اس سخت اور مشکل کام کے لئے ایک بہری عورت کا انتخاب کیا ہے کیونکہ کسی شخص میں اتنا ضبط نفس نہیں ہے کہ وہ اس جگہ پر کام کر کے لوگوں کی تند و تیز باتیں سنے۔ میں باہر آیا اور ایک مرتبہ میں نے ان عورتوں پر نظر ڈالی جو غصے کی آگ میں تپ رہی تھیں۔ میں نے دیکھا کہ جیسے ہی وہ عورتیں اس عورت کے پاس پہنچتیں وہ بڑی خندہ پیشانی سے ان کا استقبال کرتی۔ وہ بھیڑیوں کی طرح غراتی ہوئیں اس پر جھپٹتی ہیں۔ لیکن اس عورت کی مسکراہٹ اور صبر و ضبط کی وجہ سے پانی پانی ہو جاتی ہیں اور چپ چاپ بھیڑ کی طرف واپس چلی جاتی ہیں۔ میں نے ان میں سے اکثر کے چہرے پر ندامت کے آثار دیکھے کیونکہ وہ اس جوان عورت کے طرز عمل سے اور خود سے شرمندہ تھیں۔

اس واقعہ نے مجھے بے حد متاثر کیا۔ جب کبھی زندگی میں مجھے کوئی ایسی کڑوی بات سننا پڑتی ہے تو میں فوراً اس عورت کا تصور کرتا ہوں جو ہزاروں عورتوں کی گالیاں سننے کے لئے نوکر رکھی گئی تھی۔ میرے خیال میں ہر شخص کو اس قسم کا ایک آلہ رکھنا چاہئے کہ جن باتوں کو وہ سننا پسند نہ کرے ان باتوں سے پرہیز کریں۔ میں نے اب یہ عادت ڈال لی ہے کہ میں اس قسم کی بے ہودہ باتوں کو خاطر میں نہیں لاتا۔ پہلے میں ذرا ذرا سی بات پر بھڑک اٹھتا تھا۔ میں نے سوچا زندگی کا سفر طویل ہے ہم ایک تھوڑے عرصے کے لئے یہاں آئے ہیں۔ اس مختصر عرصے میں ہم کو بڑے بڑے اہم کام انجام دینا ہیں۔ ہمارے پاس اتنا وقت نہیں ہے کہ ہم خواہ مخواہ ہر اس شخص کی بات کا جواب دیتے پھریں جس کی بات کو ہم سننا

پسند نہیں کرتے۔

واقعہ نمبر ۳

نپولین کہتا ہے کہ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جو شخص صبر و تحمل سے کام نہیں لیتا وہ مستقبل کے تمام دروازوں کو بند کرتا چلا جاتا ہے۔ زندگی میں جتنے مواقع اس کو ملتے ہیں وہ ان کو کھو دیتا ہے۔

ایک دن میں ایک ہیڈ ورکس کی دکان پر ایک نوجوان سیلز مین سے باتیں کر رہا تھا وہ نوجوان مجھے اپنی مصیبت بھری کہانی سنا رہا تھا۔ وہ بتا رہا تھا کہ اس کا مالک بڑا تنگ نظر ہے اور وہ اس کی خدمات کا قدر دان نہیں۔ اسی اثناء میں ایک گاہک آیا اور اس سے کچھ ہیڈ مانگے وہ بدستور مجھ سے گفتگو کرنے میں مشغول رہا اور اس نے گاہک کی طرف کوئی توجہ نہ دی۔ گاہک بہت مضطرب تھا، بالآخر اس نے کہا یہاں ہیڈ نہیں ملتے ہیں۔ جب گاہک نے اس سے مزید استفسار کیا تو اس نے جھڑک دیا اور کہا کہ میں ڈاکیا نہیں کہ آپ کو ہر چیز کا پتہ بتاتا پھروں۔ چار سال سے یہی نوجوان ایک ایسے مقام پر کام کر رہا تھا جہاں اس کو آگے بڑھنے کے بے پناہ مواقع تھے لیکن وہ اس راز سے بے خبر تھا۔ وہ اگر چاہتا تو اس دکان پر آنے والے کو اپنا دوست بنا سکتا تھا اور یہی دوستی اس کو دکان کا سب سے قیمتی آدمی بنا سکتی تھی۔ لیکن اس کا اپنا انداز فکر ایسا نہ تھا جس کی وجہ سے وہ زندگی میں نمایاں کامیابی حاصل کر سکتا۔ ایک دن شام کا وقت تھا، بارش ہو رہی تھی۔ ایک بوڑھی عورت ایک بہت بڑی دکان میں داخل ہوئی اور اس نے ان لوگوں کی طرح جو صرف تفریحاً کسی دکان میں گھس جاتے ہیں، ادھر ادھر گھومنا شروع کر دیا۔ ایک آدھ سیلز مین نے اس سے سرسری طور پر بات کی اور وہ کام میں مشغول ہو گئے۔ ایک نوجوان سیلز مین نے اس سے بڑی ملائمت سے پوچھا کہ وہ اس کے کس کام آ سکتا ہے؟ بوڑھی عورت نے کہا کہ وہ کچھ خریدنا نہیں چاہتی اور وہ صرف منتظر ہے کہ بارش رک جائے اور وہ اپنے گھر چلی جائے۔ اس عرصے میں وہ نوجوان اس عورت سے محو گفتگو رہا اور اس سے بہت نرم اور میٹھے انداز میں گفتگو کرتا رہا۔ جب وہ چلنے

کے لئے کھڑی ہوئی تو نوجوان اس کو چھوڑنے سڑک تک آیا اور اس نے چھتری کھول کر دور تک اس کا ساتھ دیا۔ راستے میں بوڑھی عورت نے اس سے اس کا کارڈ مانگا اور چپ چاپ چلی گئی۔

نوجوان اس واقعہ کو تقریباً بھول گیا لیکن ایک دن اس کے مالک نے اس کو بلایا اور اس کو ایک بوڑھی عورت کا خط دیا۔ وہ اسکاٹ لینڈ میں اپنا نیا کاروبار شروع کر رہی تھی اور اس کو ایک کامیاب سیلز مین کی ضرورت تھی۔ یہ بوڑھی عورت کارلینگی کی ماں تھی وہ کارلینگی جو امریکہ میں لوہے کا بادشاہ کہلاتا تھا۔ اس خط میں اس شخص کا حوالہ تھا جس نے اس کے ساتھ بڑی محبت سے گفتگو کی تھی۔ اس نے جو تنخواہ مقرر کی تھی وہ اس کی موجودہ تنخواہ سے دس گنا زیادہ تھی۔ یہ معمولی سا واقعہ ایک نوجوان کی زندگی کو نئی راہ پر لانے میں کامیاب ثابت ہوا۔

باب چہارم

سفرسلوک

اب جبکہ ہم ذات باری تعالیٰ، منازل یقین اور اسی ضمن میں نفس انسانی سے متعلق مختلف مراحل سے گزر کر تجزیہ سے استفادہ حاصل کر چکے ہیں تو ضروری ہے کہ اسی فلسفہ ''انا الحق'' کو بنیاد بنا کر سفر تصوف کے مراحل کو بھی بتدریج طے کریں کہ جس کو عرف عام میں ''منازل سلوک'' سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ لیکن ان منازل کی تفصیل میں جانے سے قبل ضروری ہے کہ ان دو عناصر کی نشاندہی کرتے چلیں کہ جن کے پیش کردہ اور ترتیب شدہ عوامل کے تحت رہتے ہوئے ہی یہ منازل طے کرنی ممکن ہیں۔ ان دونوں عناصر کا ایک دوسرے سے تعلق ایک استاد اور شاگرد کی مانند ہے۔ ان دونوں عناصر کو عرف عام میں ''شیخ یا پیر'' اور ''مرید'' کے ناموں سے تعبیر کیا جاتا ہے اور ان کے باہمی ربط کا نام سلوک ہے۔ اس ضمن میں ان دونوں عناصر سے متعلق کچھ اہم نکات وضاحت طلب ہیں۔

شیخ کامل یا پیر کامل

❖ حضرات! صحیح راستے اور رہنمائی کے تعین کے معاملے میں جس چیز کا حقیقی طور پر عمل دخل ہے وہ علم وفکر اور حقیقی خوشی کے حصول کی نیت ہے ورنہ نظام دنیا تو اس کے بغیر بھی چل ہی رہا ہے اور چلتا رہے گا۔ بغیر کسی مزاحمت یا رکاوٹ کے۔ اس ضمن میں ایک مرید نے اپنے پیر کو ایک مکتوب میں لکھا۔

> ''میرے تمام مفہو کے مزدور اور مزارع اپنے اپنے کام میں لگے ہوئے ہیں تاکہ ان میں کمال پختگی حاصل کر سکیں۔ یہ تمام مفہوا پنے مزارعوں سے پیداوار اکٹھی کرتے ہیں اور اس کو خزانہ شاہی میں بھجوا دیتے ہیں۔ لیکن اپنے مالک اور آقا کو اس تفصیل کی خبر نہیں دیتے۔ میں یہ یقین رکھتا ہوں کہ آپ اپنے رحم و کرم کی بدولت اس تفصیل کو اپنے آقا کے حضور پیش کریں گے۔''

حضرت علی رضی اللہ عنہ اپنے آخری خطبے میں ان اولیاء کی بابت فرماتے ہیں۔

''ان کے اجسام اور شخصیتیں نظروں سے اوجھل ہیں لیکن ان کا پرتو دلوں میں موجود ہے۔ یہ اپنے اجسام وابدان سے تو بلاشبہ دنیا میں رہتے ہیں لیکن ان کی روحیں ملاء اعلیٰ سے وابستہ ہوتی ہیں۔ یہ ہیں وہ لوگ جو اولیاء اللہ ہیں، جو اللہ کے کارندے اور کارکن ہیں اور اس کے دین کی طرف لوگوں کو بلانے والے ہیں۔ (اتنا کہہ کر آپ علیہ السلام رو پڑے اور فرمایا) ہائے! ان لوگوں سے ملاقات کا کس قدر شوق ہے۔''

اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اگر چہ ذات باری تعالیٰ کی حقیقت ہم پر اس کی صفات سے ظاہر کی گئی ہے اور یہ صفات وقت اور دنیاوی معاملات کے ساتھ ساتھ مزید نکھرتی اور عیاں ہوتی رہتی ہیں۔ لیکن سالک کو اس کی خبر نہیں ہوتی اور وہ اس معاملے میں ہمیشہ بے علم رہتا ہے اور اپنے طور پر صحیح راستہ اور رہنمائی حاصل نہیں کر پاتا۔ پیر کامل اسی کو کہتے ہیں کہ جو اس علم کو پھیلاتا اور پرچار کرتا ہے۔

ایک شخص ایک گاؤں میں گیا اس نے پوچھا کہ اس گاؤں میں ہلدی ہے؟ لوگوں نے جواب دیا ہے ''ہاں ہے''۔ پوچھا یہاں ہلدی کا کیا بھاؤ ہے؟ تو ایک بوڑھے شخص نے پوربی زبان میں کہا کہ ہلدی کا کوئی بھاؤ نہیں ہوتا۔ جتنا چوٹ پر آئے یعنی جتنا چوٹ میں درد ہوتا ہے اتنا ہی ہلدی کا بھاؤ ہوتا ہے۔ درد زیادہ ہو تو ہلدی مہنگی اور درد نہ ہو تو ہلدی کی کیا قدر ہے۔ ایسے ہی اللہ والے اللہ کی محبت کی چوٹ رکھنے والے دلوں کے لئے مثل ہلدی کے ہیں۔ لیکن چوٹ بھی تو ہو۔ جس کے چوٹ ہی نہیں لگی جس کو اللہ کی طلب ہی نہیں ہے وہ ظالم کیا جانے کہ اللہ والے کیا ہیں۔ جس کے قلب میں جتنی زیادہ اللہ کی محبت، طلب اور پیاس ہوتی ہے اتنی ہی اہل اللہ کی قدر ہوتی ہے۔ منزل کی محبت راہبر کی محبت کے لئے مستلزم ہے اور منزل کی محبت جتنی کمزور ہوگی راہبر کی محبت بھی اتنی ہی کمزور ہوگی جو عاشق منزل ہے وہ عاشق راہبر بھی ہوتا ہے۔ اور جو منزل کا عاشق نہیں وہ راہبر کا عاشق بھی نہیں

ہوتا۔ کہتا ہے کہ وہ بھی آدمی ہے اور ہم بھی آدمی ہیں۔ ان کے بھی ایک ناک اور دو کان ہیں اور ہمارے بھی ایک ناک اور دو کان ہیں۔ بیک بینی و دو گوش یہ بھی بیٹھے ہیں اور ہم بھی۔ اس لئے کسی اللہ والے کو صرف اپنی نظر سے مت دیکھو کیوں کہ ہماری نظر ایک بیمار کی نظر ہے وقت کے اولیاء اللہ اور تربیت یافتہ علماء کی نظر سے پوچھ کہ ان کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے۔

حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ مکتوب نمبر ۱۹۰ میں محمد نعمان بدخشی کو شیخ کامل کی تعریف بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں!

"تم جانتے ہو پیر کیسی ہستی ہے۔ پیر وہ ذات ہے کہ جناب قدس خداوندی جل شانہ تک پہنچنے کے راستے میں اس سے استفادہ کرتے ہو۔ اور اس راہ میں طرح طرح کی مدد و اعانت حاصل کرتے ہو۔ خالی کلاہ اور چادر اور شجرہ جو مروج ہو چکا ہے پیری مریدی کی حقیقت سے خارج ہے اور عادات و رسوم میں داخل ہے۔ ہاں یہ بات درست ہے کہ شیخ کامل کا کرتہ بطور تبرک اپنے پاس رکھے اور اس کے ساتھ اعتقاد و اخلاص سے زندگی گزارے۔ شیخ کے کرتے کو پاس رکھنے میں ثمراتٗ ونتائج کا قوی احتمال ہے۔"

علاوہ ازیں مقام شیخ کو بیان کرتے ہوئے مکتوب نمبر ۲۲۷ میں ملا طاہر لاہوری کو اس طرح نصیحت فرماتے ہیں!

"اے بھائی! حق تعالیٰ نے آپ کو یہ منصب (پیر) عطا فرمایا ہے۔ اس نعمت کا شکر پوری طرح ادا کریں اور محافظت کریں کہ کوئی ایسا امر صادر نہ ہو جو مخلوقات کی نفرت کا باعث ہو۔ کیونکہ اس میں بڑی خرابی ہے۔ خلق کی نفرت اس ملامتی گروہ کے حال کے مناسب ہے جن کا دعوت اور شیخی سے کچھ واسطہ نہیں ہے۔ بلکہ ملامت کا مقام شیخی کے مقام کے برخلاف ہے۔ ایسا نہ ہو کہ ان دونوں مقام کو آپس میں ملا دیں اور عین شیخی میں ملامت کی آرزو کریں کہ یہ بڑے ظلم کی

بات ہے۔ اور مریدوں کی نظر میں اپنے آپ کو متجمل یعنی رعب و داب سے آراستہ پیراستہ رکھیں۔ اور مریدوں کے ساتھ کثرت سے میل جول اور انس اختیار کریں کہ خفت اور سبکی کا موجب ہے۔ اور افادہ اور استفادہ کے منافی ہے اور حدود شرعیہ کی اچھی طرح محافظت کریں اور جہاں تک ہو سکے رخصت پر عمل کریں کہ یہ بھی اس طریقہ علیہ کے منافی اور سنت سنیہ کی تابعداری کے دعوے کے مخالف ہے۔"

❖ علم کی تجلی کے ظہور سے پہلے ایک سالک "عارف" نہیں ہوتا۔ جب علم ظہور میں آتا ہے تو اس وقت وہ خود سے باخبر ہوتا ہے۔ اگر چہ "صفات" موجود تھیں لیکن اس کی اپنی حقیقت بھی علم کے ظہور سے پہلے ان صفات سے باخبر نہ تھی یا یوں کہہ لیجئے کہ یہ علم تو پہلے اپنے آپ میں ہی جذب تھا۔ سالک وجود، اختیار، طاقت، سماعت وغیرہ تو رکھتا ہے لیکن اگر وہ اپنی ان خصوصیات سے بے خبر ہو تو پھر وہ ایسے ہی ہے کہ جیسے وہ ان خصوصیات سے عاری ہو۔ ان منازل سلوک کی جانب سفر کے آغاز میں سالک تصوف کی بنیادی خصوصیات کو اپنے انداز میں دیکھتا اور سنتا ہے لیکن وہ ان کی حقیقت کو مکمل طور پر جانچ نہیں پاتا۔ خواہ ظاہراً وہ اس چیز کا اقرار کرے کہ اللہ دیکھتا اور سنتا ہے لیکن اس کا باطن اس کو قبول نہیں کرتا اور اس کا قلب ایک قسم کے شک میں مبتلا رہتا ہے۔ اس صورت میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اللہ دیکھتا ہے اور سنتا ہے لیکن سالک اس کی صفات سے باخبر نہیں اور جب وہ باخبر ہو جاتا ہے تو وہ اپنے آپ میں "عارف" کا مقام پالیتا ہے۔ یہ باخبری اس میں مشاہدہ کا رجحان پیدا کرتی ہے اور یہ مشاہدہ اس کو اس ذات تک کی رسائی دلاتا ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے تو اپنے اوپر ایک قسم کا حجاب ڈال رکھا ہے اور وہ اس کا خود ہی کا ڈالا ہوا ہے۔ یعنی وہ "عارف" بھی اپنی مرضی سے ہے اور "غائب" بھی اپنی مرضی سے ہے اور یہاں پر کسی غیر کی حقیقت باقی نہیں رہتی۔

حدیث قدسی ہے۔

"اللہ جس کو سیدھی راہ دکھاتا ہے اس کو کوئی نہیں بھٹکا سکتا اور جس کو وہ بھٹکانا

چاہے تو اس کو کوئی سیدھا راستہ دکھا نہیں سکتا۔"

اس ضمن میں حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ ایسے بھٹکے ہوئے شخص کیلئے فرماتے ہیں۔

"جو آنکھ اللہ تعالیٰ کی صفت کو عبرت سے نہ دیکھے اس کا اندھا ہونا ہی بہتر ہے اور جو زبان حق تعالیٰ کا ذکر نہ کرے وہ گونگی بہتر ہے اور وہ کان جو حق تعالیٰ کی زیارت سننے کے منتظر نہ ہوں ان کا بہرہ ہونا ہی اچھا ہے اور جو تن اس کی خدمت نہ کرے اس کا مردہ ہونا ہی بہتر ہے۔ جب حق تعالیٰ کو کسی کی بھلائی منظور ہوتی ہے تو وہ اس کو صوفیاء میں داخل فرماتا ہے اور قاریوں سے محفوظ رکھتا ہے۔"

❖ ایک مرید کا یہ فرض بنتا ہے کہ وہ اپنے پیر کے جمال کا مشاہدہ کرے اور جمال شیخ کی روشنی سے مثل آئینہ قلب مرید منور ہوتا ہے۔ جمال پیر کے آئینہ میں مرید ذات باری تعالیٰ کے جمال کا مشاہدہ کرتا ہے اور ایک مرید کا قلب اپنے شیخ کے چہرہ کا آئینہ ہوتا ہے۔

فرمان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔

"جس نے مجھے پا لیا اس نے اللہ کو پا لیا۔"

ایک اور مقام پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں۔

"ایمان کی حقیقت اس سے ہے کہ تم میری اتباع کرو۔"

جب ایک مرید اپنے شیخ کی صحبت اختیار کرتا ہے تو اس کا اصل مقصد فقط ایک ولی کامل کی صحبت کا حصول نہیں ہوتا بلکہ وہ اپنے پیر سے دین و دنیا کے معاملات میں نیکی صحبت کا خواہاں ہوتا ہے۔

جیسا کہ عثمان الخیری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں!

"صحبت کی چھ قسمیں ہیں۔ خدا کے ساتھ حسن ادب اور دوام ہیبت سے، رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ محبت سے، متابعت سنت اور ظاہر علم کی پابندی سے، اولیاء کے ساتھ حرمت اور خدمت سے، گھر والوں کے ساتھ خوش سلوکی سے، دوستوں کے ساتھ تازہ روئی اور خندہ پیشانی سے (اگر وہ گنہگاری کی حالت میں

نہ ہوں) اور جاہلوں کے ساتھ دعا اور مرحمت سے۔"

❖ وہ لوگ جو سلوک کی منازل طے کرتے ہیں بالآخر ایسے مقام تک پہنچ جاتے ہیں کہ جہاں اس دنیا کی اشیاء کی ظاہری حقیقت ان کی نظروں سے اوجھل ہو جاتی ہے اور سوائے اللہ کے ان کی دید کے آئینے میں کچھ نہیں رہتا۔ ایسی کیفیت کو "اتصال" کہا جاتا ہے۔ یعنی ایسی روحانی قوت کہ جو تمام اجسام کو اکٹھا رکھے اور اس کے برعکس اس شخص کی کیفیت کہ جس نے ابھی سلوک کی منازل طے نہیں کیں کو "انفصال" کہتے ہیں۔

❖ کچھ دکھاوے کے درویش فقیر اپنے آپ کو اونی کپڑے میں ملبوس رکھتے ہیں۔ لیکن لذیذ کھانوں میں شرکت کرتے ہیں اور پھر یہ خیال کرتے ہیں کہ عام انسان اپنی ذات سے اپنے آپ کو علیحدہ کرے۔

مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ ایسے حب جاہ و مال میں گرفتار اور پرخور پیر و فقیر کی نسبت فرماتے ہیں کہ یہ وضو کرتے اور منہ دھوتے تو نظر آئیں گے۔ جیسے کہ بلی اپنی ظاہری صفائی کا بہت خیال رکھتی ہے۔ یہ لوگ ظاہر میں گربہ ہیں اور اندر سے سگ اور کھاتے اتنا ہیں کہ پیٹ پھول کر ڈھول ہو جائے، کلمات توحید اور ھوحق کا بہت زور ہوگا لیکن باطن میں ذرہ بھی روحانیت نہیں۔

صوفیاں طبل خوار لقمہ جو
سگ دلاں ہم جو گربہ روے شو

علاوہ ازیں مولانا ایک قصہ بیان کرتے ہیں کہ ایسے صوفیوں کو کسی امیر نے کسی نیاز میں بلایا اور طرح طرح کے مرغن کھانے تاب بھر بھر کر ان کے سامنے پیش کئے۔ وہ کھاتے چلے گئے یہاں تک کہ ان میں سے دو صوفی مر گئے۔ انا اللہ پڑھ کر لاشوں کو ایک طرف کر دیا کہ فراغت ہوئی تو تجہیز و تکفین کا انتظام کریں گے۔ جب دو جاں بحق ہو گئے تو امیر نے باقیوں سے پوچھا کہ آپ سیر ہو گئے یا نہیں۔ انہوں نے کہا ہم ابھی کہاں سیر ہوئے جو سیر ہو گئے تھے وہ ادھر پڑے ہیں۔

❖ شیخ اکبر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جو مرید اپنے پیر کی زندگی کے دوران کسی اور پیر کو رہنمائی کے لئے تلاش کرتا ہے تو وہ اللہ کے ساتھ اپنا قول وقرار منقطع کر لیتا ہے کہ جو اس نے بیعت کرتے ہوئے اپنایا ہوتا ہے۔ اور اس کی مثال اس طرح ہے کہ جس طرح ایک پیغمبر کا پیروکار اس پیغمبر کی زندگی میں کسی دوسرے پیغمبر کا پیروکار نہیں بن سکتا۔

❖ وہ اعمال کہ جن کو ہم ''شغل، ذکر اور مراقبہ'' کے ناموں سے تعبیر کرتے ہیں ان سب کا مقصد یہی ہے کہ اپنے اذہان کو یاد الٰہی کے علاوہ دوسرے تمام خیالات سے پاک کیا جائے۔ راہ سلوک میں ذکر کا درجہ سرفہرست ہے۔ حقیقت ذکر ایسی چیز کو یاد رکھنا ہے جو ظاہری اور باطنی گناہوں کو روک دے۔ اس کے لئے یہی ذکر اللہ ہے جس کو اللہ اللہ یا لا الہ الا اللّٰہ (اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں) کہتے ہیں۔ اگر کوئی شخص یہ سب کچھ دن رات کرتا رہے لیکن نہ تو گناہوں سے باز رہے اور نہ ہی اطاعت اختیار کرے تو یہ ذکر اللہ حقیقی نہ ہوگا بلکہ محض ذکر کی صورت ہوگی۔ ذکر کی کوئی حد نہیں۔ نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج سب کی حد ہے لیکن ذکر لامحدود ہے۔ اللہ کے ذکر میں ایک عجیب توانائی، لطیف نشاط اور عمیق سکون ہے۔ عام طور پر ذکر کی چار قسمیں ہیں جنہیں آسانی سے آزمایا جا سکتا ہے۔ اول ناسوتی جیسے لا الہ الا اللّٰہ، دوسرے ملکوتی جیسے الا اللّٰہ، تیسرے جبروتی جیسے اللّٰہ اور چوتھے لاہوتی جیسے ھو ھو۔ زبان کے ذکر کو ناسوتی، دل کے ذکر کو ملکوتی، روح کے ذکر کو جبروتی اور سارے وجود کے اجتماعی ذکر کو لاہوتی کہتے ہیں۔

ذکر کی ان چار قسموں میں بھی ایک ایک قسم کے کئی کئی طریقے ہیں۔ ان میں سے چند ایک کے نام یہ ہیں۔

☆ اسم ذات یعنی اللہ اللہ کا ذکر یک ضربی، دوضربی، سہ ضربی اور چہار ضربی۔ اگر اس ذکر کو ہر ضرب میں ایک تصور کے ساتھ کیا جائے کہ جدھر منہ پھیرو ادھر ہی خدا ہے تو استغراق اور محویت کی کیفیت پیدا ہو کر ہر شے سے ذکر کی آواز سنائی دیتی ہے اور قرآن مجید کے اس فرمان کی کامل تصدیق ہو جاتی ہے کہ

''(دنیا میں) کوئی چیز ایسی نہیں جو خدا کی حمد کی تسبیح نہ کرتی ہو۔''(اسراء:44)

حضرت داؤد علیہ السلام کا یہ معجزہ تھا کہ جب وہ خود ذکر کرتے تھے تو پہاڑ اور طیور بھی ان کا ساتھ دیتے تھے۔

☆ اسم ذات کا دوسرا ذکر ''پاس انفاس'' ہے۔ سانس باہر کرتے وقت لفظ ''اللہ'' کو سانس میں لائے اور سانس کو لیتے وقت ''ھوٗ'' کو اندر لائے اور تصور کرے کہ ظاہر و باطن میں ہر جگہ اللہ ہی کا ظہور ہے۔ اس ذکر کی اس قدر غیر معمولی کثرت کرے کہ سانس ہمہ وقت ذکر کا عادی ہو جائے۔ اس طرح پاس انفاس سے بہرہ ور ہو کر قلب، غیر اللہ سے صاف اور دیگر کدورتوں سے پاک ہو کر انوار الٰہیہ کا محور بن جاتا ہے۔

☆ نفی اثبات ''لا الہ الا اللہ'' کو پاس انفاس میں رچانا ایک خوشگوار عمل ہے۔ (ذکر نفی اثبات عوام الناس میں کثرت سے رائج ہے اس لئے اس کا طریقہ بیان کیا جا رہا ہے ورنہ مصنف اس ذکر کو خلوت میں بطور مراقبہ صحیح نہیں سمجھتا) سانس لیتے وقت صرف سانس لیتے وقت صرف سانس سے ''الا اللہ'' کہے اور سانس باہر آتے وقت ''لا الہ'' کہے، منہ بالکل بند رکھے اور زبان کو ادنیٰ حرکت بھی نہ دے اور اس قدر پابندی اور استقلال سے کام لے کہ سانس خود بخود بلا ارادہ ذکر کرنے لگے۔ اسی طرح نفی اثبات اور ذکر اسم ذات کے بھی کئی طریقے ہیں۔ ان اذکار کے ساتھ کئی طرح کے ''اشغال'' بھی وابستہ ہیں۔ مثلاً شغل سلطاناً نصیرا، شغل سلطاناً محمودا، شغل سلطان الاذکار اور شغل سرمدی وغیرہ۔ ہر ذکر اور شغل میں لطف انبساط کا اپنا اپنا رنگ ہے۔ مسافران سلوک میں سے زیادہ کو شغل سرمدی سے زیادہ رغبت رہی ہے۔ کیونکہ اس شغل کی خصوصیت یہ ہے کہ شروع میں دماغ پر پہاڑی جھرنے کی طرح پانی گرنے کی آواز آنے لگتی ہے پھر رفتہ رفتہ وہ سمندر کی لہروں کے ایک بلند آہنگ اور مستانہ سازینے کا روپ دھار لیتی ہے۔ بجلی کی لہر کی طرح اس سازینے کی آواز تمام بدن میں سرایت کر کے گنبد کی طرح گونجنے لگتی ہے۔ جسے اصطلاح صوفیہ میں ''صوت حسن و ہمس'' کہتے ہیں۔ اس آواز سے کبھی الہام کی شعائیں پھوٹنے لگتی ہیں، کبھی

اس میں عجیب وغریب عارفانہ علوم ورموز منکشف ہوتے ہیں، کبھی بجلی کی کڑک، گرج اور کوند ظاہر ہوتی ہے، کبھی چاند، سورج اور بجلی کی طرح روشنی کا سیلاب اُمڈ آتا ہے۔ جسے سالک غلطی سے نورِ حق کی تجلی سمجھ بیٹھتا ہے۔ لیکن یہ نورِ ذات کی تجلی نہیں ہوتی بلکہ راہ سلوک پر ایک دلفریب اور خوشنما رکاوٹ ہوتی ہے۔ جو شخص یہاں پر آ کر اٹک گیا وہ یقیناً منزل شریعت کی راہ سے بھٹک گیا۔

ذکر اور شغل کے بعد "مراقبہ" کی باری آتی ہے۔ مراقبہ کی اصطلاح "رقیب" کے لفظ سے نکلی ہے۔ جسے "نگہبان اور محافظ" کہتے ہیں۔ مراقبہ بھی دل کو غیر اللہ کی یاد سے محفوظ رکھنے کا ذریعہ ہے۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ جس آیت یا کلمہ کا مراقبہ منظور ہو اس کو بار بار زبان سے دہرائے اور دل کو دوسرے تمام خیالات سے خالی کر کے اس کے معنی میں اس قدر منہمک ہو جائے کہ دنیا و مافیہا سے بھی حتی الوسع بے خبر ہو جائے۔ بلکہ یہاں تک کہ اپنا بھی خیال دل سے نکل جائے۔ زمین و آسمان درہم برہم ہو کر غائب ہو جائیں اور صرف اللہ کی ذات کو موجود اور باقی تصور کرے۔

چند آیات کا مراقبہ درج ذیل ہے۔

☆ "اللّٰہ نور السموات والارض" (مراقبہ نور)

ترجمہ: اللہ زمین و آسمان کا نور ہے۔

☆ "الم یعلم بان اللّٰہ یریٰ" (مراقبہ روایت)

ترجمہ: کیا وہ نہیں جانتا کہ خدا دیکھتا ہے۔

☆ "وھو معکم اینما کنتم" (مراقبہ معیت)

ترجمہ: جہاں کہیں تم ہو خدا تمہارے ساتھ ہے۔

☆ "و نحن اقرب الیہ من حبل الورید" (مراقبہ اقربیت)

ترجمہ: اور ہم انسان کے اس قدر قریب ہیں کہ اس کی شہ رگ سے بھی زیادہ۔

☆ "و ھو بکل شئی محیط" (مراقبہ قدرت)

ترجمہ: خدا ہر چیز کو احاطہ کئے ہوئے ہے۔

☆ ''و ھو علٰی کل شئی قدیر'' (مراقبہ قدرت)

ترجمہ: خدا ہر چیز پر قادر ہے۔

☆ ''وکفا باللّٰہ و لیا و کفٰی باللّٰہ نصیراً'' (مراقبہ رفاقت وحمایت)

ترجمہ: اور اللہ تعالیٰ کافی رفیق ہے اور اللہ تعالیٰ کافی حامی ہے۔

☆ ''و ربک الغنی ذو الرحمۃ'' (مراقبہ غنا)

ترجمہ: اور آپ کا رب بالکل غنی ہے، رحمت والا ہے۔

بعض عوام بلکہ خواص تک اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ اللہ تعالیٰ محض غنی ہیں اور شائد بندوں کی مصلحت کی پرواہ نہیں فرماتے۔ یہاں پر ''ذو الرحمۃ'' کی موجودگی سے اس غلط فہمی کا ازالہ ہوتا ہے۔

☆ ''وسع ربنا کل شئی علمًا'' (مراقبہ علمیت)

ترجمہ: میرا پروردگار ہر چیز کو اپنے علم میں گھیرے ہوئے ہے۔

☆ ''و کفٰی باللّٰہ علیمًا'' (مراقبہ علمیت)

ترجمہ: اور اللہ تعالیٰ کافی جاننے والا ہے۔

☆ ''کل من علیھا فان ویبقی وجہ ربک ذوالجلال والاکرام''

(مراقبہ فناء)

ترجمہ: دنیا میں جو کوئی ہے وہ ضرور فنا ہوگا اور بزرگی اور بڑائی والا خدا باقی رہے گا۔

مراقبہ فنا میں فنا کے بھی پانچ درجے ہیں۔ پہلے درجے میں نفس امارہ کے تمام برے اخلاق فنا ہوتے ہیں، دوسرے درجہ میں نفس لوامہ کی تمام امکانی خواہشیں فنا ہو جاتی ہیں اور تیسرے درجہ میں نفس مطمئنہ جنم لیتا ہے کہ جو افعال اللہ سے بھرپور ہے۔ اس کے علاوہ مشاہدہ، معائنہ اور فناء الفناء کے درجات ہیں جو اپنے ناموں سے اپنی تعریف ظاہر کرتے ہیں۔

یہاں پر قدرت اللہ شہاب اپنی مشہور تصنیف ''شہاب نامہ'' کے آخری باب میں فرماتے ہیں۔

''ان مراقبوں میں مراقبہ موت کا رنگ سب سے الگ ہے۔اس مراقبہ کی اصل یہ آیت ہے!''کل نفس ذائقة الموت'' (ہر جان کو موت کا مزہ چکھنا ہے)۔اس مراقبہ میں پوری دھن، دھیان اور لگن کے ساتھ اپنے سارے وجود کو مکمل طور پر موت کی آغوش میں اس طرح تصور کرنا ہے کہ جو کیفیت اصلی موت کے وقت وقوع پذیر ہوگی۔شروع شروع میں مجھے اس تصور سے بہت وحشت ہوتی تھی لیکن میرے رہنما کی مشفقانہ ڈانٹ ڈپٹ نے مجھے مسلسل اس مراقبے میں جوتے رکھا۔رفتہ رفتہ موت سے محبت تو پیدا نہ ہوسکی البتہ اس کا خوف بڑی حد تک جاتا رہا۔کبھی کبھار واردات عجیبہ اور کیفیات غریبہ بھی محسوس ہو جاتی تھیں۔ یہ طرفہ تماشا ہے کہ موت کے ذوق کی جگہ اگر اس کے ساتھ کسی قدر لگاؤ اور تعلق پیدا ہو جائے تو زندہ رہنے کا عمل بڑا سبک اور سہل ہو جاتا ہے۔ایک رات میں اپنے بستر پر لیٹا ہوا مراقبہ موت کی مشق کر رہا تھا کہ اچانک مجھے محسوس ہوا کہ میرا جسم فوم (Foam) کے گدے اور چارپائی کی ٹھوس لکڑی سے گزر کر نیچے فرش کے ساتھ جا لگا ہے۔ میں نے گھبرا کر اٹھ کر دیکھا تو چارپائی پر میرا وجود بھی بدستور لیٹا پڑا تھا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ چارپائی کے اوپر جسم عنصری تھا اور پلنگ کی تہہ سے گزر کر نیچے جانے والا جسم مثالی یعنی Astral Body تھا، یہ بھی خطرے کی گھنٹی تھی۔ کیونکہ اگر انسان اسی مشق میں ضرورت سے زیادہ مہارت حاصل کر لے تو طرح طرح کی شعبدہ بازی اختیار کر کے دنیاداری کی دکان کھول سکتا ہے۔ چنانچہ مجھے دھکا دے کر یہاں سے بھی نکال دیا گیا۔''

طریقت کے ذکر میں شغل، مراقبہ، لطائف کا جاری ہونا اور سیر الاسماء وغیرہ سب محمود اعمال ہیں۔لیکن وہ بذات خود عبارت کے طور پر مقصد نہیں ہیں۔ ذکر کے انوار، شغل کی

رنگینیاں، مراقبے کو بوقلمونیاں، لطائف کی پھلجڑیاں اور اسماء کے عجائبات وتجلیات سے گزر کر جب انسان شریعت کی سیدھی، سادہ اور خشک راہ پر گامزن ہوتا ہے تو یہی اس کی نیت کا پھل اور سب سے بڑا انعام ہے اور یہ اسی طرح ہے کہ جس طرح B-A یا M-A پاس کرنے کے بعد کوئی طالبعلم، پرائمری کلاس کے نصاب کو ہاتھ نہیں لگاتا۔ لیکن اس سے یہ مراد نہیں کہ سالک اب خود کو فقط صلوٰۃ وصوم ہی کا پابند کرلے اور فقط وقت مقررہ پر ہی اپنے رب کو یاد کرے۔ بلکہ اس ذات تعالیٰ کے ذکر کو مختلف صورتوں میں ہمہ وقت وردِ قلب اور وردِ عمل رہنا چاہئے۔

جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

فَاذْكُرُونِيٓ أَذْكُرْكُمْ (بقرہ:152)

مفسرین نے اس جملے کی تشریح میں بہت سی باتیں کی ہیں۔ بندوں کے یاد کرنے اور خدا کے یاد کرنے سے کیا مراد ہے؟ اس سلسلے میں بہت سے مفاہیم بیان کئے گئے ہیں، جنہیں تفسیر کبیر میں فخر الدین رازی رحمۃ اللہ علیہ نے دس موضوعات کے تحت جمع کیا ہے۔

☆ مجھے اطاعت کے ذریعے یاد کرو تا کہ میں اپنی رحمت کے ذریعے تمہیں یاد کروں۔

اس مفہوم کی شاہد سورۃ آل عمران کی آیت نمبر ۱۳۲ ہے۔

''اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کرو تا کہ تم پر رحم کیا جائے۔''

☆ مجھے دعا کے ساتھ یاد کرو تا کہ میں تمہیں اجابت کے ساتھ یاد کروں۔

اس کی شاہد سورۃ مومن کی آیت نمبر ۶۰ ہے۔

''مجھ سے دعا کرو تو میں قبول کروں گا۔''

☆ مجھے ثناء وطاعت کے ذریعے یاد کرو تا کہ میں تمہیں ثناء ونعمت سے یاد کروں۔

☆ مجھے دنیا میں یاد کرو تا کہ میں تمہیں آخرت میں یاد کروں۔

☆ مجھے خلوتوں میں یاد کرو تا کہ میں تمہیں جلوتوں میں یاد کروں۔

☆ مجھے نعمتوں کی فراوانی کے وقت یاد کرو تا کہ میں تمہیں سختیوں میں یاد کروں۔

☆ مجھے عبادت کے ذریعے یاد کروتا کہ میں تمہاری مدد کروں۔

اس کی شاہد سورۃ الحمد ہے۔

اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَ اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ

☆ مجھے مجاہدات وکوشش کے ذریعے یاد کروتا کہ میں تمہیں ہدایت کے ذریعے یاد کروں۔

اس کی شاہد سورۃ عنکبوت کی آیت نمبر ٦٩ ہے۔

''جو ہماری راہ میں کوشش کرتے ہیں ہم انہیں اپنے راستوں میں ہدایت کرتے ہیں۔''

☆ مجھے صدق واخلاص سے یاد کروتا کہ میں تمہیں نجات اور مزید خصوصیات سے یاد کروں۔

☆ میری ربوبیت کا تذکرہ کروتا کہ میں تمہیں رحمت کے ساتھ یاد کروں۔

(ساری سورۃ حمد اس معنی کی شاہد بن سکتی ہے)۔

ان میں سے ہر مفہوم آیت کے وسیع جلووں میں سے ایک جلوہ ہے اور زیر نظر آیت میں یہ تمام مفاہیم بلکہ ان کے علاوہ بھی مطالب شامل ہیں مثلاً۔

سورۃ ابراہیم کی آیت نمبر ۷ میں ہے۔

''اگر تم شکر کرو تو میں تمہیں زیادہ دوں گا۔''

بے شک خدا کی طرف ہر قسم کی توجہ تکوینی وتربیتی اثر رکھتی ہے۔ یاد خدا سے یہ اثر انسان تک پہنچتا ہے اور ان توجہات کے نتیجے میں روح و جان ان برکات کے نزول کی استعداد پیدا کر لیتی ہے، جن کا تعلق یاد خدا سے ہے۔

❖ ایسا مرید کہ جو ابھی سلوک کی منازل کے آغاز میں ہی ہوتا ہے اس کے پاکیزہ مقاصد کے حصول کے لئے شیخ کامل کو چاہئے کہ اس کے ابتدائی نقائص اور خامیوں کی نشاندہی کرنے اور سفر کو کٹھن ظاہر کرنے سے باز رہے۔ کیونکہ ایسا کرنے سے اس کا من اس جانب مزید رغبت کرنے سے انحراف سکتا ہے۔ کیونکہ جب اس کا قلب ذکر الٰہی سے بھرپور اور

پاک ہونے لگتا ہے تو یہ خامیاں اور نقائص خود بخود اس کی ذات سے پاک ہوتے چلے جاتے ہیں۔عمارت کی تعمیر کے لئے ابتداء میں تو صرف بنیاد مضبوط کرنے کا اہتمام کیا جاتا ہے، اس کے خوشنما ہونے کے پیچھے نہیں پڑتے۔اس میں روڑے پتھر وغیرہ بھی بھر دیتے ہیں اور بعد میں اس پر بڑے عالی شان محل اور بنگلے تعمیر ہوتے ہیں۔اس طرح ناقص عمل کی مثال بھی کامل عمل کی بنیاد کے مترادف ہے۔

❖ ایک شیخ کامل کا روحانی تصرف اپنے مرید کے لئے ہوتا ہے کہ اگر شیخ ظاہری طور پر مشرق میں ہو تو وہ مغرب میں اپنے مرید کے احوال سے باخبر ہوتا ہے۔بصرہ میں حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک مرید تھا اور وہ گوشہ نشین تھا۔ایک روز کسی گناہ کا محض خیال ہی اس کے قلب میں گزرا۔آئینہ اٹھا کر دیکھا تو اپنے چہرہ کو سیاہ پایا۔حیران ہو گیا اور کئی ایک تدبیریں کیں لیکن کوئی کارگر نہ ہوئی۔شرم کے سبب سے کسی کو چہرہ نہ دکھا سکتا تھا۔حتیٰ کہ تین روز میں اس کی سیاہی آہستہ آہستہ کم ہوتے ہوئے بالکل جاتی رہی اور اس کا چہرہ سفید شکل کا ہو گیا۔ناگاہ ایک شخص نے آکر اس کا دروازہ کھٹکھٹایا، اس نے اندر سے آواز دی کہ کون ہے؟ اس نے کہا حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ کا خط لایا ہوں۔خط لے کر جو پڑھا تو اس میں تحریر تھا کہ مجھے تین دن سے دھوبی کا کام کرنا پڑا ہے تاکہ تیرے منہ کی سیاہی، سفیدی میں بدل جائے۔ایک شیخ کی کم سے کم وسعت نظر و عقلِ غائر یہ ہے کہ وہ ''کشف قلوب'' اور ''کشف قبور'' کا حامل ہو۔اگر کوئی پیر اپنے اندر اتنی وسعت پیدا نہیں کر سکتا تو اس پر یہ حرام ہے کہ وہ مرید بنائے۔اس کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ ماضی و مستقبل کی حالتوں کو اپنے دائرہ علم میں رکھے، وہ اس زمین پر اللہ کا خلیفہ ہوتا ہے۔

جیسا کہ سورہ بقر میں ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

''اور میں زمین پر (انسان کو) اپنا نائب بنانے والا ہوں۔'' (بقرہ:30)

❖ پیر کامل کی مثال ایک برزخ کی سی ہوتی ہے جس کے ذریعے مرید خدا تک رسائی حاصل کرتا ہے اور یہ اس طرح ہے کہ جس طرح آپ ایک چمکتے ہوئے سورج کی جانب

نہیں دیکھ سکتے۔ یہ صرف اس وقت ممکن ہوگا کہ اگر آپ نے اپنی آنکھوں پر سیاہ چشمہ لگا رکھا ہوگا۔ اس کی ایک مثال یہ بھی ہوسکتی ہے کہ جس طرح ایک بلند و بالا عمارت ہو اور آپ سے کہا جائے کہ آپ بغیر زینہ یا کسی دوسری چیز کا سہارا لئے اس کی چھت تک پہنچ جائیں، تو یہ ناممکن ہوگا۔ ان امثال میں چشمہ اور زینہ سے مراد اولیاء اللہ ہیں کہ جو شیخ کامل کی صورت میں اللہ تک رسائی سہل اور ممکن بناتے ہیں۔ شیخ کامل کی اس رہنمائی کا اثر مرید پر شیخ کی ظاہری حیات کے بعد بھی جاری رہتا ہے۔ فریدالدین عطار رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی زندگی کو ابن منصور حلاج رحمۃ اللہ علیہ کی ذات کے مطابق ڈھال لیا۔ حالانکہ فریدالدین رحمۃ اللہ علیہ، منصور حلاج رحمۃ اللہ علیہ کے وصال کے ایک سو پچاس سال بعد ظہور پذیر ہوئے تھے۔
عام طور پر یہ روش مشہور ہے کہ اگر ایک شخص نے ایک پیر کی بیعت کی ہے تو وہ مرید اپنے پیر کے وصال کے بعد بھی کسی اور پیر کامل کی بیعت نہیں کرسکتا۔ اس سلسلے میں یہ وضاحت کرنا ضروری سمجھوں گا کہ مرید اپنے شیخ کی ظاہری حیات تک کسی اور کی بیعت نہیں کرسکتا۔ لیکن پیر کے وصال کے بعد مرید کسی بھی مرشد کامل کے حلقہ ارادت میں داخل ہوسکتا ہے اور بیعت کرسکتا ہے۔ حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کے یکے بعد دیگرے بارہ مرشد تھے۔
حقیقت یہ ہے کہ تمام مرشد کاملین صرف ایک ہی نام کی ظاہریت ہیں اور وہ ہے ''الہادی''۔ ایک مرید صادق اپنے شیخ کامل سے انتہا درجے کی عقیدت و احترام رکھتا ہے اور یہ سب کچھ عبادت و ریاضت میں سبقت لے جانے کے لئے نہیں ہوتا بلکہ اس کا مقصد اپنے شیخ کی توجہ اور اس کی رضا کا حصول ہے۔ کیونکہ یہی رضا اس کے لئے رضائے الٰہی کا موجب بنتی ہے۔ اس مقام پر ایک اور جاہلانہ روش کا ذکر کروں گا کہ بعض نام نہاد پیروں نے مفاد پرستی کی بنیاد پر ایک من گھڑت روش کو پروان چڑھا رکھا ہے۔ اور یہ کہ اگر کوئی شخص کسی ایک سلسلۂ طریقت سے منسلک شیخ کی بیعت ہے تو وہ اس مخصوص در کے سوا کہیں اور سے فیض یاب نہیں ہوسکتا۔ اس من گھڑت اور بے بنیاد روش کا مقصد فقط یہ ہے کہ یہ ڈھونگی پیر اپنے مریدین کو ایک نفسیاتی زنجیر میں جکڑ کر رکھیں اور ان کا نفسیاتی استحصال کریں۔

کیونکہ انہیں خوف ہوتا ہے کہ ان کے مریدین کسی دوسرے کے ساتھ نسبت نہ پیدا کرلیں اور اگر ایسا ہوگیا تو پھر وہ اپنی روزی روٹی کہاں سے لائیں گے۔

مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ ''تشبیہات رومی رحمۃ اللہ علیہ'' میں جھوٹے پیروں کی اس روش کی مذمت کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

''بعض جھوٹے پیروں نے تصوف کی اصطلاحیں یاد کر رکھیں ہیں اور روحانی زندگی کے بارے میں دلفریب تقریریں کرتے ہیں۔ان کی مثال ایسی ہے کہ بعض صیاد پرندوں کا شکار کرنے کے لئے پرندوں کی بولیوں کی نقل میں ایسی مشق کر لیتے ہیں کہ بیچارے سادہ لوح پرندے دھوکہ کھا جاتے ہیں کہ کوئی دوسرا پرندہ ان کا ہم صغیر بول رہا ہے۔ صیاد کسی جھاڑی کے پیچھے چھپا ہوتا ہے، پرندے بغیر کسی ہچکچاہٹ کے اس کے قریب آ جاتے ہیں اور وہ انہیں جھپٹ لیتا ہے۔ آدمی کی صورت میں تمہیں بہت سے ابلیس ملیں گے جو رہنما نہیں بلکہ رہزن ہیں، دھوکے میں آ کر ان کی بیعت نہ کر لینا۔''

ایک اور مقام پر مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ جھوٹے صوفی و پیر کو بے تحقیق مقلد کہہ کر ملامت کرتے ہوئے ان کی پرخوری کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

'' ایک اسی طرح کا صوفی پیر مرجع خلائق بن گیا تھا۔عوام اس کی دست بوسی کرتے تھے تو اس کا نفس پھول جاتا تھا۔اس نے یہ بھی دعویٰ کر رکھا تھا کہ میں جہاد نفس کا مجاہد ہوں جو جہاد اکبر ہے۔میرے لئے جہاد بالسیف (کافروں کے خلاف شمشیر زنی) بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ پھر ایک مرتبہ کفار کے خلاف جہاد کے لئے لشکر روانہ ہوا تو حضرت بھی ساتھ ہو لئے۔لیکن احتیاط سے لشکر کے عقب میں ہی رہے جہاں سامان اور خیمے اور بیماروں اور مجروحوں کے لئے انتظام تھا۔ جب لشکر دشمن کو مغلوب کر کے اسیران جنگ اور مال غنیمت لے کر واپس لوٹا تو صوفی صاحب بھی باہر نکلے۔ مال غنیمت کا کچھ حصہ ان کے سامنے

پیش کیا گیا تو وہ فرمانے لگے کہ میں اس کا حق دار نہیں ہوں کیونکہ میں میدان جنگ میں قتال سے محروم رہا۔ گویا شکایت کر رہے تھے کہ میرے جیسے جانباز کو آپ لوگ پیچھے چھوڑ گئے۔ حالانکہ صوفی صاحب جان بچانے کے لئے قتال سے دور رہے تھے۔ ایک لشکری نے ازراہ عقیدت کہا کہ آپ اب کافر کشی کر لیجئے۔ اسیران جنگ میں سے ایک کافر کو جو زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے۔ آپ کے حوالے کر دیتے ہیں آپ اس کی گردن مار کر غازیوں میں شامل ہو جائیں۔ چنانچہ اس کافر کو صوفی کے حوالے کر کے لشکری اپنے خیموں کی طرف چل دیئے۔ کافی عرصہ گزرنے کے بعد وہ صوفی صاحب کے خیمہ کی طرف آئے کہ کافر مقتول کو دیکھیں اور صوفی صاحب کو مال غنیمت کا حصہ دیں۔ وہاں کیا دیکھتے ہیں کہ دست و پابستہ کافر صوفی صاحب کو چت لٹائے ان کے اوپر سوار ہے اور اپنے تیز دانتوں سے کاٹ کاٹ کر ان کو لہولہان کر رکھا ہے۔ لشکریوں نے حیران ہو کر پوچھا کہ اے صوفی مجاہد! یہ کیا معاملہ ہے؟ ہاتھ پاؤں بندھے ہوئے کافر نے تمہیں کیسے گرا دیا کہ تم بے بس ہو کر اس طرح زخمی ہو رہے تھے؟ صوفی نے کہا کیا پوچھتے ہو اس ظالم نے ایسی زہر آلود اور خشمگین آنکھوں سے مجھے گھورا کہ میرے حواس باختہ ہو گئے۔ مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں افسوس کہ ایسے لوگ مذہبی پیشوا اور مجاہد بنے بیٹھے ہیں۔ یہ لوگ لہو لگا کر شہیدوں میں داخل ہونے والے ہیں۔''

نقل ہے کہ عالمگیر بادشاہ کے وقت میں ایک بہروپیا یعنی نقال اپنے فن کا بڑا کامل تھا۔ جب بادشاہ عالمگیر کو خبر ہوئی تو اس نقال کو بلا کر کہا کہ ہم تیرے دھوکے میں نہیں آسکتے۔ نقال نے بادشاہ کی خدمت میں عرض کیا کہ اگر میں آپ کو دھوکا دے دوں تو مجھے کیا انعام ملے گا۔ عالمگیر نے کہا کہ اگر تو نے مجھے دھوکا دے دیا تو تجھے دس ہزار روپیہ انعام دوں گا۔ ورنہ پھانسی تیار ہے۔ نقال نے عرض کیا کہ حضور مجھے منظور ہے لیکن آپ اس بارے میں مجھے

ایک دستاویز لکھ دیں۔ بادشاہ نے اپنی مہر کر کے دستاویز لکھ دی اور نقال لے کر چلا گیا۔ کچھ عرصہ کے بعد عالمگیر کو ملک دکن کی تسخیر کے واسطے فوج کشی کرنی پڑی۔ ادھر اس نقال نے بادشاہ کا ارادۂ فوج کشی معلوم کر کے ملک دکن میں اورنگ آباد کے قریب کسی جنگل میں ڈیرا جالگایا۔ اور فقیرانہ صورت بنا کر خلقت سے منہ موڑ لیا اور بظاہر یاد خدا میں مشغول ہو گیا۔ دنیا واہل دنیا کی طرف سے بالکل بے رغبتی ظاہر کی اور خدا کے مقبول بندوں کے عادات و اخلاق کو خوب اپنایا۔ جو لوگ نذریں وغیرہ اس کے پاس لاتے ان کی طرف توجہ نہ کرتا۔ اور دن رات یاد خدا میں مشغول رہتا۔ گرد و نواح میں اس کی بڑی شہرت ہو گئی۔ لوگ کثرت سے اس کے گرد جمع ہونے لگے اور اسے مقبول خدا ولی اللہ جاننے لگے۔ اس کی شہرت کا عام چرچا ہو گیا۔ وہ عالمگیر بادشاہ کے آنے کا منتظر رہتا کہ کب آئے تو دھوکا دوں۔ آخر کار کچھ عرصہ کے بعد عالمگیر بھی وہاں پہنچ گیا۔ عالمگیر بڑا ہی خدا پرست اور فقیر دوست بادشاہ تھا۔ اس کی عادت تھی کہ جہاں کہیں کسی متقی و پرہیزگار فقیر کو پاتا۔ اس سے ملتا اور شاہانہ سلوک سے اس کے ساتھ پیش آتا۔ جب اورنگ آباد میں پہنچا تو حسب عادت لوگوں سے پوچھا کہ یہاں بھی کوئی باخدا درویش ہے کہ نہیں۔ لوگوں نے اسی فقیر کا ذکر کیا اور حد سے زیادہ اس کی تعریف و توصیف بیان کی۔ بادشاہ نے سوچا کہ اسے آزمانا چاہئے۔ اگر وہ واقعی دنیا سے بے رغبت اور انقطاع والا ہے تو ہم بھی اس کی زیارت کریں۔ چنانچہ عالمگیر نے وزیر کو سو اشرفیاں دے کر بھیجا جب وزیر اس کے پاس گیا تو اس نے دور سے ہی دیکھتے گردن جھکائی اور گویا مراقب ہو کر بیٹھ گیا۔ وزیر آیا اور باادب ہو کر بیٹھ گیا۔ بڑی دیر بعد جب اٹھ کر واپس جانے کے حیلے کرنے لگا۔ تو اس نے گردن اٹھا کر وزیر کی جانب دیکھا۔ وزیر نے بڑے ادب سے سلام کیا۔ فقیر نے پوچھا تم کون ہو اور کہاں سے آئے ہو؟ کیا کام ہے؟ وزیر نے کہا میں عالمگیر بادشاہ کا وزیر ہوں اور حضور کے سلام و زیارت کو آیا ہوں۔ اور اشرفیاں پیش کر کے کہا کہ بادشاہ نے یہ حضور کی نذر بھیجی ہے اسے منظور فرمالیں۔ فقیر نے جواب دیا کہ میں ایسی ہی کتی دنیا سے منہ موڑ کر اور کنارہ کش ہو کر صرف اللہ تعالیٰ کے وصل

اور دیدار الٰہی کے شوق میں یہاں آبیٹھا ہوں۔ مجھ پر آپ کا بڑا ہی احسان ہوگا اور میں آپ کے واسطے بہت ہی دعا کروں گا۔ جو آپ مجھے اس سے معاف رکھیں اور یہ اشرفیاں واپس لے جائیں۔ وزیر نے دینے میں بہت اصرار کیا۔ لیکن فقیر نے ایک نہ مانی۔ آخر مجبور ہو کر وزیر اشرفیاں لئے ہوئے واپس چلا گیا اور بادشاہ کے پاس سارا قصہ جا سنایا۔ بادشاہ کو بھی اس کی ملاقات کا شوق پیدا ہو گیا اور سات گاؤں کا پٹہ معافی اور دو ہزار اشرفیاں نذر کے واسطے لے کر فقیر کے پاس پہنچا۔ فقیر بادشاہ کی آمد کی خبر سن کر مراقب ہو گیا اور جس وقت بادشاہ وہاں پہنچا اور سلام علیک کی تو اٹھ کر بڑے تپاک سے ملا۔ مصافحہ کیا اور بہت خوش اخلاقی سے پیش آیا۔ ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ انجام کار بادشاہ نے وہ پٹہ معافی اور اشرفیاں پیش کیں۔ فقیر نے لینے سے انکار کر دیا۔ بادشاہ نے پھر دینے میں اصرار کیا اس نے پھر بھی انکار ہی کیا۔ تین چار بار جب اسی قسم کا اصرار و انکار ہو چکا تو تنگ آ کر فقیر نے کہا کہ آپ بار بار یہی دینا چاہتے ہیں تو میں کسی اور جنگل میں جا بیٹھوں گا۔ مگر اس کی طرف منہ نہیں کروں گا۔ بادشاہ کو مجبور ہو کر اپنے ارادے سے باز رہنا پڑا مگر فقیر کی عقیدت دل میں زیادہ بڑھ گئی۔ چلتے وقت فقیر سے کہا کہ حضرت کل صبح میری فوج کا کوچ ہوگا۔ میری دلی تمنا ہے کہ کل آپ کی زیارت کر کے کوچ کروں۔ فقیر نے کہا کہ آپ بادشاہ ہیں۔ سلطنت اور فوج کے کاروبار آپ کو بہت ہیں۔ آپ تکلیف نہ فرمائیں کل صبح میں خود ہی حاضر خدمت ہوں گا۔

آخر بادشاہ تو اقرار کرا کر چلا گیا اور ڈھونگی فقیر نے اپنی وہی پرانی خنجری بغل میں دبائی اور صبح ہوتے ہی بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ بادشاہ کو خبر ہوئی تو تخت سے اتر کر اس کے استقبال کو آیا اور ساتھ لے جا کر تخت پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ فقیر جو دراصل بہروپیا تھا دعائے ترقی سلطنت اور جان و ایمان دے کر عرض کرنے لگا کہ حضور میں وہی بہروپیا ہوں جس نے حضور کو دھوکا دینے کا وعدہ کیا تھا۔ سو اب دھوکا پورا ہو چکا۔ کیونکہ آپ مجھے نہیں پہچان سکے اور بغل میں سے وہی خنجری نکال کر بجانے لگا۔ بعد ازاں وہی دستاویز دکھا کر کہا کہ

حضور اپنا وعدہ پورا کریں۔ بادشاہ تخت پر جا بیٹھا اور اس نقال سے کہا کہ بے شک تو مجھے دھوکا دے چکا اور میں تجھے نہیں پہچان سکا۔ مگر ایک بات بتا کہ جب میں تیرے پاس سات گاؤں کی معافی کا پٹہ اور دو ہزار اشرفیاں جو نسل در نسل تیرے اور تیری اولاد کے کام آتی اور یہ دس ہزار روپیہ جو اس کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں لے کر گیا۔ تو نے وہ کیوں نہ منظور کیا۔ حالانکہ نہ میں نے تجھے پہچانا تھا اور نہ تیرے پاس کسی کو تفتیش حالات کے واسطے آنا تھا تو مدۃ العمر چین سے زندگی بسر کرتا۔ پھر کون سا امر تجھے مانع ہوا۔ اس نے کہا حضور سچ تو یہ ہے کہ جس پاک گروہ کی نقل کر کے میں نے حضور کو دھوکا دیا ہے۔ ان کو اس سے سخت نفرت تھی۔ اگر میں آپ سے وہ اشرفیاں اور پٹہ لے لیتا۔ تو اس پاک گروہ پر دھبہ لگتا اور نقل میں غلطی اور جھوٹ ہوتا اور میدان قیامت میں مجھے شرمندگی ہوتی جب اولیاء رحمۃ اللہ علیہم کی ارواح طیبہ فرماتیں کہ نالائق کیا ہم ایسے ہی تھے۔ جیسی تو نے نقل اتاری ہے۔ ہم تارک دنیا تھے تو نے ہمیں طالب دنیا بنایا ہے۔ اس لئے دس ہزار روپے پر اکتفا کیا اور اتنی بڑی جائیداد اور سونا ترک کیا اور میں نے نقل صحیح صحیح اتاری۔ اس میں کوئی غلطی نہیں ہونے دی۔ اس لئے یہ دس ہزار روپیہ میرے واسطے حلال ہے۔ عالمگیر نے اس کو اٹھا کر چھاتی سے لگا لیا کہ تو نے کس قدر بزرگوں کی تعظیم کا خیال رکھا۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا مرشد کے دروغ کے باوجود مرید معتقد کا فروغ ممکن ہے اور یہ کہ ان لوگوں کی نسبت کیا رائے قائم کرنی چاہیئے جو تلبیس ابلیس سے کسی شخص کو امام و مجتہد اور ولی اللہ و مجدد سمجھ کر اس کے متعلق خوش عقیدگی میں عمر گزار دیتے ہیں؟ تو ان لوگوں کے لئے یہ کہنا ہے کہ جھوٹا امام تو مردود ہی ہے اور اس کی عاقبت فی النار و السقر ہے۔ لیکن دھوکہ کھایا ہوا مرید نجات یاب ہو سکتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ امام باطل کو اپنے تصور میں اخلاق فاضلہ سے متصف سمجھ لیتا ہے اور اپنے آپ میں وہ خوبیاں پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے جو اس کے امام میں درحقیقت موجود نہیں۔

اس کے متعلق مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ ایک عمدہ مثال پیش کرتے ہیں کہ ایک شخص

اندھیری رات میں جب کہ قبلہ کی سمت معلوم کرنے کا کوئی یقینی ذریعہ نہ ہو کسی ایک غلط سمت کو قبلہ سمجھ کر نماز ادا کرتا ہے تو اس کی یہ نماز از روئے باطل نہیں ہوتی۔ یہی حال کسی بدظن کو قبلہ توجہ بنا لینے کا ہے۔ مرید سے اگر اچھے افعال سرزد ہوئے ہیں تو وہ ضرور اس کے لئے مفید ہوں گے۔ درآں عالیکہ جھوٹے مرشد کو ان سے کچھ فائدہ نہ پہنچے گا۔ مرید کا قصد نیک تھا اگر چہ اپنے مرشد کو جو محض جسد بے روح تھا اس نے روحانی لحاظ سے جاندار سمجھ لیا تھا۔

ایسے پیروں سے کہنا صرف اتنا ہے کہ قہرِ الٰہی کو خاطر میں لائیں اور ایسے مجبور اور بے کس لوگوں کی نیک نیتی کا مذاق نہ اڑائیں۔ وہ تو اس دنیا کے تند و تیز جھونکوں سے پناہ کی خاطر تمہیں ایک سائبان سمجھ کر تمہارے پاس آتے ہیں تا کہ ان کو رضائے الٰہی نصیب ہو۔ لیکن تم ان کی اس بے بسی و بے کسی کا فائدہ اٹھا کر ان کو اپنا ذریعہ معاش بنا لیتے ہو اور ان کو مزید مجبور و بے بس کر دیتے ہو۔ فقط یہ کہہ کر کہ "جتنا گُڑ ڈالو گے اتنی مٹھاس پیدا ہوگی۔"

حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ اپنے مکتوب نمبر ۱۷۱ میں شیخ نور کو رقم کرتے ہیں۔

"وہ مرید جو طالب بن کر آئے اور سلوک میں مشغول ہونے کا ارادہ ظاہر کرے۔ اسے ببر شیر کی طرح خطرناک جاننا چاہئے۔ کہ کہیں اس طرح وہ اس کی خرابی نہ چاہتے ہوں اور اس کے فتنے میں پڑنے کا باعث نہ بن جائیں۔ اور اگر بالغرض کسی مرید کے آنے سے اپنے میں فرحت اور سرور محسوس کریں تو اسے کفر و شرک کی طرح برا جانیں اور اس کا تدارک، ندامت اور استغفار کے ذریعہ اس حد تک کر لیں کہ اس کے سرور کا بالکل امکان نہ رہے۔ بلکہ اس فرحت کی جگہ غم اور خوف بیٹھ جائے اور اپنے خلفاء کو اچھی طرح تاکید کریں کہ مرید کے مال میں طمع اور اس سے دنیوی منافع کی امید پیدا نہ ہو۔ کیونکہ یہ بات مرید کی ہدایت میں رکاوٹ ہے اور پیر کی خرابی کا باعث ہے۔ کیونکہ اللہ کی طرف سے صرف دین خالص کا مطالبہ ہے۔"

سورۃ الزمر میں آتا ہے۔

''سن لوکہ خالص دین اللہ ہی کے لئے ہے۔''(زمر:3)

عبادت لطف و سرور کا مزہ اٹھانے کے لئے نہیں۔ عارفین نے تو عبادت کی لذت کے قصہ سے بھی پناہ مانگی ہے۔ اگر ساری عمر گزر جائے اور کوئی لذت ان کو نہ آئے تو وہ اس پر بھی خوش رہتے ہیں۔

ہاں اگر کوئی مرید نیک نیتی کی بناء پر اپنے شیخ کامل کے کسی نیک مقصد کی تکمیل کی خاطر جان و مال سے خدمت کرتا ہے اور جسمانی و روحانی اعتبار سے نذر و نیاز پیش کرتا ہے تو پیر کا یہ فرض ہے کہ وہ اس نذرانہ کو قبول کرے اور اس کی دنیاوی قدر و قیمت کو نہ دیکھے بلکہ اس میں چھپی نیک نیتی اور خلوص کو جانے۔ اور مرید کو اس کا صلہ یہ ملتا ہے کہ اس کا یہ عمل جہاد کے زمرے میں آتا ہے۔ اب اگر کوئی یہ سوال کرے کہ مرید صادق کو تو اس کی نیک نیتی کی بناء پر اس کے عمل کا نیک صلہ مل گیا۔ لیکن اس نذر و نیاز کی اصل حقیقت کیا ہے؟ تو اس امر کی وضاحت کے لئے سورہ مجادلہ کی ذیل کی آیت کے پس منظر میں چلتے ہیں کہ جس میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے!

''کیا تم اس سے ڈرے کہ تم اپنی غرض سے پہلے کچھ صدقے دو اور پھر جب تم نے یہ نہ کیا اور اللہ نے اپنی مہر سے تم پر رجوع فرمائی۔''(مجادلہ:13)

اس آیت کریم کے شان نزول کے بارے میں حضرت احمد رضا خان بریلوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ سید عالم کی بارگاہ میں جب اغنیاء نے عرض و معروض کا سلسلہ دراز کیا اور نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ فقراء کو اپنی عرض پیش کرنے والوں کی عرض پیش کرنے سے پہلے صدقہ دینے کا حکم دیا گیا اور اس حکم پر حضرت علی علیہ السلام نے عمل کیا۔ ایک دینار صدقہ کر کے دس مسائل دریافت کئے۔ عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، وفا کیا ہے؟ فرمایا! توحید اور توحید کی شہادت دینا۔ عرض کیا فساد کیا ہے؟ فرمایا! کفر و شرک، عرض کیا حق کیا ہے؟ فرمایا! اسلام و قرآن اور ولائت، جب تجھے (یعنی علی علیہ السلام کو) ملے۔ عرض کیا، حیلہ کیا ہے یعنی تدبیر؟ فرمایا! اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت۔ عرض کیا

راحت کیا ہے؟ فرمایا! اللہ تعالیٰ کا دیدار۔ عرض کیا سرور کیا ہے؟ فرمایا! جنت۔ جب علی المرتضیٰ علیہ السلام ان سوالات سے فارغ ہو گئے تو یہ حکم منسوخ ہو گیا اور رخصت نازل ہوئی اور سوائے علی پاک علیہ السلام کے اور کسی کو اس پر عمل کرنے کا وقت نہیں ملا۔

حضرت احمد رضا خان بریلوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اوپر جو پس منظر بیان کیا گیا ہے وہ اس کی اصل ہے جو مزارات اولیاء پر تصدیق کے لئے شرینی وغیرہ لے جاتے ہیں۔

حضرت معروف کرخی رحمۃ اللہ علیہ سے جب کسی نے اس ضمن میں سوال کیا تو آپ نے فرمایا! ''درویشی یہ ہے کہ کسی کی چیز پر طمع نہ کرے، جب بے طلب کوئی لائے تو منع نہ کرے اور جب لے لیوے تو جمع نہ کرے۔''

اب جبکہ مزارات کا ذکر آیا تو یہ بیان کرتے چلیں کہ احادیث سے پتہ چلتا ہے کہ شروع میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قبروں پر جانے سے صحابہ رضی اللہ عنہم کو منع فرمایا تھا۔ کیونکہ وہ اسلام کے ایام طفولیت تھے کہ جس دوران بنیادی شرعی احکامات کی ترویج کے سلسلے میں یکسوئی درکار تھی۔ کیونکہ ایک ہی بار تمام تعلیمات کے بیان کر دینے سے اہل اسلام کو سمجھنے میں مشکل آسکتی تھی۔ یہ اس طرح ہے کہ جس طرح نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج بھی یکے بعد دیگرے شرعی احکامات میں داخل کئے گئے اور یک مشت ان کا بار نہیں ڈال دیا گیا۔ دوسری بنیادی وجہ یہ تھی کہ ابتدائی ایام میں اہل قبور مشرکین میں سے تھے اور حالت کفر میں مرے، جس بناء پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے زیارت قبور کو اس دور کے لئے منع فرما دیا۔ لیکن بعد میں اجازت مل گئی تھی اور حدیث کی کتابوں میں کثرت سے ایسی احادیث موجود ہیں کہ جن میں جمعہ کے دن قبروں پر جانے، فاتحہ پڑھنے اور اہل قبور کے حق میں دعا مانگنے کی تاکید آئی ہے۔

خود حافظ ابن قیم نے جو امام ابن تیمیہ کے شاگرد ہیں اپنی کتاب ''کتاب الروح'' میں لکھا ہے۔

''جب آدمی اپنے رشتہ داروں کی قبروں پر جاتا ہے تو اہل قبور اس سے خوش

ہوتے ہیں۔ یا اگر کسی کے حالات خراب ہوں تو اہل قبور اس سے غم زدہ ہوتے ہیں۔ اہل قبور، سلام کا جواب دیتے ہیں اور دعا کرنے والوں کے لئے دعا کرتے ہیں۔''

ابن قیم کی اس کتاب میں ایسے واقعات درج ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی امت کے لوگوں کے حالات سے واقف ہوتے ہیں اور خواب میں تشریف لاکر ان کی حوصلہ افزائی فرماتے ہیں۔ غرضیکہ زیارت قبور کے متعلق کسی فرقہ کو اختلاف نہیں۔ البتہ امام ابن تیمیہ نے حدیث ''**لا تشد الرحال الالثلاثة مساجد**'' (اونٹوں پر کجاوے نہ رکھو سوائے تین مساجد کے)۔ سے ایسے مفہوم نکالا ہے کہ جو بالکل نرالا اور باقی تمام احادیث کے منافی ہے۔ امام موصوف فرماتے ہیں کہ اس حدیث میں صرف تین مساجد یعنی بیت اللہ، مسجد نبوی اور مسجد اقصیٰ (فلسطین) کی زیارت کے لئے سفر کی اجازت ہے۔ باقی تمام سفر نا جائز اور حرام ہیں۔ اسی بناء پر انہوں نے روضہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کو بھی حرام قرار دیا ہے۔ ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ امام موصوف نے یہ بات کس طرح کہہ ڈالی۔ جب کہ زیارت قبور قطعی جائز ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نہ صرف بذات خود شہدائے احد وغیرہ کے مزارات پر ہر سال جاتے تھے بلکہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو بھی جانے کا حکم فرماتے تھے اور زیارت قبور کے آداب بھی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو تعلیم فرماتے تھے۔ تو پھر مندرجہ بالا حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے زیارت قبور کی کیونکر ممانعت ہوسکتی ہے؟

دراصل اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ سوائے ان تین مساجد کے کسی مسجد کی زیارت کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ بیت اللہ میں ایک رکعت نماز پڑھنے سے ایک لاکھ رکعت کا ثواب ملتا ہے، مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں پچاس ہزار کا اور مسجد اقصیٰ میں پچیس ہزار رکعت کا۔ لیکن باقی کسی مسجد میں یہ خصوصیت نہیں ہے۔ اگر اس حدیث کی رو سے صرف ان تین مساجد کا سفر جائز ہے اور باقی تمام سفر حرام ہیں تو پھر تحصیل علم کے لئے اونٹوں پر سفر کرنا،

ماں باپ، استاد یا کسی اور بزرگ کی خدمت میں حاضر ہونا بھی حرام ہے۔ غرضیکہ اسی محدود مفہوم سے دنیا کے ہر کام کے لئے اونٹوں پر سفر کرنا حرام ہوتا ہے۔ طرفہ یہ کہ امام تیمیہ یہ بات تسلیم فرماتے ہیں کہ زیارت قبور جائز ہے اور مدینہ اور اس کے گردونواح کے لوگوں کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مزار مبارک کی زیارت جائز ہے۔ لیکن دور کے لئے جن کو اونٹوں پر سوار ہو کر آنا پڑتا ہے یہ سفر حرام ہے۔ کس قسم کا استدلال ہے۔ اس کے تو یہ معنی ہوئے کہ روضۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر حاضری حرام نہیں بلکہ اونٹوں پر سفر کرنا حرام ہے۔ نیز جب امام موصوف سے لوگوں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی تو اونٹوں پر سوار ہو کر مسجد قباء کو جایا کرتے تھے جو مدینہ منورہ سے چھ میل دور ہے اور جہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت کے وقت قیام فرمایا تھا۔ تو امام صاحب نے فرمایا کہ کیا یہ بھی کوئی سفر ہے جس میں نہ پانی کا بندوبست کیا گیا ہو نہ زادراہ جمع کیا گیا ہو۔ واہ کیا کہنا امام صاحب کے استدلال کا اس پر تو ہمارے گلی کے بچے بھی ہنس دیں گے۔ دوسری جانب یہ استدلال قائم کرتے ہوئے امام موصوف نے شائد اس چیز کو مدنظر نہ رکھا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تو تین میل کے فاصلے پر بھی بعض اوقات قصر نماز ادا کرتے تھے اور یہ تو پھر چھ میل کا فاصلہ ہے۔ بہرحال یک نہ شد دوشد۔ اب تو یہ ثابت ہوا کہ نہ روضہ اقدس پر حاضری حرام ہے کیونکہ مدینہ کے لوگ روزانہ حاضر ہوتے ہیں۔ نہ اونٹوں کا سفر حرام ہے کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اونٹوں کا سفر ایک چھوٹی مسجد کے لئے فرمایا۔ حرام ہے تو زادراہ لینا حرام ہے اس امام کا یہ منفرد استدلال اور انداز فکر ہماری سمجھ سے تو بالا ہے۔

اور جس پر ابن بطوطہ بھی یہ کہے بغیر نہ رہ سکے کہ

''شائد اللہ نے امام صاحب کو عقل سے زیادہ علم عطا کر دیا۔''

مزید معلومات کی خاطر ملاحظہ ہو ابن تیمیہ کے شاگرد رشید حافظ ابن قیم کی کتاب ''کتاب الروح'' اور ''مدارج السالکین۔''

اس ضمن میں سورۃ بقر میں ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

"آئے تمہارے پاس تابوت جس میں تمہارے رب کی طرف سے دلوں کا چین ہے اور کچھ بچی ہوئی چیزیں ہیں۔ معزز موسیٰ علیہ السلام اور معزز ہارون علیہ السلام کے ترکہ کی۔ اٹھاتے لائیں گے اسے فرشتے بے شک اس میں بڑی نشانی ہے تمہارے لئے اگر ایمان رکھتے ہو۔" (بقرہ:248)

اس آیت کریمہ کا شان نزول یہ ہے کہ بنی اسرائیل نے حضرت شمول علیہ السلام سے عرض کیا کہ اگر اللہ تعالیٰ نے انہیں سلطنت کے لئے مقرر فرمایا ہے تو اس کی نشانی کیا ہے؟ تو حضرت شمول علیہ السلام پر ایک تابوت بھیجا گیا، یہ تابوت "شمشاد کی لکڑی کا ایک زراندود" صندوق تھا۔ جس کا طول تین ہاتھ اور ارض دو ہاتھ کا تھا۔ اس کو اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام پر نازل فرمایا تھا۔ اس میں تمام انبیاء کی تصویریں تھیں۔ ان کے مساکین اور مکانات کی تصویریں تھیں اور آخر میں حضور سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دولت سرائے اقدس کی تصویر ایک یاقوت سرخ میں تھی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم بحالت نماز قیام میں ہیں اور گرد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب رضی اللہ عنہما ہیں۔ حضرت آدم علیہ السلام نے ان تصویروں کو دیکھا۔ یہ صندوق وراثتاً منتقل ہوتا ہوا حضرت موسیٰ علیہ السلام تک پہنچا۔ آپ اس میں توریت بھی رکھتے تھے اور اپنا مخصوص سامان بھی۔ چنانچہ اس تابوت میں الواح توریت کے ٹکڑے بھی تھے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا عصاء اور آپ کے کپڑے اور آپ کے نعلین شریفین اور حضرت ہارون علیہ السلام کا عمامہ اور ان کا عصاء اور تھوڑا سا "من" جو بنی اسرائیل پر نازل ہوا تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام جنگ کے موقعوں پر اس صندوق کو آگے رکھتے تھے۔ اس میں بنی اسرائیل کے دلوں کی تسکین رہتی تھی۔ آپ کے بعد یہ تابوت بنی اسرائیل میں متوارث ہوتا چلا آیا۔ جب انہیں کوئی مشکل درپیش ہوتی وہ اس تابوت کو سامنے رکھ کر دعائیں کرتے اور کامیاب ہوتے۔ دشمنوں کے مقابلے میں اس کی برکت میں فتح پاتے۔ پھر جب بنی اسرائیل کی حالت خراب ہوئی اور ان کی بدعملی بڑھ گئی اور اللہ تعالیٰ نے ان پر عمالقہ کو مسلط کیا تو وہ ان سے تابوت چھین کر لے گئے اور اس کو

نجس اور گندے مقامات میں رکھا اور اس کی بے حرمتی کی۔ ان گستاخیوں کی وجہ سے وہ طرح طرح کے امراض و مصائب میں مبتلا ہوئے۔ ان کی پانچ بستیاں ہلاک ہوئیں اور انہیں یقین ہوا کہ تابوت کا آنا بنی اسرائیل کے لئے طالوت کی بادشاہی کی نشانی قرار دیا گیا تھا۔ بنی اسرائیل یہ دیکھ کر اس کی بادشاہی کے مقر ہوئے اور بے درنگ جہاد کے لئے آمادہ ہو گئے۔ کیونکہ تابوت پا کر انہیں اپنی فتح کا یقین ہوگیا۔ طالوت نے بنی اسرائیل میں سے ستر ہزار جوان منتخب کئے جن میں حضرت داؤد علیہ السلام بھی تھے۔ اس سے معلوم ہوا کہ بزرگوں کے تبرکات کا اعزاز و احترام لازم ہے۔ ان کی برکت سے دعائیں قبول ہوتیں ہیں اور حاجتیں روا ہوتی ہیں۔ تبرکات کی بے حرمتی گمراہوں کا طریقہ اور بربادی کا سبب ہے۔ تابوت میں انبیاء علیہ السلام کی جو تصویریں تھیں وہ کسی آدمی کی بنائی ہوئی نہ تھیں بلکہ اللہ کی جانب سے آئی تھیں۔

مندرجہ بالا تفصیل کے بعد اپنے اصل موضوع کی جانب لوٹتے ہوئے عرض ہے کہ اس حقیقت میں کوئی شک نہیں کہ ایک مرید جس کی بیعت ہوتا ہے وہ اس کی زندگی تک کسی دوسرے پیر کی بیعت نہیں کرسکتا۔ لیکن جہاں سوال حصول فیض کا آتا ہے تو وہ ایک ہی وقت میں کئی شیوخ کاملین کے فیض کا حامل ہوسکتا ہے اور اپنے پختہ اخلاق و کردار کی بدولت ان سے دستار خلافت بھی حاصل کرسکتا ہے۔ لیکن حصول فیض کے سلسلے میں مرید صادق کو یہی خیال کرنا چاہئے کہ دیگر تمام شیوخ کاملین سے فیض کا حصول اسے اپنے اصل پیر کے توسل سے ہی ہے۔ سالک کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ طریقت کے صرف ایک ہی سلسلے سے فیض یاب ہوسکتا ہے۔ بلکہ وہ تمام سلاسل طریقت کے بزرگان سے اپنی استطاعت کے مطابق فیض یاب ہوسکتا ہے۔ لیکن شرط صرف اتنی رہتی ہے کہ جس سلسلے میں وہ بیعت ہوتا ہے اس سلسلے کی اونچ نیچ کو ہی اپنی زندگی پر لاگو رکھے۔ اگر سالک کسی اور مقام سے بھی فیض کے حصول کا خواہش مند ہے تو اس کے لئے پہلے اپنے پیر و مرشد سے اجازت لینا ضروری ہے اور اس کے شیخ کا بھی یہ فرض ہے کہ وہ اپنے اس مرید کے قلب کی وسعت کو

جانچتے ہوئے اسے اجازت عطا کرے۔

حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ مکتوب نمبر ۶۳ جلد سوم میں نور محمد انبالوی کو رقم کرتے ہیں!

''حمد وصلوٰۃ اور دعا گوئی کے بعد عرض ہے کہ جو مکتوب آپ نے ارسال کیا تھا۔
آپ نے پوچھا تھا کہ پیر کی زندگی کے باوجود اگر کوئی طالب کسی اور شیخ کے پاس
چلا جائے اور اس سے خداوند تعالیٰ کی طلب کرے تو یہ جائز ہے کہ نہیں۔''؟

آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ مقصود حق سبحانہ وتعالیٰ ہے اور پیر حق تعالیٰ کی بارگاہ تک پہنچنے کا ایک وسیلہ ہے۔ اگر کوئی طالب اپنی بھلائی دوسرے شیخ کے پاس دیکھے اور اپنے دل کو اس کی صحبت میں حق سبحانہ وتعالیٰ سے جمع پائے تو جائز ہے کہ پیر کی زندگی میں اس شیخ کامل کے پاس چلا جائے (اگر پہلا پیر کامل نہ ہو تو بغیر اجازت ہی دوسرے شیخ کے پاس جا سکتا ہے) اور اس سے بھلائی طلب کرے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ پہلے پیر سے انکار نہ کرے اور اس کو نیکی سے یاد کرے (یعنی بیعت پہلے پیر کامل سے ہی رہے گی اگر حقیقتاً وہ کامل ہو اور اس کی زندگی میں بیعت کہیں اور نہیں ہو سکتی۔ لیکن فیض کے حصول کے لئے کسی دوسرے مرشد کامل سے رابطہ جائز ہے)۔

آگا از خویشتن چوں نیت حنین
کے خبردار داز چناں چنین

(یعنی ماں کے پیٹ کا بچہ جب اپنی خبر بھی نہیں رکھتا تو وہ کسی کی خبر کیا رکھے گا؟)

خود حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ اپنے والد شیخ عبدالاحد رحمۃ اللہ علیہ کے دست پر بیعت تھے اور ان کا تعلق سلسلہ چشتیہ سے تھا۔ اس کے بعد مجدد پاک رحمۃ اللہ علیہ کو شاہ کمال کیتھلی کی طرف سے ہی خرقہ خلافت عطا ہوا اور ان کا تعلق سلسلہ قادری سے تھا۔ اس کے بعد سلسلہ نقشبندیہ کے بزرگ حضرت باقی باللہ رحمۃ اللہ علیہ سے بھی آپ کو خلافت کی ذمہ داریاں ملیں۔ روایات میں آتا ہے کہ حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کو سلسلہ چشتیہ

کے ۲۷، قادریہ کے ۲۵ اور نقشبندیہ کے ۲۱ واسطوں سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے نسبت تھی۔ ان تمام سلاسل طریقت سے فیض حاصل کرنے کے بعد آپ کو یہ کمال مقام حاصل ہوا کہ حضرت باقی باللہ رحمۃ اللہ علیہ اپنے اس مرید صادق کی بارگاہ میں آکر اپنے مریدوں کے ساتھ بیٹھتے اور اپنے مریدین کو تلقین فرماتے کہ مجدد پاک رحمۃ اللہ علیہ کی موجودگی میں اپنی توجہ مجھ سے ہٹا کر ان کی جانب کرلیا کرو۔ پیر کے دل میں مرید کے لئے ایسی محبت اور احترام کی یہ بے نظیر مثال ہے جو ہمیں کہیں اور نظر نہیں آتی۔

❖ مرید بھی دو اقسام کے حامل ہوتے ہیں۔ ایک عام اور دوسرے خاص۔ پیر کامل ان کی تربیت ان کی قابلیت، مستعدی، احساسات اور مزاج کے مطابق مختلف طریقوں سے کرتا ہے۔ ایک کو پیر کی جانب سے عام ہدایات ملتی ہیں اور دوسرے کو خاص کہ جو عام مرید کو نہیں دی جاتیں یا یوں سمجھ لیجئے کہ عام مرید کے لئے ''ولائت عامہ'' ہے اور خاص مرید کے لئے ''ولائت خاصہ'' ہے۔ جہاں تک ولائت عامہ کا تعلق ہے تو ہر مرید اس کا حامل ہے۔

جیسا کہ سورۃ فاطر کی آیت نمبر ۳۲ میں ارشاد ہوتا ہے۔

''پھر یہ کتاب ہم نے ان لوگوں کے ہاتھوں میں پہنچائی جن کو ہم نے اپنے بندوں میں سے پسند فرمایا۔ پھر بعض تو ان میں اپنی جانوں پر ظلم کرنے والے ہیں اور بعض ان میں متوسط درجے کے ہیں اور بعض ان میں وہ ہیں جو خدا کی توفیق سے نیکیوں میں ترقی کئے جاتے ہیں۔ یہ بڑا فضل ہے۔''

مندرجہ بالا آیات میں ان مومنین کا ذکر ہے جن کو اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے پسند فرماتا ہے اور اس کے تین درجے بیان کئے گئے ہیں۔ پھر ولائت عامہ کی تصدیق کرتے ہوئے ایک اور جگہ ارشاد ہوتا ہے۔

''اور جو لوگ اللہ پر اور اس کے رسولوں پر ایمان رکھتے ہیں ایسے ہی اپنے رب کے نزدیک صدیق اور شہید ہیں۔ ان کے لئے ان کا اجر اور ان کا نور ہوگا۔''

(الحدید:19)

ولائت عامہ کے حامل مریدین جو ایمان تو رکھتے ہیں لیکن نیک اعمال سے محروم ہیں۔ پہلی آیت کے مطابق اس درجہ بندی میں سب سے نچلی سطح پر ہیں۔ یہی مریدین اگر نیک اعمال، مجاہدہ اور ریاضت کی توفیق پا کر ترقی پاتے جائیں تو انہیں ولائت خاصہ عطا ہوتی ہے۔ دوسرے الفاظ میں وہ ''اولیاء'' کہلاتے ہیں۔ جن کی تعداد کسی کو معلوم نہیں اور نہ ہی وہ لازمی طور پر ایک دوسرے کے متعلق واقفیت رکھتے ہیں۔

تمثیلاً عرض ہے کہ ریل میں انجن کے ساتھ فرسٹ کلاس کے ڈبے بھی لگے ہوتے ہیں جو نہایت شاندار ہوتے ہیں۔ سیٹیں بھی نہایت عمدہ ہوتی ہیں اور اس ریل میں تھرڈ کلاس کے ڈبے بھی جڑے ہوتے ہیں جن کی سیٹیں بھی پھٹی ہوتی ہیں۔ اسکرو بھی ڈھیلے ہوتے ہیں چوں چوں کی آوازیں آ رہی ہوتی ہیں لیکن اگر صحیح طرح سے ریل سے جڑے ہوئے ہیں تو جہاں فرسٹ کلاس کے ڈبے پہنچتے ہیں تھرڈ کلاس کے ڈبے بھی چوں چوں کرتے ہوئے وہیں پہنچ جاتے ہیں۔ اسی طرح اللہ والوں سے جڑ جاؤ ان سے صحیح تعلق پیدا کر لو۔ اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ اگر عمل میں ان جیسے نہ بھی ہو سکے کچھ کمی بھی رہ گئی تو بھی ان شاء اللہ اس تعلق کی برکت سے توبہ و استغفار و ندامت کے سہارے ان کے ساتھ ہی محشور ہوں گے اور جنت تک پہنچیں گے۔ اللہ والوں سے تعلق رکھنے والا اگر کامل نہ بھی ہو سکا تو تائب ضرور ہو جائے گا۔ اگر کاملین میں نہ اٹھایا گیا تو کم از کم تائبین میں ضرور اٹھایا جائے گا۔ اللہ والوں سے تعلق رکھنا ضائع نہیں جاتا۔

یہاں پر ایک امر کی وضاحت کرتا چلوں کہ سلسلہ بیعت میں بعض لوگ کسی شیخ کامل کی بارگاہ میں آ کر اس نسبت سے بیعت کرتے ہیں کہ ان کے دنیاوی معاملات میں ان کو دین کی روشنی میں رہنمائی مل سکے تا کہ وہ اپنے دنیاوی حقوق و فرائض کو احسن طریق پر سرانجام دے سکیں۔ ان کا یہ عمل بھی افضل عبادات سے ہی ہے۔ لیکن اس کے لئے ضروری ہے کہ مرید اپنے مقصد بیعت کو بیعت کرنے سے پہلے اپنے پیر کامل پر ظاہر کر دے تا کہ پیر اس کی تربیت اس کے مقصد کے عین مطابق کر سکے۔

یحییٰ معاذ الرازی رحمۃ اللہ علیہ کے ایک عقیدت مند نے ان سے اپنے دنیاوی معاملات میں احکامات الٰہی کے مطابق صلاح مانگی تو الرازی رحمۃ اللہ علیہ نے جواب دیا۔

''جتنا تم خدا کو دوست جانو گے اتنا ہی لوگ تمہیں دوست جانیں گے، جتنا تم خدا سے ڈرو گے اتنا ہی لوگ تم سے ڈریں گے، جتنا تم خدا کے کام میں مشغول ہو گے اتنا ہی لوگ تمہارے کاروبار میں مشغول ہوں گے۔''

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان پاک ہے!

''شریعت میرے الفاظ ہیں، طریقت میرے اعمال اور حقیقت میری ذاتی حالت ہے۔''

دوسری جانب فی زمانہ اکثر لوگ کہتے ہیں کہ اس زمانہ کے صوفیاء وعلماء ذکر کم کرتے ہیں اور پہلے زمانے جیسی عبادت نہیں کرتے۔ دوسری بات یہ کہ پہلے زمانہ کے صوفیاء دال روٹی اور پانی میں باسی روٹی بھگو کر کھاتے تھے۔ آج کل کے صوفیاء یخنی اور مرغ پلاؤ کھاتے ہیں۔ اور تیسرا اعتراض یہ کہ لباس بھی بہت شاندار پہنتے ہیں۔ پیوند والا ٹاٹ اور موٹے کپڑے کا لباس نہیں پہنتے۔ بڑے ٹھاٹ باٹ سے رہتے ہیں۔

جواب نمبر ا: پہلے زمانے کے صوفیاء کے جسم میں خون اتنا زیادہ ہوتا تھا کہ ہر سال انہیں خون نکلوانا پڑتا تھا اگر فصد نہ کھلوائیں تو خون کی زیادتی سے سر میں درد رہنے لگتا تھا اور اب کے زمانہ کے صوفیاء کو خون چڑھوانا پڑتا ہے۔ خون نکلوانے والے زمانے کے احکام خون چڑھوانے والے زمانے پر کیسے لاگو ہو جائیں گے۔ زمانے کے بدلنے سے احکام بدل جاتے ہیں۔ لہٰذا جب کمزوری کا زمانہ آ گیا تو بزرگان دین نے ذکر کی تعداد کو کم کر دیا۔ اب اگر کوئی اتنا ذکر کرے جتنا کہ پہلے بزرگان دین کیا کرتے تھے تو پاگل ہو جائے گا۔ ایک پہلو ان ستر ہزار بار اللہ اللہ کرنے سے جس مقام قرب پر پہنچے گا ایک کمزور پانچ سو بار میں اسی مقام پر پہنچے گا۔ قرب میں ذرہ برابر کمی نہ ہوگی۔ اللہ تعالیٰ کے نظام ہدایت میں ایسے نہیں کہ کمزوروں سے بھی اتنی ہی محنت چاہے جتنی طاقت ور سے۔ اور ولائت ذکر پر نہیں گنا ہوں

سے بچنے پر موقوف ہے۔لہٰذا آج بھی جو سچے اللہ والے ہیں وہ ہر گناہ سے بچتے ہیں اور جو پہلے اولیاء گزرے ہیں وہ بھی تقویٰ ہی سے ولی ہوئے محض ذکر سین نہیں۔ذکر تو تقویٰ کا معین ہے۔

جواب نمبر ۲: دوسرے اعتراض کا جواب یہ ہے کہ جب زمانہ کمزوری آ گیا تو اب طاقت کی غذا کھانا صوفیاء کے لئے ضروری ہے کیوں کہ جب طاقت ہی نہ ہوگی تو کیا عبادت کریں گے اور کیا دین کا کام کریں گے۔ان علماء وصوفیاء کا بادام وغیرہ کھانا ہماری سوکھی روٹی سے افضل ہے۔کیونکہ ان کا بادام اللہ کی راہ پر خرچ ہوگا اس سے جو طاقت آئے گی اس سے وہ تصنیف کریں گے۔تقریر کریں گے۔تبلیغ کریں گے۔اللہ والوں کا کھانا بھی نور ہے۔عبادت ہے۔ ان کا پہننا بھی عبادت ہے۔جاہل وبدعقل انہیں خواہ مخواہ تنقید کا نشانہ بناتے ہیں۔

جواب نمبر ۳: اب رہا یہ اعتراض کہ علماء وصوفیاء کیوں اچھا لباس پہنتے ہیں تو اس کا جواب خود اشرف علی تھانوی صاحب بیان فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں نے سنت سمجھ کر پیوند لگا ہوا کرتہ پہن لیا اور سفر پر روانہ ہونے لگا۔میری اہلیہ نے مجھ سے کہا کہ آپ کپڑے بدل لیجئے اور دوسرے اچھے کپڑے پہن لیجئے۔کیونکہ آپ جب اس لباس میں جائیں گے تو مرید سمجھیں گے کہ آج کل آپ ضرورت مند ہیں۔اشرف علی صاحب فرماتے ہیں کہ واقعی اگر میں اسی لباس میں جاتا تو میرے مریدوں کو دکھ ہوتا اور وہ میرے لئے کپڑے بنوانے کی فکر کرتے۔اور یہ لباس خود سوال بن جاتا۔چنانچہ میں نے دوسرا اچھا لباس پہن لیا۔دوسرے یہ کہ فی زمانہ لوگ ایسے پیوند شدہ لباس زیب تن شخص کو دیوانہ یا پاگل سمجھ کر اس کی باتوں کو نظر انداز کرتے ہیں۔خواہ وہ کلام کتنا ہی فصیح کیوں نہ ہو۔اس لئے جہاں تک ہو سکے علماء کو اچھا لباس پہننا چاہئے۔جتنی اللہ نے حیثیت دی ہے تاکہ مالداروں کو یہ نہ محسوس ہو کہ یہ لوگ پھٹیچر ہیں اگرچہ ٹیچر ہیں اور آئے روز سنیچر ہیں۔

شیطان کا یہ بہت بڑا حربہ ہے۔وہ سوچتا ہے کہ اگر کہیں یہ کسی اللہ والے کا معتقد ہو گیا تو یہ بھی اللہ والا صاحب نسبت ہو جائے گا۔لہٰذا! بزرگوں کو حقیر دکھاتا ہے کہ وہ پہلے جیسے

بزرگ اب کہاں؟ آج کل کے تو یوں ہی ہیں بس نام کے۔لیکن جسم جب ذرا بیمار ہوتا ہے تو کیا آپ حکیم اجمل خان کا انتظار کرتے ہیں کہ دہلی کے قبرستان سے اٹھ کر آئیں۔معمولی حکیموں سے علاج کرانا میری توہین ہے۔یا جو قریبی ہوتا ہے اسی کو دکھاتے ہیں کہ جلدی سے جان بچاؤ۔کیونکہ جان پیاری ہے اس لئے جو حکیم ملتا ہے اسی سے رجوع کرتے ہیں۔ اسی طرح جس کو ایمان پیارا ہوتا ہے وہ کسی اللہ والے کو تلاش کر ہی لیتا ہے۔اور جو بدگمانی کرتا ہے وہ محروم ہی رہتا ہے۔

خود پسندی ایک مرید کے نزدیک اسی طرح ہے کہ جس طرح ایک جان لیوا زہر۔اس ضمن میں سورۃ کہف میں ایک واقعہ کی جانب نشاندہی کی گئی ہے جس کا خلاصہ کچھ اس طرح ہے کہ خضر علیہ السلام نے موسیٰ علیہ السلام کو اپنی مریدی میں اس شرط پر لیا کہ وہ اس کی موجودگی میں اس کے کسی عمل کے بارے میں سوال نہیں کرے گا۔خضر علیہ السلام نے موسیٰ علیہ السلام کو ان سوالوں کے لئے معاف کر دیا کہ جو انہوں نے کشتی کے غرق ہونے اور بچے کے قتل کرنے کے بارے میں کئے تھے۔لیکن جب انہوں نے دیوار بنانے کے بعد معاوضہ نہ ملنے کے بارے میں سوال کیا تو خضر علیہ السلام نے کہا کہ اب ہمارے راستے جدا جدا ہیں۔اس کی وجہ یہ تھی کہ پہلے دو سوال شریعت کے حق میں کئے گئے تھے لیکن آخری سوال اپنے ذاتی مفاد کے لئے تھا۔

حضرت بایزید بسطامی اور عثمان الخیری رحمہما اللہ تعالیٰ اکٹھے نماز ادا کر رہے تھے۔عثمان رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی نماز اس دعا پر ختم کی کہ اے اللہ! مجھے وہ تمام عطا فرما جس کی میں خواہش رکھتا ہوں۔اس کے برعکس حضرت بایزید رحمۃ اللہ علیہ نے یہ دعا مانگی کہ اے اللہ! مجھ سے وہ تمام علیحدہ کر دے جس کی میں خواہش رکھتا ہوں۔عثمان رحمۃ اللہ علیہ نے دریافت کیا یہ کس طرح ممکن ہے؟ بایزید رحمۃ اللہ علیہ نے جواب دیا کہ

"اپنے رب کی جستجو میں رہنے والے کو اپنے نفس کی خواہشات سے کیا لینا؟ وہ تو اللہ کے سوا ہر شے سے باز رہتا ہے اور اپنے وجود کو بھی بھول جاتا ہے۔"

❖ شریعت علماء کے ذریعے اور طریقت و حقیقت، مشائخ عظام کے ذریعے پھیلائی گئیں۔علماء کو یہ دیکھنا اور خیال رکھنا پڑتا ہے کہ برائی اس دنیا میں پھیلنے نہ پائے۔اس لئے وہ جہنم کا خوف اور جنت کی امید و امکان کو قائم رکھتے ہیں۔لیکن یہ بھی سچ ہے آج کل کا المیہ یہ ہے کہ عالم تو دن بدن بڑھتے جا رہے ہیں لیکن اسی مناسبت سے ان کے مابین علم و عمل گھٹتا جا رہا ہے۔

مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ نے اس المیہ کو جس خوبصورتی سے ''تشبیہات رومی'' میں بیان کیا ہے اس انداز سے شاید ہی کوئی دوسرا اسے بیان کر سکے، وہ فرماتے ہیں۔

افسوس کہ دین اور روحانی زندگی میں مقلدوں اور نقالوں اور ریاکاروں نے بہت فساد مچا رکھا ہے۔یہ لوگ کچھ آیات رٹ لیتے ہیں، کچھ احادیث یاد کر لیتے ہیں، کچھ بزرگوں کے اقوال انہیں از بر ہوتے ہیں۔فرماتے ہیں کہ کسی پرندے کی آواز نقل کرنے سے آدمی اس پرندے کے مافی الضمیر اور اس کی فطرت سے کیسے آگاہ ہو سکتا ہے؟ بلبل کی بولی بولنے والے کو کیا پتہ کہ بلبل گل سے کیا کہہ رہا ہے اور کیا محسوس کر رہا ہے؟

گر بیا موزی صفیر بلبلے
تو چہ دانی کوچہ گوید با گلے
لحن مرغاں را اگر وصف شوی
بر ضمیر مرغ کے واقف شوی

اور اگر کچھ سمجھنے کی کوشش کرتا ہے تو یونہی تک لگا رہا ہے اور دینی حقائق کے بارے میں اس قسم کے تک باز کا وہی حشر ہوتا ہے جو اس بہرے کا ہوا ہے جو ایک دوست کی عیادت کو گیا تھا۔اس نے کہا کہ ہمسایہ کی تیمارداری لازمی ہے لیکن میں اس کی خیریت کیسے پوچھوں گا؟ خدا جانے وہ کیا کہے اور میں کیا سمجھوں اور کیا جواب دوں۔اس لئے اندازے اور قیاس سے ایک مکالمہ اپنے ذہن میں تیار کیا۔

میں کہوں گا کہو کیا حال ہے؟

وہ کہے گا شکر ہے، اچھا ہے۔

پھر میں پوچھوں گا کہ غذا کیا ہے؟

وہ کہے گا شربت یا ماش کی پتلی دال۔

میں جواب دوں گا مناسب ہے۔

پھر میں پوچھوں گا آپ کا معالج کون ہے؟

وہ کسی طبیب کا نام لے گا۔

تو میں جواب دوں گا کہ اس کا قدم مبارک ہو۔ ہم نے بھی اس کو آزما کر دیکھا ہے۔

خیر جب وہ بیمار کی تیمارداری کے لئے اس کے گھر پہنچا اور گفتگو از روئے قیاس شروع کی تو معاملہ برعکس ہو گیا اور مریض اس سے ایسا بگڑا کہ اس کا دشمن ہو گیا۔

مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ بعض لوگوں کی عبادت بھی اسی قسم کے بہرے کی عیادت ہوتی ہے۔ دین کے متعلق کچھ بے اصل قیاس آرائی کر رکھی ہے۔ جھوٹی عبادت میں جس قدر زور لگاتے ہیں نتیجہ اتنا ہی مخرب نکلتا ہے۔

بہرے نے مریض سے خیریت پوچھی۔ وہ کچھ تو بیماری سے چڑچڑا ہو رہا تھا اور کچھ اس تیماردار کے خلوص میں بھی اس کو شک تھا۔ مریض نے بگڑ کر کہا مر رہا ہوں۔

تو بہرے نے کہا خدا کا شکر ہے۔

پھر پوچھا کیا کھایا ہے؟

اس نے کہا زہر۔

بہرے نے جواب دیا مبارک ہو اچھی غذا ہے۔

پھر پوچھا علاج کس کا ہے؟

اس نے کہا ملک الموت کا۔

بہرے نے کہا بڑا حکیم حازق ہے۔ اس کا علاج تیر بہدف ہوتا ہے کبھی خطا نہیں کرتا۔ خود ہم نے سفارش کر کے اس کو تمہارے پاس بھیجا تھا۔

مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ بے عقل دین داروں کی عبادت بھی اسی قسم کے الٹے نتائج پیدا کرتی ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ خدا راضی ہو رہا ہے لیکن خدا ان سے اور زیادہ بگڑتا ہے۔

حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ بھی ایسے علماء کی مذمت کرتے ہوئے مکتوب نمبر ۵۳ میں رقم کرتے ہیں۔

''ایک بزرگ نے ابلیس کو فارغ بیٹھا دیکھا تو اس کا راز دریافت کیا۔ اس نے جواب دیا میرا کام اس وقت کے علماء کر رہے ہیں۔''

ایک وہ وقت تھا کہ جب حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ مدینہ میں عمر بھر ننگے پاؤں چلتے تھے اور ایک بار عربی گھوڑوں کا پورا ریوڑ حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی نذر کر دیا۔ انہوں نے کہا کہ کم از کم ایک گھوڑا رکھ لیجئے۔ کہا میں کیا کروں گا؟ کہاں گھوڑا دوڑاؤں گا؟ کیا خبر کہاں کہاں سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے قدم مبارک پڑے ہوں؟ اللہ اللہ کیسے لوگ تھے اور اب ہمارا واسطہ کس قماش کے علماء کرام سے آ پڑا ہے۔

امیر المؤمنین حضرت علی ابن ابی طالب رضی اللہ عنہ کا ایک شخص پر گزر ہوا جو وعظ و گفتگو میں محو تھا، فرمایا۔

''یہ شخص اصل میں صرف یہ کہہ رہا ہے اعرفونی اے لوگو! مجھے بھی تو پہچانو۔''

ابراہیم التیمی سے کوئی مسئلہ پوچھا جاتا تو آپ بے اختیار رو پڑتے اور کہتے کیا تمہیں میرے سوا کوئی نہ ملا کہ میری ضرورت آ پڑی؟ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے کوئی بات پوچھی جاتی تو حضرت حسن علیہ السلام سے رجوع کرنے کا مشورہ دیتے، ابن عباس رضی اللہ عنہ سے دریافت کیا جاتا تو حارث بن زید رضی اللہ عنہ کی راہ بتاتے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے سوال ہوتا تو حضرت علی علیہ السلام کو بلواتے اور عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے سوال کیا جاتا تو وہ سعید بن المسیب رضی اللہ عنہ کا پتہ دیتے۔ ایک ہمارے علماء اور رہبر ہیں کہ انہیں سب کچھ معلوم ہے ان کے پاس ہر سوال کا جواب موجود ہے اور وہ ہر شخص کی نیت سے آشنا ہیں

کہ فلاں غدار ہے، فلاں یہودیوں کا ایجنٹ ہے، فلاں بھارتی لابی کے لئے سرگرم ہے اور فلاں امریکہ کا کارندہ ہے۔

عبادت مصیبت کیسے بن سکتی ہے؟ اس کے متعلق مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں۔

''بعض متکشف عابد، درویش محلے کی مسجد میں رات کے وقت زور زور سے ذکر جہر کرتے ہیں۔ اللہ ھو اور اس قسم کے نعرے اس زور سے لگاتے ہیں کہ ہمسایوں کی نیند اچاٹ ہو جاتی ہے نہ کوئی ضعیف و بیمار سو سکتا ہے اور نہ کوئی تندرست۔ رات کی بے خوابی سے ہمسائے دن میں اپنا کام نہیں کر سکتے۔ اس طرح متعصب، حنفیوں کی مسجد میں سورہ فاتحہ کے بعد اس زور سے آمین کہتا ہے کہ نمازیوں کا حضور قلب، غضب میں بدل جاتا ہے۔ اور اپنی آمین سے دوسروں کی نماز خراب کرتا ہے۔ اس قبیل کی سینکڑوں اور باتیں ہیں جن سے جاہلوں کی دینداری خلق خدا کی دل آزاری بن جاتی ہے۔''

اسی طرح سے فی زمانہ بعض سلاسل طریقت کے ڈھونگی مقلدوں نے اپنی جدید تعلیمات میں عجیب و غریب رنگ ڈھنگ پیدا کر لئے ہیں کہ جن کا اسلام کی نظریاتی اساس سے دور تک کا بھی کوئی رابطہ نہیں۔ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی توجہ اور رضا حاصل کرنے کے لئے ساز اور تالی کا رواج عام کر رکھا ہے اور کہتے یہ ہیں کہ ان سے الہامی رغبت نصیب ہوتی ہے۔ حالانکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں جب مومنین کو نماز کے وقت اکٹھا کرنے کے لئے تجاویز رکھی گئیں تو ان میں سے ایک تجویز طبل بجانے کی بھی تھی۔ لیکن حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ کہہ کر منع فرما دیا کہ اس سے خون میں جوش پیدا ہوتا ہے اور حقیقت بھی کچھ ایسی ہی ہے کہ دوران سماع جو وجد پیدا ہوتا ہے وہ فقط ساز کی تھاپ کی بناء پر ہوتا ہے کہ جسے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے ناپسند فرمایا ہے۔ یہ تو ان مشرکین کی روش تھی اور ہے کہ جو اپنے بتوں کو خوش کرنے کے لئے ساز کا سہارا لیتے ہیں۔ حقیقی وجد فقط اس صورت میں قبول ہے کہ جو خالصاً ذکر الٰہی و رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر مبنی

ہو۔ جیسا کہ ثناء خوانی اور نعت گوئی وغیرہ۔ ساز بینے کی اس روش کی بناء پر متعصبین کو یہ موقع ملتا ہے کہ وہ اہل تصوف پر کیچڑ اچھالتے ہیں۔

جیسا کہ علامہ ابن تیمیہ رقم کرتے ہیں۔

''سماع اور ذکر مشروع کے وقت دل میں جو خوف پیدا ہوتا ہے، آنکھوں سے جو آنسو جاری ہو جاتے ہیں اور بدن کے جو رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ وہ کتاب وسنت کی تصریحات کے موافق بہترین اوصاف ہیں۔ لیکن جس سماع سے دل کی اصلاح ہو سکتی ہے وہ کتاب اللہ کا سماع ہے اور بعض فرقوں نے اس سماع کو بھلا کر قصائد سننا شروع کئے، تالی بجانے لگے اور الاپنا شروع کیا۔ جو کفار کی سیٹی سے مشابہ ہے جس کی خدا نے برائی بیان کی ہے۔''

(فتاویٰ ابن تیمیہ، جلد اول، صفحہ ۱۸۵، ۱۸۶)

جب ان سے کہیں کہ خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر کرنے کا یہ انداز غیر اسلامی ہے تو کہتے ہیں کہ کیا وجہ تھی کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مدینے تشریف آوری پر انہوں نے بچیوں سے دف سنی اور خوش ہوئے؟ تو اس کے جواب میں یہی کہنا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم جو کہ رحمت للعالمین ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان بچیوں کی دل آزاری منظور نہ تھی کہ جو صدق ایمان کے تحت اپنے مخصوص علاقائی انداز میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا استقبال کرتی تھیں اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا وصف تبلیغ یہی تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم جہاں بھی تشریف لے جاتے تو ان کے ماحول کے مطابق وقت گزارتے کہ جس سے اہل علاقہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق حسنہ سے متاثر ہو کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی روش کی پیروی کرتے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے بعد ہمیں کوئی ایسا دوسرا موقع نظر نہیں آتا۔ کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے آنے کے بعد اہل مدینہ نے بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرز زندگی کو اپنا لیا کہ جس میں کسی قسم کے ساز بینے کی کوئی گنجائش نہ تھی۔

جیسے سورۃ حجرات میں آتا ہے۔

''اے ایمان والو! اپنی آوازیں اونچی نہ کرو، اس غیب بتانے والے (نبی) کی آواز سے اور ان کے حضور بات چلا کر نہ کہو جیسے آپس میں ایک دوسرے کے سامنے چلاتے ہو کہ کہیں تمہارے عمل اکارت نہ ہو جائیں اور تمہیں خبر نہ ہو۔''

(الحجرات:2)

اس آیہ مبارکہ سے ثابت ہے کہ جہاں کہیں بھی اللہ اور اس کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر آئے تو ادب کو ملحوظ رکھنا چاہئے اور ادب تالی بجانے میں نہیں۔ بلکہ یہ مقام تو ایسا ہے کہ یہاں حضرت جنید بغدادی وحضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہما سانس کی آواز روک لیتے کہ کہیں بے ادبی نہ ہو جائے۔

موضوع کی جانب واپس آتے ہوئے عرض ہے کہ ذوالقرنین کی دیوار عظیم کے بغیر ''جوج ماجوج'' کو دنیا کا امن چین تباہ کرنے سے روکا نہیں جا سکتا تھا۔ لیکن یہاں پر منازل سلوک میں توقف کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کی راہ کے مسافر کے راستے میں آڑ کھڑی کر دی جائے۔ چنانچہ اولیاء کرام ایسوں سے یہ رکاوٹ ہٹا دیتے ہیں کہ جو قابلیت اور مستعدی رکھتے ہیں اور جو اعلیٰ اخلاق رکھتے ہیں۔ یہ اولیاء دلوں پر سے حجابات ایک دم نہیں اٹھاتے بلکہ وہ اس پردہ کو درجہ بہ درجہ، انچ بہ انچ نظروں کے سامنے سے اٹھاتے ہیں۔ یہاں تک کہ حاجت پوری ہو جاتی ہے اور وہ اس دنیا کو اللہ کے نور سے بھرپور پاتا ہے۔ وہ سب کچھ تصوراتی اور خیالاتی روش کے راستہ سے نہیں کرتے بلکہ وہ یہ منازل کشف (یعنی عالم مثال کے اندر جھانکنا) کے ذریعے طے کراتے ہیں۔ مرید یہ دیکھتا ہے کہ اس دنیا میں کوئی طاقت اور علم نہیں رکھتا سوائے اللہ کے، نہ کوئی دینے والا ہے اور نہ کوئی پالنے والا ہے سوائے اللہ کے۔

❖ ایک انگریز صوفی مصنف لکھتا ہے۔ (ترجمہ)

''یہ دوسری دفعہ ہے کہ میرے پیر نے دھاگہ کے حصول کے لئے اپنا بھاری اونی کپڑے کا کوٹ کسی کو دے دیا ہے اور اپنی ۹۰ سال کی عبادت کی جمع کو بے دین

ومنکرین میں بانٹ دیا۔"

پیر اپنے اندر کی حقیقت کے حصول کے لئے اپنی ظاہری حالت پر غور کرنا چھوڑ دیتے ہیں۔ آغاز میں سالک بھاری اونی کپڑے کا لباس، تسبیح، زہد اور تقویٰ اختیار کرتا ہے۔ لیکن جیسے جیسے وہ آگے بڑھتا جاتا ہے تو وہ کسی چیز کا خیال نہیں کرتا اور اپنی ظاہری سلامتی کے راستے کو چھوڑ کر ملامت کا راستہ اختیار کر لیتا ہے۔ یعنی کہ وہ ظاہر داری کے تمام رسم و رواج کو ترک کر کے حقیقی زہد کی سرگرمی کو اختیار کر لیتا ہے۔

اس حقیقی زہد کی تعریف کرتے ہوئے امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ اپنے ایک پیروکار کو اس طرح نصیحت فرماتے ہیں کہ پانچ خصلتیں کتے سے سیکھو۔

☆ بھوکا ہوتا ہے مگر اپنے مالک کا در نہیں چھوڑتا۔
☆ تمام رات جاگتا ہے اور اپنے مالک کے در کی چوکیداری کرتا ہے۔
☆ خواہ کتنا بھی مار کر نکالیں کبھی کسی دوسرے دروازے پر نہیں جاتا۔
☆ اس کا دنیا میں کوئی مکان نہیں ہوتا۔
☆ اس کے پاس کوئی مال بھی نہیں۔

اگر کوئی یہ چاہتا ہے کہ اپنی ذات سے بے خبر ہو جائے تو ایک میکدہ میں داخل ہو جائے اور دیکھے کہ میکدہ اور میکدہ والا اس سے کیا کر سکتا ہے۔ وہاں اسے اللہ کے اس فرمان کی حقیقت سمجھ میں آئے گی کہ۔

"اے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم! کہہ دیجئے کہ روح میرے رب کے حکم سے ہے۔"

(بنی اسرائیل:85)

کیونکہ میکدہ ایک ایسے شخص کے لئے دنیا سے الگ تھلگ جگہ ہے کہ جو عشق میں ڈوبا رہتا ہے۔ چنانچہ شریعت کے قانون کا تعلق مادی اور ظاہری جسم سے ہے۔ جبکہ روح کا تعلق طریقت سے ہے۔

سورہ ابراہیم میں آتا ہے!

''جس دن بدل دی جائے گی زمین اس زمین کے سوا۔'' (ابراہیم:47)

اس لئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ جس طرح روح کو تقویت پانے کے لئے کسی ظاہری سہارے یعنی جسم کی ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن مقصد کو پالینے کے بعد ظاہریت کی حقیقت کچھ باقی نہیں رہتی۔ اسی طرح شریعت و طریقت کا ایک دوسرے سے واسطہ ہے۔ ایک ولی کی اندرونی حالت کسی پابندی یا رکاوٹ کے تابع نہیں ہوتی۔ ذوالنون مصری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے ایک مرید کہ جس کی ذکر و عبادت چالیس سال کے عرصہ پر محیط تھی کو حکم دیا۔

''تم سوائے فرض و سنت کے اپنی تمام عبادت و ذکر کو ترک کر دو۔''

❖ انسان اللہ کی ایک پھونک کا نتیجہ ہے اور یہ فیض رحمانی کی ایک محدود حد ہے، لامحدود تو اس سے بہت آگے ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے!

''ہم نے انسان کو ٹھیک بنایا پھر اپنی روح اس میں پھونکی۔'' (سجدہ:9)

اس مالک کریم کی صحبت میں آپ ایک ہی سانس کے برابر وقت میں ''فنا'' کی منزل کو پا سکتے ہیں جو کہ سال ہا سال کی عبادت و ریاضت بھی عطا نہیں کر سکتی۔

سورۃ حج میں ارشاد ہوتا ہے۔

''اللہ کا ایک دن تمہاری گنتی کے ایک ہزار سال کی طرح ہے جس کو تم گنتے ہو۔''

(حج:47)

اس آیہ کریمہ کی تفسیر کچھ اس طرح ہے کہ جب ایک کامل پیر ذکر الٰہی میں مشغول ہوتا ہے تو اس کو اللہ کا قرب نصیب ہوتا ہے۔ اور اس کی دیدۂ باطن و ظاہر، تمام اشیاء میں اللہ کا نور دیکھتی ہے اور وہ اپنے آپ کو اس مادی دنیا سے جدا اور اللہ سے قریب پاتا ہے۔ تو اگر اس نے سارا دن ذکر الٰہی کیا تو اس کا مطلب ہے کہ وہ سارا دن اللہ کے قریب رہا اور اللہ کے ہاں ایک دن ہمارے ایک ہزار سال کے برابر ہے۔ تو پھر اس حساب سے اس کامل شیخ کی عبادت بھی ایک ہزار سال کے برابر ہوئی۔

❖ ضرورت سے زیادہ مباح چیزوں کا ارتکاب کرامات کے کم ظاہر ہونے کا سبب ہے۔ خصوصاً جبکہ زائد چیزوں کی کثرت مشتبہ حد تک پہنچ جائے اور پھر اس جگہ سے خدا کی پناہ کہ حرام کے اردگرد پھرنے لگے۔ کرامات کہاں اور خوارق کون سے؟ جتنا بھی مباح چیزوں کا دائرہ تنگ کر دیا جائے گا اور ضرورت کے اندازہ پر اکتفا کیا جائے گا، اتنی ہی کشف و کرامات کی گنجائش زیادہ ہوگی اور ظہور و خوارق کی راہ اتنی ہی کشادہ تر ہوگی۔ ظہور و خوارق نبوت و خلافت کی شرط ہے نہ کہ شرط ولائت کیونکہ نبوت و خلافت کا اظہار واجب ہے نہ کہ اظہار ولائت۔ بلکہ اس مرتبہ میں چھپنا اور پوشیدہ رکھنا زیادہ بہتر ہے کیونکہ پہلی جگہ (مقام نبوت و خلافت) خلق کو دعوت دینا ہے اور دوسری جگہ (مقام ولائت) اللہ جل شانہ کا قرب ہے اور معلوم ہونا چاہئے کہ دعوت کے لئے اظہار لازم ہے اور قرب کے لئے پوشیدگی مناسب ہے۔ کسی ولی سے خوارق کے ظہور کی کثرت اس کی دوسروں پر افضلیت پر دلالت نہیں کرتی کہ جن سے اس قدر خوارق ظاہر نہیں ہوتے۔ بلکہ ہوسکتا ہے کہ کوئی ایسا ولی ہو جس سے کوئی بھی کرامت ظاہر نہ ہوتی ہو اور وہ ان اولیاء سے افضل ہو جن سے کرامات کا ظہور بکثرت ہوتا ہے۔ جیسا کہ نقل ہے خواجہ سید محمد امین آلومہاری رحمۃ اللہ علیہ ایک مرتبہ سفر میں تھے اور ایک شخص مسلسل تین ماہ آپ کے ساتھ رہا۔ جب رخصت ہونے لگا تو کہنے لگا حضرت! میں نے آپ کے ہاں کشف و کرامات کا اثر نہیں دیکھا، صرف مولویت دیکھی ہے۔ آپ نے فرمایا! کہ تم نے سفر و حضر اور مرض و صحت میں مجھے دین و فرائض اور طریقت کے معمولات میں کوتاہی یا غفلت کرتے دیکھا ہے؟ اس نے کہا نہیں۔ آپ نے فرمایا! دین پر استقامت نصیب ہو جائے تو یہ ہزار کرامت سے بہتر ہے۔

مرید کامل

حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ سے کسی نے سوال کیا کہ مرید کون ہے؟ فرمایا! صحبت پیر جو علم کی نگہداشت کرے۔ مراد وہ جو حق تعالیٰ کی رعایت میں ہو۔

مقام مرید بیان کرنے سے پہلے یہ بتا دینا ضروری ہے کہ ایک کامل مرید کی راہ حق میں

جستجو اپنے پیر کی عبادت وریاضت پر فوقیت رکھتی ہے۔آپ یہ سوچتے ہوں گے کہ کس طرح ممکن ہے۔تو اس بارے میں کہوں گا کہ ایک پیر جستجو کے تمام مراحل ومنازل سے گزر کر کندن ہو چکا ہوتا ہے اور مصائب وتکالیف کی بھٹی میں پک کر اس کا ایمان مسلم ہو جاتا ہے اور اب زمانے کے تغیرات اس پایۂ ایمان کو متزلزل نہیں کر سکتے۔وہ جو بن گیا ہے وہی رہے گا،اپنی منزل کو پانے کے بعد اس کی جستجو ختم ہوگئی۔اب اس کا کام صرف اس مقام پر اپنے قدموں کو مضبوط کرنا ہے۔اور بطور مثال اپنی کاوش کو دوسروں کے سامنے پیش کرنا ہے کہ کوئی شک نہیں کہ تم بھی اس جستجو کو اپنانے کی ہمت اور اہلیت رکھتے ہو اگر چاہو تو۔اور جب ایک مرید اس جستجو کو اپنانے کے لئے اپنے نفس کو مجاہدہ میں ڈالتا ہے اور اس منزل کو پانے کی تگ ودو میں لگ جاتا ہے کہ جہاں پر اس کے پیر کا مسکن ہے۔تو یہ جہاد فوقیت رکھتا ہے اس عبادت وریاضت پر کہ جو منزل پر پہنچنے کے بعد ہے۔کیونکہ آغاز میں دو چیزوں کا عمل دخل ہے۔ایک جستجو اور دوسری عبادت وریاضت۔لیکن منزل پر پہنچنے کے بعد صرف عبادت و ریاضت رہ گئی اور جستجو نے اپنا کام مکمل کرلیا۔

جیسا کہ حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ بار بار اپنے آپ کو مقام فنا وبقا سے نیچے لاتے اور پھر دوبارہ سے اپنے آپ کو مجاہدہ میں ڈالتے اور پھر سے مقام فنا وبقا کو حاصل کرتے۔ان کے نزدیک مجاہدہ اس ذات باری تعالیٰ کے حضور فقط عبادت وریاضت کے مقابلے میں زیادہ درجہ رکھتا ہے۔چنانچہ اس صورت میں میری اوپر بیان کی گئی عبارت کی تصدیق ہوتی ہے کہ ''ایک مرید کامل کا مجاہدہ اپنے پیر کی ریاضت پر فوقیت رکھتا ہے''۔

حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ مکتوب نمبر ۱۰ میں رقم کرتے ہیں۔

''مراد کو بھی آخر الآمر مرید کے ارادہ سے مرید ہونا پڑتا ہے اور محبوب کو بھی محب کی محبت میں محب بننا پڑتا ہے۔دین ودنیا کے سردار (**محمد مصطفیٰ علیه من الصلوات اکملها و من التحیات افضلها**) مرادیت اور محبوبیت کے مقام کے باوجود مریدین اور محبین میں سے تھے۔اسی لئے آپ کے حال کی

یوں خبر آئی ہے۔''

''حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ غمگین اور متفکر رہتے تھے۔''

اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا خود ارشاد گرامی ہے۔

''کسی نبی کو اتنی اذیت نہیں پہنچائی گئی جتنی مجھے پہنچائی گئی ہے۔''

اور مجدد پاک رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک یہ ایک مرید کی صفات ہیں۔ چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اپنے پر ایک مرید کا لبادہ اوڑھے رکھا۔ مقام مرید کو مزید واضح کرنے کے لئے چند نکات غور طلب ہیں۔

❖ انسان تین طرح کے ہوتے ہیں۔

☆ ایک وہ ہوتے ہیں کہ جن کو ''وحدت'' سے ''کثرت'' کی جانب بھیج دیا جاتا ہے۔ یعنی وہ یکتائی سے لاتعدادیت کی طرف راغب ہو جاتے ہیں۔ یہ لوگ اپنی اپنی دنیا اور ماہیت کے اندھیرے میں گم ہوتے ہیں اور ان پر قہر الٰہی کی تجلی نازل ہوتی ہے اور ان کیلئے ہی یہ دعا کہی گئی ہے۔

''میں تیرے معمولی قہر سے بھی تیری بخشش کی پناہ چاہتا ہوں اور میں اپنے رب کی پناہ چاہتا ہوں شیطان مردود سے۔''

یہ تجلی موسم گرما کے ایک بادل کی مانند ہے کہ جو اچانک ہی غائب ہو جاتا ہے۔ یہ انسانی فطرت اور روش کے مطابق ایک طے شدہ زندگی کے لئے ہے کہ جو ایک سالک گزارتا ہے۔ یہیں پر انسانیت میں ایک طے شدہ ''فراموشی'' یا بھول جانے کی عادت بھی پیدا کر دی گئی ہے تا کہ اللہ کے بندے اس زمین پر اپنی اپنی طے شدہ اور منظور شدہ زندگیاں بسر کر سکیں اور اپنی اپنی اقوام میں رائج رسوم ورواج کا بغور مشاہدہ کر سکیں۔ لیکن اس کی ایک حد مقرر ہے کہ جہاں ان کی اس زمین پر محدودیت روح کا رنگ نہیں لیتی کیونکہ روح لامحدود ہے۔ لیکن یہ جائز ہے بعض اولیاء کرام اور انبیاء کرام کے معاملے میں۔

جیسا کہ حضرت ادریس کی محدودیت، روح کی لامحدودیت میں کھو گئی۔ اس ذات

باری تعالیٰ کی مطلقیت کل کی تجلی ایک لمحہ کے لئے نمودار ہوتی ہے اور دوسرے ہی لمحے غائب ہوجاتی ہے۔ اگر یہ مسلسل رہے تو تمام حدیں ختم ہوجاتی ہیں۔

حدیث میں ارشاد ہوتا ہے۔

''ہماری روح ہمارے جسم ہیں اور ہمارے جسم ہی ہماری روح ہیں۔''

☆ دوسری قسم ان پر مشتمل ہے کہ جو اپنی ذات کو اس ذات باری تعالیٰ کی مطلقیت کل کی تجلی میں کھو دیتے ہیں اور ہمیشہ کے لئے مقام محدود میں رہتے ہیں۔ ایسے لوگ حقیقی معنوں میں خالصتاً مجذوب کہلاتے ہیں۔

☆ تیسری قسم میں وہ ہیں کہ جو اس مقام سے واپس آجاتے ہیں وہ سالک کہلاتے ہیں۔ اپنی اس منزل سلوک میں یہ بعض اوقات آزاد خیال ہوجاتے ہیں اور اپنے مقام اور روح کو کھو دیتے ہیں اور پھر یہ چوپایہ کی طرح ہوجاتے ہیں اور اپنے مقام کو مزید کھو دیتے ہیں۔

جیسا کہ سورہ اعراف میں ارشاد ہوتا ہے۔

''وہ چوپایوں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بڑھ کر گمراہ۔'' (اعراف:179)

اور بعض اوقات ان میں سے کچھ سرفراز ہوتے ہیں اس سفر سے کہ جو مطلقیت باری تعالیٰ سے صفات کی جانب اور صفات سے افعال کی جانب ہے اور اس طرح سے اپنے سفر کا گھیراؤ مکمل کر لیتے ہیں۔

سلوک جس سفر پر مشتمل ہے ان میں ''الی اللہ''، یعنی اللہ کی جانب ''باللہ''، یعنی اللہ سے وابستگی، ''فی اللہ''، یعنی اللہ کی ذات میں اور ''مع اللہ''، یعنی اللہ کے ساتھ شامل ہیں۔ یہ سفر دوسروں کو راہ راست کی جانب دعوت دینے کے لئے ہے۔

اس سفر کے متعلق حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ اپنی مکتوب نمبر ۱۴۴ میں حافظ محمد لاہوری کو لکھتے ہیں کہ سیر و سلوک علم میں حرکت سے عبارت ہے۔ جو مقولہ کیف (کیف دراصل اس عرض کا نام ہے جس کا تصور و تعقل غیر کے تصور و تعقل پر موقوف ہے) میں سے ہے۔ حرکت اینی (یعنی انتقال مکانی) کی یہاں گنجائش نہیں۔ پس سیر ''الی اللہ'' حرکت

علمیہ سے عبارت ہے۔ جو علم اسفل سے علم اعلیٰ کی طرف ہوتی ہے اور اس سے اوپر پھر اور اوپر یہاں تک کہ بندہ تمام ممکنات کے علوم طے کرنے اور ان میں مکمل طور پر فنا ہو جانے کے بعد علم واجب تک جا پہنچتا ہے اور اس حالت کو فنا سے تعبیر کرتے ہیں۔

سیر ''فی اللہ'' اس حرکت علمیہ سے عبارت ہے جو مراتب وجوب یعنی اسماء صفات شیون، اعتبارات، تقدسیات اور تنزیہات ہی ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ اس مرتبہ تک جا پہنچتی ہے جسے کسی عبارت سے بیان کرنا ناممکن ہے اور نہ اس کی طرف اشارہ ہوسکتا ہے اور نہ اسے کسی نام سے موسوم کیا جاسکتا ہے اور نہ اسے کوئی عالم جان سکتا ہے اور نہ کوئی ادراک کرنے والا اس کا ادراک کرسکتا ہے۔ اس سیر کے لئے بقا ہے۔

سیر عن اللہ ''باللہ'' بھی جو تیسری سیر ہے حرکت علمی سے عبارت ہے جو علم اعلیٰ سے علم اسفل تک ہوتی ہے اور اس سے اور نیچے پھر اور نیچے یہاں تک کہ عارف پیچھے کی طرف چل کر پھر ممکنات تک آ پہنچتا ہے اور تمام مراتب وجوب کے علوم سے نیچے اتر آتا ہے۔ یہ وہ عارف ہے جو اللہ سے وابستگی کے باعث سب کچھ طاق نسیان میں رکھ دیتا ہے اور اللہ سے اللہ کے ساتھ رجوع کرتا ہے۔ یہی واجد (پانے والا) سے فاقد (نہ پانے والا) ہوتا ہے اور یہی واصل اور ہجر میں مبتلا عارف ہے اور یہی قریب اور بعید عارف ہے۔

چوتھی سیر جو اشیاء میں سیر ہے وہ ''مع اللہ'' ہے۔ یہ بھی سیر اول میں اشیاء کے علوم کے زوال کے بعد آہستہ آہستہ اشیاء کے علوم کے حصول سے عبارت ہے۔ تو جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ چوتھی سیر اول کے مقابل ہے اور تیسری سیر دوسری کے مقابل ہے۔ سیر ''الی اللہ'' اور سیر ''فی اللہ'' نفس ولایت کے حاصل کرنے کے لئے ہوتی ہے اور نفس ولایت فنا اور بقا سے عبارت ہے۔ اور تیسری اور چوتھی سیر مقام دعوت کے حصول کے لئے ہے جو انبیاء کرام، رسل عظام کے ساتھ مخصوص ہے۔ اللہ تعالیٰ کی رحمتیں اور تسلیمات ان سب پر عموماً اور ان سب سے افضل پر خصوصاً ہوتی رہیں۔

ایک مجذوب اپنی جذب کی کیفیت سے اس لئے واپس آتا ہے تاکہ دوسروں کو اس راہ

کی جانب رغبت دلا سکے۔ جذب کی حالت میں وہ آدھے دن کے سورج کی مانند ہوتا ہے کہ جو کوئی سایہ پیدا نہیں کرتا۔ جب وہ اپنے جذب کی کیفیت سے واپس آتا ہے تو ایک ڈوبتے ہوئے سورج کی مانند ہوتا ہے کہ جو اپنا تمام سفر مکمل کر چکا ہوتا ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

''اور آج کے دن میں نے تمہارے لئے دین مکمل کر دیا اور تم پر اپنی نعمتیں تمام کر دیں۔'' (مائدہ:3)

مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ کی اس کیفیت کو اس طرح بیان کرتے ہیں کہ۔

''خدا عاشقوں کی غذا ہے۔''

فرماتے ہیں۔

''فنافی اللہ عاشق الٰہی کا حال مچھلی کا سا ہے۔ مچھلی دریا میں رہتی ہے اس کی روٹی، کپڑا، رہائش، دوادارو، خورو خواب بس پانی ہی ہے۔ اس کی زندگی کا ہر شعبہ اور ہر ضرورت پانی ہی سے وابستہ ہے جس سے ایک لمحہ جدائی بھی اس کی موت ہے یا اس کو دودھ پینے والا بچہ سمجھ لو۔ وہ پستان مادر اور شیر مادر کے سوا کچھ نہیں جانتا۔ وہ کسی خوراک کا طالب نہیں ہوتا اس لئے کہ شیر مادر میں اس کے جسم کی نشو و نما کے لئے تمام عناصر موجود ہیں۔ اس نے کسی تدبیر سے سوچ سمجھ کر یہ شیر خواری اختیار نہیں کی۔ یہ اس کی فطرت کا تقاضا ہے۔ عاشقان الٰہی بھی خدا سے لپٹ کر اس سے سامان حیات حاصل کرتے ہیں یہ ذوق ان کی فطرت کا تقاضا بن جاتا ہے۔''

مزید یہ کہ شیخ کی صحبت میں معتد بہ مدت رہنا چاہئے یعنی شیخ کے پاس سے جلدی نہ بھاگنا چاہئے۔ کیونکہ ایک رنگ ساز سے ایک شخص نے کہا کہ میری چادر رنگ دو۔ تو اس نے کہا کہ رنگنے میں بہتر گھنٹے چاہئیں اس نے کہا کہ نہیں ہماری تو کل شام کی ریل ہے تم ہمیں کل دے دو۔ رنگ ساز نے کہا کہ کل میں دے تو دوں گا لیکن ضمانت نہیں دے سکتا کہ رنگ پکا رہے گا۔ اسی طرح جو لوگ قبل از وقت شیخ کی صحبت سے بھاگ جاتے ہیں۔ ان کا

رنگ بھی کچا رہتا ہے۔اور ارد گرد کے ماحول سے متاثر ہو جاتے ہیں اگر نسبت مع اللہ پختہ ہو جائے تو وہ لوگ ماحول کو بدل سکتے ہیں۔

ایک پیر جو اپنے سفر کو مکمل کر لیتا ہے وہ اس کو اپنے ہر مرید کے ساتھ ایک بار پھر سے دہراتا ہے۔اس کی مثال اس طرح ہی ہے کہ جس طرح ایک بیج سے درخت پھوٹتا ہے اور پھر اس درخت سے بیج پھوٹتا ہے اور یہ عمل اپنے آپ کو بار بار دہراتا ہے۔یا یوں کہہ لیجئے کہ ایک نقطہ سے کسی دائرہ کا آغاز ہوتا ہے اور اختتام بھی اسی نقطہ پر ہوتا ہے۔اس سے مراد اپنی حقیقت کو چھوڑ نا نہیں بلکہ یہ ''تجلی'' کا ظہور ہے۔جلال الدین رومی رحمۃ اللہ علیہ بھی اسی سے مراد لیتے ہیں جب وہ کہتے ہیں کہ ''سات سو ستر جسم میں بنے دیکھے ہیں''یعنی جس تجلی سے میں سرفراز ہوا تھا اس تجلی سے میرے سات سو ستر جسم یا مرید فیض یاب ہوئے ہیں۔ یہاں پر ہم نے جسم سے مراد مرید لیا ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک کامل پیر کا کامل مرید اپنے پیر کے جسم کی مانند ہو جاتا ہے کیونکہ وہ اپنے آپ کو اپنے پیر کی صحبت میں ڈھال لیتا ہے۔پہلے پیر خود منازل سلوک طے کرتا ہے اور پھر وہ ان کو اپنے ہر مرید کے ساتھ طے کرتا ہے اور اس طرح وہ پہلے سے زیادہ اور زیادہ کامل ہو جاتا ہے۔ایک مرید کی کاملیت کا تذکرہ کرتے ہوئے حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ اپنے ایک مرید سے فرماتے ہیں۔

''کامل مرید وہ ہے جس کا دل ابراہیم علیہ السلام کی طرح دنیا کی دوستی سے پاک ہو اور حق تعالیٰ کا فرمان بجالانے والا ہو اور اس کی تسلیم حضرت اسماعیل علیہ السلام کی طرح ہو اور اس کا اندوہ وغم حضرت داؤد علیہ السلام کی طرح ہو اور اس کا صبر حضرت ایوب علیہ السلام کی مانند ہو اور اس کا ذوق وشوق موسیٰ علیہ السلام کی طرح ہو۔''

جبکہ ایک اور بزرگ فرماتے ہیں کہ مرید صادق وہ ہے کہ بیس سال تک برائیاں لکھنے والا فرشتہ اس سے کوئی برائی صادر نہ دیکھے کہ جسے وہ لکھے۔اس تمام حقیقت کو گلشن راز بیان کرتا ہے جس کا ترجمہ درج ذیل ہے۔

''نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا نور ایک عظیم سورج تھا۔اب یہ موسیٰ علیہ السلام میں ظاہر ہوا، اب آدم علیہ السلام میں۔ مالک وآقا کا وقت خط استوا پر تھا۔ جو تمام رنگوں کی تیزی شوخیوں سے پاک ہے۔''

یہی وجہ ہے کہ گلشن راز ایک دوسرے مقام پر بیان کرتا ہے۔

''صوفی اس وقت تک ملاوٹ سے پاک نہیں ہوتا جب تک کہ وہ پورا پیالہ نہ پی لے۔اور بہت زیادہ ضرورت ہے ایک کچے اور خام کو پکنے کے لئے۔''

ایک پیر اپنے مرید کے قلب کی شکل اختیار کر لیتا ہے اور اپنے فیوض و برکات کو اس میں منتقل کر دیتا ہے اور ایک پیر کی روح اپنے مرید کی روح پر بڑا اثر رکھتی ہے اور یہ اس طرح ہے کہ جس طرح آپ ایک دیئے سے دیا جلا سکتے ہیں۔اس ضمن میں پہلا دیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی روشنی کا ہے کہ جو اللہ کے نور سے منور ہوا۔

سورۂ نور میں ارشاد ہوتا ہے۔

''اللہ نور ہے آسمانوں اور زمینوں کا اس کے نور کی مثال ایسی ہے جیسے کہ ایک طاق کہ اس میں چراغ ہے اور وہ چراغ ایک فانوس میں ہے۔''(نور:35)

یعنی قلب جو کہ جسم کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا ہے اس کا چراغ ایمان کی روشنی سے منور ہے۔ جمع کا صیغہ چراغ پر تو لا گو آ سکتا ہے لیکن روشنی پر نہیں۔اس لئے جب یہ نور قلب سے قلب میں منتقل ہوتا ہے تو اپنی اصل حقیقت اور تقدس میں کم نہیں ہوتا۔رسالت کا آغاز آدم علیہ السلام سے ہوا اور یہ خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم پر آ کر کامل ہوگئی یا ختم ہوگئی۔یعنی حقیقت ہادی صلی اللہ علیہ وسلم تمام انبیاء کا گھیراؤ کرتی ہے اور خاتم کے مقام پر آ کر اپنے آپ کو کامل کرتی ہے۔البتہ ولایت اس دنیا میں رہی اور اس نے اپنے سفر کا دوسرا مرحلہ شروع کیا۔

ہم جو اوپر یہ بحث کرتے آ رہے ہیں کہ مرشد کامل کی تجلی یا نور سے مرید کا قلب روشن ہوتا ہے اور یہ سلسلہ اس طرح چلتا ہے۔تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ نور کون سا ہے؟ کیونکہ جو نور آدم علیہ السلام سے چلا تھا تو وہ خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم پر آ کر کامل ہو گیا اور اب

کوئی نبی نہیں آنا۔ تو اس سلسلے میں عرض ہے کہ اس نور کے دوسرے ٹکڑے کی حقیت شاہ ولائت کے قلمدان سے ہے یعنی کہ حضرت علی المرتضٰی علیہ السلام۔

جیسا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے۔

''میں اور علی علیہ السلام ایک ہی نور کے دو ٹکڑے ہیں۔''

نور کا ٹکڑا اس لئے کہا گیا ہے کہ نور کی قسمیں تو ہوتی نہیں۔ جیسا کہ میں پہلے بیان کر کے آیا ہوں کہ وہ تو ایک ہی قسم کا حامل ہے اور اس کی اصل ایک ہی رہتی ہے۔ تو جب نور خدا کے ایک حصہ نے رسالت کا کام سرانجام دیا تو دوسرا حصہ ولایت کی حقیقت کو مقام خاتم تک لے کر جانے کی جستجو میں ہے اور بے شک یہ نور اپنے ''ایک خاتم'' (امام مہدی علیہ السلام) پر اس وقت پہنچے گا جب آخرت نزدیک ہوگی۔

اس مقام پر بھی ابن تیمیہ اپنے اعتراضات کی پوٹلی کھولے بغیر نہ رہ سکے اور کہتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو نور تسلیم کرنے کی روایت تو خلفائے راشدین کے بعد کے فسادات اور شخصیت پرستی کی پیداوار ہے اور امام موصوف کا یہ نظریہ بھی فقط وحدت الوجود اور حلول کی ضد کے طور پر سامنے آیا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ امام موصوف اور ان کے پیروکاروں کو ''پرستی'' کے معنی بھی معلوم نہیں ہیں۔ ورنہ وہ ان بزرگان کے احترام کو ''شخصیت پرستی'' سے تعبیر نہ کرتے۔ بلکہ پہلے اپنے گھر کی خبر لیتے کہ جہاں اپنے ملاؤں کو نہ تو پکارنے کو شرک سمجھتے ہیں، نہ ہی یہ سوچتے ہیں کہ ملا جی مر چکے ہیں اور ان کی قبر بھی سینکڑوں میل دور ہے۔ یعنی مردہ بھی ہیں اور غائب بھی بلکہ وہاں تو ان کے اپنے علامہ نواب صدیق حسن بھوپالی جیسے یوں بلبلا کر مدد کے لئے پکارتے ہیں

قبلہ دیں مددے کعبہ ایماں مددے
ابن قیم مددے قاضی شوکاں مددے

(دیکھئے ''ہدیۃ المہدی'' از علامہ وحید الزماں حیدر آبادی)

دوسری جانب اسی گروہ کے ایک اور علامہ وحید الزمان حیدر آبادی جنہوں نے صحیح مسلم

کا ترجمہ ''المعلم'' لکھا، موطاء کا ترجمہ اور اس کے ساتھ ''کشف المغطا'' کے نام سے موطاء کی شرح تحریر کی۔ اپنی کتاب ''ہدایۃ المہدی'' میں تسلیم کرتے ہیں۔

(ترجمہ) اللہ سبحانہ نے ابتدائے خلق نور محمدی صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمائی۔

(ص ۵٦ مطبوعہ دہلی)

علاوہ ازیں علامہ اشرف علی تھانوی نے بھی اپنی تصنیف ''نشر الطیب فی ذکر النبی الحبیب صلی اللہ علیہ وسلم'' میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بالکل واضح طور پر نور تسلیم کیا ہے اور انہی کے ہم مسلک امداد اللہ مہاجر مکی بھی ''نالہ امداد غریب'' میں یہ تحریر فرما گئے۔

''سب دیکھو! نور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا۔''

نہ صرف نور محمدی کا اعتراف کرتے ہیں بلکہ اشرف علی تھانوی صاحب کو مخاطب کرتے ہوئے یہ بھی فرماتے ہیں کہ

''میاں اشرف علی! جب میں تم لوگوں سے باتیں کرتا ہوں تو یہ نہ سوچا کرو کہ میں تم لوگوں کے پاس بیٹھا ہوں۔ میری روح اس وقت بھی اللہ کے پاس ہوتی ہے۔''

بہر کیف فقط اتنے پر اکتفاء کرتے ہوئے اپنے اصل موضوع کی جانب آتے ہیں کہ سالک ایک خاص ''شان'' (قابلیت، اہلیت، رتبہ) کو ظاہر کرتا ہے اور وہ اپنی اس شان میں محدود رہتا ہے۔ تمام ''شانیں'' اپنے اپنے دائرہ میں محدود رہتی ہیں اور کسی دوسری شان میں داخل نہیں ہوسکتیں۔ جب سالک فنا کو پالیتا ہے تو شان بھی غائب ہو جاتی ہے اور سالک، مطلق کا مقام حاصل کر لیتا ہے اور بقا پالیتا ہے۔ اس حالت میں اس کی استعداد بڑھ جاتی ہے اور وہ ذات مطلق کو پہچان لیتا ہے۔ یعنی کہ لامحدود دانش اور ادراک کو اپنی دانش وادراک کے آئینہ میں پہچان لیتا ہے۔

جیسا کہ مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

''سب سے پہلے سالک نے ایک محدود شان یا اسم سے بلندی کی طرف پرواز کی جو کہ غیر تھی لیکن اب وہ ایک لامحدود ذات سے آغاز کرتا ہے اور جو محدود ہے وہ

لامحدود میں بدل جاتا ہے۔''

حضرت غوث الاعظم رضی اللہ عنہ اس کو اس طرح سے بیان فرماتے ہیں۔

''اول جہل ہوتا ہے، پھر علم، پھر اس پر عمل، پھر عمل میں اخلاص اور پھر عمل قلبی۔''

لیکن پھر ایک مقام پر اس طرح بھی تو ہوتا ہے ''کل شئی ھالک الاّ وجھه'' اس سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر خدا کے سوا ہر شے فانی ہے تو انسان کو بقا کہاں سے حاصل ہو سکتی ہے؟ لیکن قرآن نیکوں کے لئے بقا اور خلود کا بھی وعدہ کرتا ہے۔

جیسا کہ حدیث میں ارشاد ہوتا ہے۔

لایستفی ارضی ولاسمائی ولکن یستفی قلب عبد المومن المتقی

''آسمان اور زمین مجھے نہیں پا سکتے لیکن ایک سچے مومن کا دل مجھے پالیتا ہے۔''

اگر اس کی تشریح کی جائے تو یہی معلوم ہوگا۔ چونکہ وہ ذات باقی رہنے والی ہے اس لئے ایک سچے مومن کا دل اس دنیا کی حقیقت سے دور ہو کر اس کی مطلقیت پا کر بقاء حاصل کر لیتا ہے۔ اور چونکہ آسمان اور زمین یہ اس دنیا کی حقیقتیں ہیں اس لئے یہ فانی ہیں۔

ایک حدیث شریف میں آتا ہے۔

''موت کو قیامت کے روز ذبح کر دیا جائے گا۔''

یعنی موت بھی ایک دنیاوی حقیقت ہے اس لئے وہ بھی فانی ہے۔

جیسا کہ نقل ہے کہ ایک مرتبہ حضرت امام حسین علیہ السلام سے کسی نے سوال کیا کہ اس دنیا میں سب سے مضبوط شے کون سی ہے؟ انہوں نے فرمایا کہ پتھر۔ سائل نے کہا کہ پتھر پر بھی کوئی چیز بھاری ہے؟ فرمایا! لوہا۔ کیونکہ لوہا پتھر کو کاٹ سکتا ہے۔ پھر سوال کیا کہ لوہے پر بھی کوئی چیز بھاری ہے؟ آپ نے فرمایا کہ آگ ہے کیونکہ آگ لوہے کو پگھلا دیتی ہے۔ پھر دریافت کیا کہ آگ پر بھی کوئی شے حاوی ہے؟ جواب ملا پانی ہے کیونکہ پانی آگ کو بجھا دیتا ہے۔ کہا پانی پر کیا چیز حاوی ہے؟ فرمایا! ہوا ہے۔ کیونکہ ہوا پانی سے بھرپور بادلوں کو

اڑاتی پھرتی ہے۔ پھر پوچھا گیا کہ ہوا پر بھی کوئی چیز حاوی ہے؟ فرمایا! ملک الھوا۔ دریافت کیا کہ ان پر کون حاوی ہے؟ ملک الموت۔ کہ وہ ملک الھوا کو بھی موت دے گا۔ پوچھا پھر ملک الموت پر کون حاوی ہے؟ فرمایا! موت۔ کیونکہ ملک الموت کو بھی موت آنی ہے۔ پھر سوال کیا کہ موت پر کون حاوی ہے؟ تو آپ نے فرمایا! امر ربی۔

جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

''یہ روح تو میرے رب کا امر ہے۔'' (اسراء:85)

اس طرح اوپر کیئے گئے سوال کا جواب واضح ہوتا ہے کہ صفات الٰہی سے باہر رہ کر کوئی چیز باقی نہیں رہ سکتی۔ لیکن مقصود حیات اپنی انفرادی خواہشوں کو فنا کر کے اس کلیت میں ضم ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ جناب علی علیہ السلام کو'' وجہہ اللہ'' کہا گیا ہے۔ فنا کا راستہ اول قدم میں فنا کا راستہ ہے۔ لیکن فنا میں بقا عقل استدلالی کی سمجھ میں نہیں آسکتی۔ ہماری ہستیوں کے جو آنی جانی پہلو ہیں اور جو بے اصل خواہشیں ہیں وہ نور مطلق کے مقابلے میں سائے کی طرح ہیں۔ ظہور نور کے بعد سایہ کہاں رہے گا؟ انسان نور میں داخل ہوسکتا ہے اور اس خلوت گاہ حق میں بقاء ہے۔

مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ اس ضمن میں فرماتے ہیں!

ہمچنیں جو یائے درگاہ خدا
چوں خدا آیہ شود جو پندہ لا
گرچہ آں وصلت بقا اندر بقا ست
لیک از اول بقا اندر فنا ست
سایہ ہائے کہ بود جو یائے نور
نیست گرد دچوں کند نورش ظہور
عقل کے ماند چو باشد سردہ او
کل شئی ھالک الا وجہ

ہالک آمد پیش وجہش ہست و نیست
ہستی اندر نیستی خود طرفہ ایست
اندریں محض خرد ھاشدز است
چوں قلم ایں جا رسیدہ سر شکست

اور مقام بقا میں انسانی ہستی کے فانی پہلو اس طرح ناپید ہو جائیں گے جس طرح تیز ہوا چلنے کے بعد مچھر غائب ہو جاتے ہیں۔ پہلے صوفی ایک قطرہ تھا اور اب سمندر بن چکا ہے۔ اپنے آپ کی نفی کرنا دراصل اپنی استعداد کو بڑھانا اور پھیلانا ہے۔ ایک قطرہ کی وسعت نے سمندر کی وسعت کو پالیا ہے۔ اگر آپ ایک قطرہ کے دل کو چیر کر دیکھیں تو آپ کو اس میں ایک سو سمندر ملیں گے۔ قطرہ اپنی ذات میں مٹ جاتا ہے اور ہمیشہ کے لئے ایک سمندر ہو جاتا ہے۔

بایزید رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

''اگر عرش اپنی چاروں اطراف کے ساتھ میرے دل کے ایک کونے میں آ جائے تو میں اس کو محسوس نہیں کروں گا۔''

❖ جب تک شریعت اور طریقت پر صحیح معنوں میں عبور نہ حاصل کیا جائے تو اس وقت تک ''حقیقت'' کو صحیح معنوں میں نہیں پایا جا سکتا۔ یہ اسی طرح ہے کہ اگر قلم صحیح انداز میں تراشا نہیں گیا ہوگا تو الفاظ بھی صاف نمودار نہیں ہوں گے۔

❖ جستجوءِ حق میں مسافر چار قسم کے ہوتے ہیں!

☆ وہ کہ جو حق کو دیکھتے ہیں اور تخلیق کو نہیں۔

☆ وہ جو تخلیق کو دلیل میں دیکھتے ہیں اور حق کو باطن میں۔ ان کو ''ذاویل عقل'' یا دلیل کا انسان کہتے ہیں۔ ان کے نزدیک تخلیق کے آئینہ میں حق نظر آتا ہے۔

☆ ایسے بھی انسان ہیں جو حق کو دلیل اور تخلیق کو باطن میں دیکھتے ہیں۔ ان کو ''زاویل عین'' دید کا انسان کہتے ہیں۔ ان کے نزدیک اللہ کے آئینہ میں تخلیق نظر آتی ہے۔

☆ اور ایسے بھی انسان ہیں کہ جو اللہ کو تخلیق کے آئینہ میں اور تخلیق کو اللہ کے آئینہ میں ایک ساتھ دیکھتے ہیں۔ بغیر کسی پردہ کے جو ان کے درمیان حائل ہو۔ ان کو ''زاویل عین وعقل'' کہا جاتا ہے۔ اس سے مراد وحدت اور کثرت کا ایک ساتھ مشاہدہ کرنا ہے۔

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

''خالص توحید سے مراد اللہ کا مشاہدہ تمام اشیاء میں کرنا ہے۔''

وہ اللہ کے جمال کو تمام چیزوں میں دیکھتا ہے اور اس جمال سے قریب ترین حقیقت دراصل حقیقت محمدی صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہے جو کہ تمام موجودہ چیزوں میں پائی جاتی ہے۔ (یادرہے کہ ہم پہلے یہ بیان کر چکے ہیں کہ اللہ کی ایک جمالی تصویر ہے اور ایک جلالی۔ جو جلالی تصویر ہے اس کی حقیقت اس نے اپنے پاس ہی رکھی ہے۔ لیکن جمالی تصویر کو اپنی مخلوق پر حقیقت محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کی صورت ظاہر کیا) کیونکہ ہر شے اس حقیقت پر انحصار کرتی ہے اور اس کو ظاہر کرتی ہے اور ہر شے کو اس حقیقت کی جانب واپس لوٹنا ہے۔ اس کی خوبصورتی ہر چیز میں نمایاں ہے اور اس کی تخلیق کے تمام آئینے ایک ہی حقیقت (نور) کا عکس پیدا کرتے ہیں۔

مندرجہ بالا بیان شدہ اقسام میں جو آخری قسم ہے وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو ہی اپنا مرکز تصور کرتی ہے۔ کیونکہ ان کے نزدیک یہ ذات الٰہی کو پانے کی آخری حد ہے۔

❖ اپنے شکوک وشبہات کا ازالہ کرنا دراصل ایک ''عارف'' کی صحبت میں بیٹھنے کے مترادف ہے۔ ایک مرید کو چاہئے کہ وہ اپنے پیر کی صحبت میں اپنے تمام شکوک وشبہات کا ازالہ کرے۔ کیونکہ......

''سایہ غائب ہو جاتا ہے جب سورج سر کے اوپر پہنچتا ہے۔''

سورۂ بنی اسرائیل میں ارشاد ہوتا ہے۔

''حق آ گیا اور باطل مٹ گیا۔'' (اسراء:81)

ایک پیر کی تعلیمات اپنے مرید کے لئے اس طرح ہیں کہ جس طرح ایک فلسفی لوہے پر

ضرب کاری کرے (یہاں پر ایک شیخ کامل کے علم کی گہرائی مراد ہے)۔

حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ ایک شیخ کامل اور ایک عالم کے علم کی وضاحت اس انداز میں فرماتے ہیں۔

''سچا مرید علماء کے علم سے بے پرواہ ہے کیونکہ عالموں کا علم دو کلمات پر منحصر ہے۔ ایک تصحیح ملت دوسرا تجدید خدمت۔ جبکہ ایک شیخ اپنے مرید کو جو علم عطا کرتا ہے وہ علم، یقین تک اور یقین، خوف تک اور خوف، عمل تک اور عمل، ورع تک اور ورع، اخلاص تک اور اخلاص، مشاہدہ الٰہی تک پہنچاتا ہے۔ اور اگر وہ نہیں پہنچاتا تو اس کے لئے ہلاکت ہے۔''

مرید کی دانش، فہم و فراست اور ادراک صرف سیکھنے اور سوچنے پر مشتمل نہیں ہوتی بلکہ وہ اس سے زیادہ ہوتی ہے۔ یعنی کہ جو ان تمام چیزوں سے حاصل نہیں ہو سکتی۔ اور وہ حاصل ہوتی ہے کشف کے ذریعے جس کو ''حال'' کہتے ہیں۔ جب ''حال'' کی کیفیت شروع ہوتی ہے تو اس کو ''مقام'' کہا جاتا ہے۔ جو ایک دفعہ ''حال'' کی کیفیت سے گزرتا ہے تو یہ اس کا آغاز ہوتا ہے اور وہ ''ولی'' کہلاتا ہے اور جو اس کو شروع ہی رکھتا ہے وہ ''قطب'' اور ''غوث'' کے مقام کو پالیتا ہے۔ یہ اس طرح ہے کہ جب شراب کی تقسیم کے لئے اعلان کیا جائے تو ایک یا دو جام پینے کے لئے کافی ہیں۔ اور اس سے کبھی بھی لازوال ''وصال'' یعنی نشہ کی توقع نہ رکھنی چاہئے۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ایک دو جام کا نشہ ہمیشہ کے لئے نہیں رہتا۔ جو جتنا پیتا ہے اس کا نشہ بھی اس کے مطابق ہوتا ہے۔ مقام ولی اور مقام قطب کا انحصار بھی اس عرصہ کی مدت و معیاد پر ہے۔ کچھ لوگوں پر یہ ''حال'' کی کیفیت ایک لمحے کے لئے ہوتی ہے اور کچھ کے لئے یہ لمبے عرصے کے لئے ہوتی ہے۔ ان کے درجہ، رتبہ اور فضیلت کے مطابق اور بعض کے لئے یہ ہمیشہ کے لئے ہوتی ہے۔

سورۃ معارج میں ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

''ملائکہ اور نیک ارواح اس کی بارگاہ کی جانب عروج کرتے ہیں''۔ (معارج:4)

معراج اور شب قدر انہی لمحوں کے عکاس ہیں۔ مختلف لوگوں کے لئے ''ہال'' اور ''وصال'' کی کیفیات مختلف ہیں۔

☆ ایک ''عابد'' کا ہال ایسا ہے کہ وہ اپنے آپ کو ایک ایسے مادہ کی طرح محسوس کرتا ہے جو تمام حرکات وسکنات سے عاری ہو۔

☆ ایک ''عاشق'' اس کے ذریعے حق کی خوبصورتی کا مختلف اشیاء میں مشاہدہ کرتا ہے۔

☆ اور ایک ''متعلق'' اس کے ذریعے اپنی صفات کو حق میں بدلتا ہے اور ''قرب فرائض'' اور ''قرب نوافل'' کے مقام حاصل کرتا ہے۔ عاشق کچھ فاصلے پر رہ کر ہی اپنے محبوب کی خوبصورتی اور جمال کا مشاہدہ کرتا ہے۔ لیکن پھر بھی اپنے آپ کو اپنے محبوب اور اس کی خاصیتوں اور صفات جیسا نہیں پاتا۔ لیکن دوسروں کو اس صفات میں ڈھلا ہوا پاتا ہے اس کو اپنے محبوب کا مشاہدہ کر کے تسکین حاصل ہوتی ہے۔ ایک عاشق کی اس کیفیت کے برعکس ایک ''عابد'' کوئی تسکین اور مزہ نہیں پاتا۔ اس کے باوجود کہ وہ اس مشاہدہ کی شراب کے ایک قطرہ کے ذائقہ کو بھی محسوس کرتا ہے۔

ارشاد ہوتا ہے۔

''ملائکہ کو اتارتا ہے ایمان کی جان دے کر اپنے بندوں پر جسے چاہے۔''

(النحل:2)

☆ ایک ''مواحد'' اس ذات پاک میں فانی ہے اور اپنی ذات کو اس ذات مطلق میں بدلتا ہوا پاتا ہے۔

☆ ایک ''محقق'' وہ ہوتا ہے جو ذات سے صفات کی جانب آتا ہے۔ جیسا کہ انبیاء علیہ السلام اور اولیاء کے سلسلے میں ہوتا ہے۔ ان تمام بیان کی گئی حالتوں کا ایک اپنا اپنا مقرر عرصہ ہوتا ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ یہاں پر کسی ''ہال'' کی ضرورت نہیں ہے۔ صرف سچا عقیدہ اور ایمان ہی کافی ہے۔ مومن ''غائب'' (یعنی ان دیکھے) پر ایمان رکھتا ہے۔

سورۂ بقرہ میں آتا ہے۔

''وہ ایمان لائے ان دیکھے پر۔'' (بقرہ:3)

ایک عارف ان دیکھے میں جھانکنے کی کوشش کرتا ہے۔ عارف کا کام خود بینی بھی ہے نہ کہ فقط علم اور ایمان۔ ایمان جن چیزوں پر مشتمل ہے ان میں سماعت و بصارت پر بھروسہ اور اپنے آپ پر یقین محکم شامل ہیں۔ مثال کے طور پر ایک پیاسا پانی کا نام سنتا ہے تو یہ اس میں پانی کے بارے میں ایمان پیدا کرتا ہے، جب وہ پانی کو دیکھتا ہے تو یہ اس میں بھروسہ پیدا کرتا ہے اور جب وہ اسے چکھتا ہے تو یہ اس میں یقین کو پیدا کرتا ہے۔ (آپ نے یہاں ملاحظہ کیا کہ ایمان پہلے ہے اور یقین کی منزل بعد میں۔ جیسا کہ میں پہلے بیان کر چکا ہوں) اگر ہم صرف سماعت پر کچھ دیر کے لئے رک جائیں تو یہ اس کو اس جستجو سے روکنا ہے کہ جو وہ دیکھنے اور چکھنے کے لئے کرنا چاہتا ہے۔ چنانچہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ عارف وہ ہے جو عین الیقین کو علم الیقین کے ساتھ جمع کرتا ہے اور ایک عارف کا مقام عاشق سے بالا ہوتا ہے۔ کیونکہ عاشق صرف جمال الٰہی کو اشیاء کی حقیقت میں دیکھ کر یقین لاتا ہے۔ لیکن ایک عارف اپنے علم کے ذریعے جمال الٰہی تک پہنچتا ہے اور یقین حاصل کرتا ہے۔ اس لئے وہ اپنے آپ کو ایک جستجو میں ڈال کر اپنی منزل کو حاصل کرتا ہے۔

جیسا کہ حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ مکتوب نمبر ۱۲۶ میں مرزا احسام الدین احمد کو ایک روایت بیان کرتے ہیں۔

> ''منقول ہے کہ ایک دن حسن بصری رضی اللہ عنہ دریا کے کنارے پر کھڑے ہوئے کشتی کا انتظار کر رہے تھے کہ دریا سے پار ہوں۔ اسی اثناء میں خواجہ حبیب عجمی رحمۃ اللہ علیہ بھی آ نکلے۔ پوچھا! آپ کیوں کھڑے ہیں؟ عرض کیا کہ کشتی کا انتظار کر رہا ہوں۔ حبیب عجمی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ کشتی کی کیا حاجت ہے، کیا آپ یقین نہیں رکھتے؟ حضرت حسن بصری رضی اللہ عنہ نے کہا کہ آپ علم نہیں رکھتے۔ غرض کہ خواجہ عجمی رحمۃ اللہ علیہ کشتی کی مدد کے بغیر دریا سے گزر گئے اور حسن بصری رضی اللہ عنہ کشتی کے انتظار میں کھڑے رہے۔''

چنانچہ حضرت مجدد پاک رحمۃ اللہ علیہ اس واقعہ سے نتیجہ نکالتے ہوئے بیان کرتے ہیں کہ حسن بصری رضی اللہ عنہ نے چونکہ عالم اسباب میں نزول کیا ہوا تھا اس لئے اس کے ساتھ اسباب کے وسیلہ سے معاملہ کرتے تھے۔ (یعنی مقام عارف حاصل تھا) اور حبیب عجمی رحمۃ اللہ علیہ نے چونکہ پورے طور پر اسباب کو نظر سے دور کر دیا ہوا تھا اس کے ساتھ اسباب کے وسیلہ کے بغیر زندگی گزارتے تھے۔ (یعنی مقام عاشق پر تھے) لیکن فضیلت حضرت حسن بصری رضی اللہ عنہ کے لئے ہے جو صاحب علم ہے اور جنہوں نے عین الیقین کو علم الیقین کے ساتھ جمع کیا ہے اور اشیاء کو جیسی کہ وہ ہیں جانا ہے۔ کیونکہ قدرت کی اصل حقیقت کو حکمت کے پیچھے پوشیدہ کیا ہے۔ اور حبیب عجمی رحمۃ اللہ علیہ سکر میں اور فاعل حقیقی پر یقین رکھتے ہیں۔ بغیر اس بات کے کہ اسباب کے درمیان میں دخل ہو۔

اس ضمن میں دوسری جانب حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ اپنے ایک اور مکتوب نمبر ۲۹۰ میں ملا ہاشم کو لکھتے ہیں۔

"حضرت علی علیہ السلام کے سلوک میں معارف (مقام عارف) حاصل ہوتے ہیں اور حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے سلوک میں محبت کا غلبہ ہوتا ہے (یعنی مقام عاشق)۔"

کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں

اب جبکہ ہم پیر و مرید سے متعلق چند اہم خصوصیات کا مطالعہ کر چکے ہیں تو میں آپ کی توجہ ایک ایسی روش کی جانب مبذول کروانا چاہوں گا کہ جو آج کل کے مرید حضرات میں بہت نمایاں اور کثرت سے نظر آتی ہے اور یہ ایسی روش ہے کہ ان کے اچھے بھلے نفع کو نقصان کا درجہ دے دیتی ہے۔ اس روش کی بنیاد اس مادی نفس پر ہوتی ہے کہ جس کو آج کل کا مرید اپنے پیر کی صحبت میں گھٹانے کی بجائے بڑھانے کی نیت سے آتا ہے۔ یہاں پر میری مراد ایسے افراد سے ہے کہ جو کسی شخص کامل کی دست بیعت فقط اس نظریئے کے تحت حاصل کرتے ہیں کہ وہ پیر کو ایک ایسا مشینی روبوٹ تصور کرتے ہیں کہ جس کا مقصد یہ نہیں کہ وہ

اپنے روحانی فیض کو اپنے مریدین پر منتشر کرے۔ بلکہ اس کا کام یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے مریدوں کے نفسانی اغراض و مقاصد کو ان کی مرضی کے مطابق احسن طریقے سے حاصل کرسکتا ہو۔ اور یہاں مرضی پیر کی نہیں ہوتی بلکہ مرید کی ہوتی ہے کہ وہ جس سانچے میں بھی پیر کو ڈھالنا چاہئے ڈھال لے۔ پیر کو وہ اس بات کی اجازت بھی نہیں دیتے کہ وہ ان کے سامنے اف تک کہہ سکے۔ کیونکہ اگر پیر شکایت کرے گا تو ان کا ناطہ اپنے پیر سے کچے دھاگے کی مانند منقطع ہوجائے گا کہ جس کو وہ نذر و نیاز کے ترازو میں تولتے ہیں۔ ان کے نزدیک نذر و نیاز پیر کو خرید لیتی ہے اور وہ اس کو رشوت کی مانند استعمال کرسکتے ہیں۔ یہ سب کچھ بیان کرنے کا میرا مقصد فقط اتنا ہے کہ ایسے لوگوں کو اپنے اندازِ فکر کی اصلاح کرنے کی ترغیب دے سکوں کہ آیا یہی وہ فیض تھا کہ جس کے لئے تم نے صحبت پیر کو اپنایا۔ ایک پیر کا مرید سے ظاہر کا رابطہ نہیں ہوتا بلکہ دل کا رابطہ ہوتا ہے۔ اور اگر بیعت کے بعد بھی دل کے دروازے بند ہی رہے تو اس کا مطلب یہی ہے کہ مرید نے اپنے پیر سے ظاہر کا واسطہ رکھنے کی کوشش کی ہے اور ایسے دلوں میں آگ کہاں سے لگے گی۔ جبکہ ان تلوں میں تو تیل ہی نہیں۔ اس سلسلے کی ہر کوشش ایسے ہی ہے کہ جیسے کسی مردہ گھوڑے پر کوڑے برسا کر اس کو اٹھنے کی ترغیب دی جائے۔

ادب شیخ کو اس سفر سلوک میں بہت اہمیت حاصل ہے۔ کیونکہ اسی ادب میں تمام راز پنہاں ہیں اور یہی ادب منازل یقین و سلوک کی کنجی ہے۔ آئینہ دل میں تصور شیخ کے عکس میں جمال الٰہی کی تصویر کھینچنے کی بجائے جو لوگ اس آئینہ میں سیاست، معاشیت اور خود پسندی کی تصویر کھینچتے ہیں تو اس سے حاصل یہی ہوتا ہے کہ یہ بعد والی تصویر جلد ہی اپنے رنگ چھوڑ دیتی ہے۔ کیونکہ ان کا تعلق مادیت پسندی سے ہے۔ جبکہ جمال الٰہی کی تصویر کا تعلق روح سے ہے جو کہ باقی رہنے والی ہے اور لامحدود ہے۔ اس لئے اس تصویر کے رنگ بھی اپنی شوخی اور تیزی کو برقرار رکھتے ہیں۔

جب ان مرید حضرات کو اپنے پیر سے مطلب کی چیز نہیں ملتی تو یہ پیر پر الزام تراشی

شروع کر دیتے ہیں کہ جناب پیر کا فیض تو کامل ہی نہیں ہے، ان کی صحبت میں جانے سے تو ہم پر اثر ہی نہیں ہوا اور ہم جوں کے توں ہیں۔ یہاں پر ایسے مرید حضرات کی فطرت ظاہر ہوتی ہے کہ انہوں نے اپنے پیر کو بھی دنیا کے ترازو میں ہی تولا ہے اور اپنے ایمان پر نظر ثانی کی بجائے پیر کے ایمان پر تہمت لگانی شروع کر دی۔ وہ شیخ کہ جس کی بیعت کرتے وقت وہ اپنی دین و دنیا کو اس کے حوالے کرنے کی قسم کھاتے تھے کہ اس کا پیر اس کو سدھارے۔ بعد میں وہی مرید اس کی چغلی کرنے سے بھی باز نہیں رہتے۔ تو اب میں کیا کہوں کہ ایسے مرید کو فیض ایمان سے کیا تعلق اور میرے خیال میں تو پیر کو بھی چاہئے کہ وہ ایسے مرید کو فیض دنیا ہی دے کر فارغ کر دیا کرے۔ کیونکہ اس کی قسمت میں یہی لکھا ہے۔

آج کل کے مرید حضرات تو اپنے پیر کے سامنے اس کی شکایت کرنے کو بھی اپنا حق سمجھتے ہیں۔ اگر ان کے معاملے میں ہلکی سی بھی کوئی اونچ نیچ ہو جائے۔ میرے ساتھ کئی بار ایسے معاملات پیش آ چکے ہیں کہ اکثر اوقات میرے پاس جب میرے برادران طریقت اور مریدین وغیرہ دعا کے لئے آئے اور میں اپنے بزرگان دین کی وساطت سے ان کے لئے دعا کرتا ہوں کہ الٰہی ان کے حق میں جو بہتر سمجھے وہ ان کو عطا فرما۔ لیکن وہ لوگ اس بات پر بضد ہوتے ہیں کہ آپ دعا کیجئے کہ جو ہم چاہتے ہیں وہی ہمیں ملے۔ اب میں ان کم عقلوں کو کیا کہوں کہ تمہارا علم کیا اس ذات کے علم پر حاوی ہے۔ کیا تم جانتے ہو کہ تمہارے حق میں کیا بہتر ہے؟ اور جب ان لوگوں کی ضد پوری نہیں ہوتی تو وہ از راہ ناراضگی انتہائی مخدومانہ لہجے میں حکم صادر کرتے ہیں کہ آپ کو اپنا پیر بنایا ہے اس لئے آپ ہماری منشاء کے مطابق ہماری بات مانیں۔ ایسے موقعوں پر مجھ سے جس قدر ہو سکتا ہے ان سے ہمدردی کرتا ہوں۔ کیونکہ جو کچھ بھی ہے وہ مجھ کو اپنا مان کر ہی کچھ شکایت کرتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ ان کا رویہ ان کو زیب دیتا ہے یا نہیں۔ لیکن حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ کی مناسبت سے ایک واقعہ بیان کروں گا کہ حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ اپنے ایک مرید کے ہمراہ جنگل میں گئے۔ مرید کا گریبان پھٹا ہوا تھا، آفتاب کی چمک اس کے گریبان پر پڑتی تھی، وہ

بے قرار ہوگیا اور اس کے نتھنوں سے خون بہنے لگا۔ اس مرید نے کہا آج بہت گرم دن ہے۔ آپ نے اس کی جانب ہیبت کی نظر سے دیکھا اور کہا! جا چلا جا تو ہماری صحبت کے قابل نہیں ہے اور پھر اس کو اپنی خانقاہ سے نکال دیا۔ تو آپ نے ملاحظہ کیا کہ اس مرید نے فطرت کے متعلق شکایت کی تو حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ کو ناگوار گزری۔ کیونکہ حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ کے مطابق وہ اس قابل نہ تھا کہ آپ کی صحبت میں رہ سکتا۔ شکایت کرنا مرید کا شیوہ نہیں بلکہ حقیقی مرید تو وہ ہے کہ جو اپنے مرشد کی ناراضگی کی پناہ مانگتا ہے کہ کہیں اس کا رب اس سے روٹھ نہ جائے اور جو حکم پیر صادر فرمائے تو خواہ اس میں جان و مال کا نقصان ہی کیوں نہ ہو وہ اس نقصان کو بھی اپنا نفع ہی تسلیم کرتا ہے۔ کیونکہ اس میں اس کے پیر کی رضا شامل ہوتی ہے۔

حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ کے ایک اور مرید نے ایک مرتبہ آپ سے کچھ گستاخی کی اور پھر خود ہی شرم کی وجہ سے آپ کے پاس سے چلا گیا اور مسجد میں مقیم ہوگیا۔ ایک بار آپ اس طرف جا نکلے تو دیکھا کہ مرید پر کچھ ایسی حالت طاری ہے کہ وہ خوف سے گر پڑا اور اس کا سر پھوٹ گیا۔ خون کے جو قطرات اس کی پیشانی سے گرتے تھے اس سے لا الہ الا اللہ کی شکل پیدا ہوتی تھی۔ آپ نے یہ دیکھ کر کہا کہ کیا تو مجھے یہ دکھانا چاہتا ہے کہ میں اس درجہ تک پہنچ گیا ہوں۔ خبردار تیرے ساتھ تو چھوٹے چھوٹے لڑکے بھی ذکر میں برابری کا درجہ رکھتے ہیں۔ مرد کو تو مذکور تک پہنچنا چاہئے۔ آپ کی اس بات نے اس کے قلب پر ایسا اثر کیا کہ اس نے تڑپ تڑپ کر جان دے دی۔ پھر اس کو دفن کر دیا گیا۔ ایک بزرگ نے اس کو خواب میں دیکھا اور اس سے پوچھا تیرا کیا حال ہے؟ اس نے کہا کہ برسوں سے دوڑ دھوپ کر رہا ہوں لیکن کفر کی سرحد پر پہنچا ہوں، دین تو ابھی بہت دور ہے۔ وہ سب میرے گمان باطل تھے۔ تو آپ نے ملاحظہ کیا کہ جب تک اس کے مرشد نے اسے معاف نہ کیا تب تک اس کو آخرت میں بھی چین نہ آیا۔ اس کے برعکس ایسے مرید بھی ہیں کہ جو اپنا سارا جان و مال وانا وغیرہ بھی راہ سلوک میں لٹا کر اپنی منزل کی تگ و دو میں رہتے ہیں کہ مرشد

کے دل میں ان کے لئے فقط محبت کا ایک لمحہ پیدا ہو۔

نقل ہے کہ حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک مرید تھا جو بہت سا مال آپ پر نثار کر چکا تھا اور اب اس کے پاس صرف ایک گھر ہی گھر رہ گیا تھا۔ اس نے آپ سے دریافت کیا کہ اب میں اس گھر کا کیا کروں؟ آپ نے فرمایا! اس کو فروخت کر دے اور اس کا روپیہ لے آ۔ وہ گیا اور مکان بیچ کر روپیہ لے آیا۔ آپ نے اس کو حکم دیا کہ اس روپیہ کو دجلہ میں ڈال دے۔ اس نے ایسا ہی کیا اور پھر آپ کے پیچھے پیچھے ہو گیا۔ آپ نے اسے للکارا اور ہنکایا اور کہا تو میرے عقب میں کیوں آتا ہے؟ وہ منتیں سماجتیں کرنے لگا۔ آپ اسے ہر چند نکالتے تھے لیکن وہ ساتھ ہی رہتا تھا۔ آخر وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا اور حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ کو اس کا یہ رویہ بھی بھا گیا۔

وہ مرید اپنا سب کچھ بیچ کر بھی آ گیا تو تب بھی اس کے مرشد نے اس کو دھتکارا۔ لیکن مرید نے بھی تہیہ کر لیا تھا کہ میرا گھر، مال و جان تو اپنے مرشد کے نقش قدم پر ہی بستا ہے۔ اور اس طرح سے اپنے آپ کو اس امتحان میں کامیاب پایا۔

لیکن آج کل تو حال یہ ہے کہ اگر کوئی سیٹھ صاحب کسی مرشد کی اطاعت قبول کرتے ہیں تو سب سے نظریں چھپا کر ایک سو کا نوٹ پیر کے ہاتھ میں زبردستی تھماتے ہوئے کان میں سرگوشی کرتے ہیں کہ دعا کیجئے کہ میرا فلاں مسئلہ اٹکا ہوا ہے وہ درست ہو جائے۔ گویا ان کا رویہ اس طرح ہوتا ہے کہ جیسے کسی سرکاری افسر کو میز کے نیچے سے رشوت تھما رہے ہوں اور کہہ رہے ہوں کہ کام ہو جانا چاہئے۔ مجھے ان کے اس رویہ پر حیرت نہیں افسوس ہوتا ہے کہ وہ اپنے مرشد کی دعاؤں کا بھی مول لگا دیتے ہیں۔ اس ضمن میں میں آپ کو اپنے ساتھ پیش آنے والا واقعہ سناؤں گا ایک مرتبہ میرے پاس میرا ایک برادرِ طریقت آیا۔ وہ ایک سرکاری محکمے میں ملازم تھا اور مصافحہ کرنے کے بعد سامنے پڑی کرسی پر اس انداز سے بیٹھا کہ جیسے اپنے دفتر میں آ کر بیٹھا ہو۔ اس کا غالباً کوئی عزیز کچھ عرصہ سے بے روزگار تھا اور وہ اس کی ملازمت کے سلسلے میں آیا تھا بہرحال وہ کہنے لگا کہ جناب یہ معاملہ ہے آپ مہربانی

فرمائیں کسی سے سفارش کر دیں۔ اور اگر کسی کے ہاتھ ''گرم'' کرنے کی ضرورت ہو (یعنی رشوت دینے کی ضرورت ہو) تو ہم پھر بھی حاضر ہیں۔ میری آنکھیں اس کی یہ بات سن کر کھلی کی کھلی رہ گئیں اور میں اپنے آپ پر قابو نہ رکھ سکا اور اسے اپنے گھر سے نکل جانے کو کہا۔ اس دن کے بعد اس مرید صاحب کا میں نے کبھی چہرہ نہیں دیکھا۔ کیونکہ اس کو معذرت کرنا بھی گوارا نہ تھا اور وہ اس میں اپنی توہین سمجھتا تھا۔ یا یوں کہہ لیجئے کہ جس میں اس کی توہین تھی۔ اس کو اس نے اپنی عزت سمجھا اور جس میں عزت و بڑائی تھی اس میں اپنی توہین سمجھی۔ بہرحال اس قسم کے کئی اور واقعات بھی ہمارے ساتھ پیش آ چکے ہیں۔ لیکن کہنا صرف اتنا ہے کہ بھائی اگر تمہیں اس ذات پاک کی قدرت کامل پر بھروسہ نہیں تو پھر اپنے مرشد کے پاس کیا لینے آتے ہو۔ کیونکہ ان کے پاس تو صرف ایک ہی سفارش ہوتی ہے کہ جو وہ اس ذات باری تعالیٰ میں کر سکتے ہیں اور اگر تمہیں اس سفارش پر یقین نہیں تو تم اس مریدی کے قابل ہی نہیں۔ خواہ مخواہ اپنا وقت ضائع کر رہے ہو، جاؤ اور اپنی غرض کی دنیا کو اپنے انداز سے پھولوں کی سیج بناؤ۔ بعض مریدین ایسے بھی دیکھے ہیں کہ جن کے نزدیک بیعت کا مقصد فقط اپنی نفسانی خواہشات کا حصول ہے کہ جس میں وہ اپنے مرشد کو استعمال کر سکیں اور اگر ان کی یہ خواہشات پوری نہیں ہوتیں تو وہ اپنے پیر کو خدا حافظ کہہ دیتے ہیں۔ گویا انہوں نے بیعت کر کے اپنے پیر پر احسان کیا تھا لیکن متوقع نتائج نہ برآمد ہونے پر اپنے منصب مریدی سے احتجاجاً استعفیٰ دے دیا۔

میرا ایک دست بیعت مجھ سے کچھ رقم ادھار لینے کی غرض سے آیا۔ کیونکہ اس کو ایک کاروبار مل رہا تھا اور اس کے پاس روپے کی قلت تھی اور ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ ابھی اسی وقت چاہئے۔ گویا حکم صادر کر رہا تھا۔ میں نے کہا کہ آپ کی مطلوبہ رقم کچھ زیادہ ہے اس لئے دو دن انتظار کر لو۔ میں نے ایک کاروبار شروع کر رکھا ہے اس سے کچھ منافع مجھے دو دن بعد ملے گا تو میں تمہیں تمہارے مطلب کی رقم دے دوں گا۔ لیکن وہ بضد تھا کہ رقم ابھی چاہئے تو میں نے اس سے معذرت کر لی۔ اس کے بعد وہ فوراً اٹھا اور چلتا بنا۔ وہ دن اور آج کا دن

اس کا مجھ سے کوئی رابطہ نہیں رہا۔ حالانکہ پہلے اس کا کافی آنا جانا تھا۔

مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ ''تشبیہات رومی'' میں ایسے مرید حضرات کی اس دنیا طلبی پر نہایت سخت الفاظ میں تنقید کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ جب بعض برگزیدہ لوگ پاکیزگی نفس اور روحانی قوتوں کی بدولت مرجع بن جاتے ہیں تو ان کے پاس کثرت سے دنیا دار لوگ ادنیٰ اغراض کے حصول کے لئے پہنچتے ہیں۔ اور ان سے ایسی باتیں کرنے لگتے ہیں جن سے اِن کی طبع پاک منغص ہوتی ہے۔ اپنے خلق کی وجہ سے وہ ان کو دھتکار نہیں سکتے۔ مگر ایسے جیفہ خودان سگ دنیا کی صحبت سے طبیعت میں پیچ وتاب ضرور پیدا ہوتا ہے۔

یک سلامے نشنود پیر از خسے
تانہ پیچد عاقبت از دلے بسے

یعنی اگر ایسے مکار مریدوں کی جگہ کوئی بھیڑیا ولی کو مل جائے تو وہ قابل ترجیح ہے۔ کیونکہ بھیڑیا درندہ سہی لیکن انسانوں کا سا مکر ودجل تو اس کے اندر نہیں ہوتا۔ اگر وہ بھی مکار ہوتا تو مکار انسانوں کے مکر کا شکار نہ ہوسکتا۔ خدارسیدہ بزرگوں کے پاس ہر طرح کے لوگ دنیاوی اغراض کے حصول میں روحانی امداد کے لئے پہنچتے ہیں۔ لیکن کوئی ایسا انسان شاذ و نادر ہی آتا ہے جو کہے کہ میں تزکیہ نفس اور خدارسی میں کوشاں ہوں اور آپ سے ہدایت چاہتا ہوں۔

اکثر قومیں اپنی تاریخ پر بے جا فخر کرنے لگتی ہیں۔ خصوصاً انحطاط کے دور میں۔ چونکہ وہ موجودہ حالت قابل افتخار نہیں ہوتی اس لئے'' پدرم سلطان بود'' کا ورد ہوتا ہے۔ اسی طرح بعض افراد بھی جو خود کچھ نہیں ہوتے۔ نسب اور قدامت خاندان کے سہارے پر دوسروں سے احترام کے طالب ہوتے ہیں۔ کہنے کا مقصد فقط اتنا ہے کہ بعض پیران ایسے بھی ہیں کہ جو اپنے برگزیدہ بزرگوں کے نام پر اپنے آپ کو بھی برگزیدہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اللہ کے ولی کا فیض کئی پشتوں تک کامل رہتا ہے۔ لیکن دیکھنا یہ ہے کہ آیا ان پشتوں نے اپنے آپ کو اس فیض کے حصول کے قابل بھی بنایا ہے یا نہیں۔

فی زمانہ خود میری ملاقات بھی کئی مرتبہ ایسے بناوٹی شیوخ سے ہوئی ہے کہ جن کا دنیاوی جاہ وجلال اپنی انتہاء پر ہے اور صرف اس بناء پر کہ ان کے بزرگ حقیقی معنوں میں اپنے مجاہدہ نفس کی بدولت دینی جاہ وجلال کے حامل تھے۔ چونکہ وہ اپنی فطرت میں اپنے بزرگوں کے فیض کے اہل نہیں ہوتے اس وجہ سے اپنی حسبی تاریخ کو دور حاضر میں کیش (Cash) کرتے ہوئے سادہ لوح افراد کو بیوقوف بناتے ہیں۔ اور اگر وہ کیش نہ کر پائیں تو بعض اوقات اپنے حسب کو بھی کسی اعلیٰ حسب سے تبدیل کر لیتے ہیں۔ مثال کے طور پر میں خود ایک مشہور خانقاہ کی اکثر زیارت کی خاطر جاتا تھا کہ جن کے فیضان سے کئی خانقاہوں نے جنم لیا۔ میں ان کے بزرگان کی تاریخ سے خاصی واقفیت رکھتا تھا کہ جو راہ ولائت میں ایک روشن مینار کی حیثیت رکھتے تھے۔ لیکن جب حال میں دوبارہ ان خانقاہوں کی زیارت کو گیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ ان بزرگان کے حسب کو خاندان سادات کے حسب میں شامل کر دیا گیا اور جس بناء پر وہاں کے موجودہ بناوٹی شیوخ کی مریدی میں بھی کافی اضافہ ہوا۔

یہ تمام احمقانہ باتیں ہیں۔ کیونکہ انسان کو اپنے ماضی پر فخر کرنے کی بجائے اپنے حال پر نظر ثانی کرنی چاہئے۔ اس کی بابت میں عرض ہے کہ ایک اونٹ، ایک بیل اور ایک دنبہ کہیں چلتے ہوئے رفیقان راہ تھے۔ راستے میں ایک گھاس کا پولہ پڑا پایا، تینوں کی طبیعت للچائی۔ مگر دنبے نے کہا کہ بھائیو! یہ پولا کچھ ایسا بڑا نہیں کہ اس کے تین حصے کئے جائیں اور تینوں کا پیٹ بھر سکے۔ اس نے یہ تجویز دی کہ حسب حدیث مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہم میں جو عمر میں سب سے بزرگ ہو پورے کا پورا پولہ اسی کے حوالے کر دیا جائے۔ دنبے نے یہ شیخی بگھاری کہ میری عمر کا کیا پوچھتے ہو، میں تو حضرت اسماعیل علیہ السلام کے قربانی کے دنبے کے اسی زمانے میں ایک چراہ گاہ میں چرتا تھا۔ بیل نے کہا یہ تو بڑی دور کی کوڑی لایا ہے، میں اپنے آپ کو زمانہ آدم علیہ السلام تک پہنچا دوں تو یہ دنبہ بہت پیچھے رہ جائے گا اور اونٹ بھلا اس قدامت کے مقابلے میں کیا کہہ سکے گا؟ چنانچہ بیل نے کہا کہ میں تو اس جوڑی کا بیل ہوں جس سے حضرت آدم علیہ السلام نے زمین پر زراعت شروع کی تھی۔

اونٹ جب دونوں کی بڑائی سن چکا تو کچھ کہے بغیر اس نے گھاس کا پولا اٹھالیا اور اپنی دراز گردن سے اس کو ایسا اونچا کیا کہ نہ دنبے کا منہ اس تک پہنچ سکے اور نہ بیل کا۔ اس نے کہا کہ یارو نہ مجھے قیل وقال کی ضرورت ہے اور نہ تاریخ اور سوانح عمری اور فصل قدامت کی۔ اگر حصہ بقدر جثہ اصول درست اور علاقانہ ہے تو میرے جسم اور گردن عالی کو دیکھو۔ تم فضیلت تاریخ میں ڈھونڈتے ہو، اصل بزرگی تو موجودہ حالت کی بزرگی ہے۔ سو اپنی حیثیت کا مقابلہ میری موجودہ حیثیت سے کرلو۔

بعض مرید ایسے بھی دیکھے ہیں کہ جب ان کو کچھ دیر ہو جاتی ہے اور معمولی سی بھی کوئی منزل مل جاتی ہے تو وہ اپنے آپ کو بڑا پہنچا ہوا ولی سمجھ کر اپنے پیر کی صحبت سے علیحدہ ہو جاتے ہیں۔ اور بلا اجازت اپنا سلسلہ شروع کرتے ہیں اور اس طرح سے اپنی اچھی بھلی دنیا اور عاقبت کو خراب کر بیٹھتے ہیں۔ وہ یہ نہیں جانتے کہ مرید کے لئے پیر کی صحبت ایسی ہے کہ جیسے ایک مومن کے لئے تعلیم۔ کیونکہ وہ آخری دم تک طالب ہی رہتا ہے۔

نقل ہے کہ حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ کے ایک مرید پر یہ دیوانگی چھا گئی کہ میں کامل ہو گیا ہوں اور میرے لئے جلوت سے خلوت بہتر ہے۔ چنانچہ وہ گوشہ نشین ہو گیا اور اس کی حالت یہ ہو گئی کہ وہ ہر رات فرشتوں کو خواب میں دیکھتا جو اس کے اونٹ لاتے تھے۔ اور کہتے تھے کہ تجھے بہشت میں لے چلتے ہیں۔ آخر وہ اس پر سوار ہوتا اور چلا جاتا تھا۔ جاتے جاتے اس کو ایک نہایت سرسبز و شاداب مقام نظر آتا جہاں وہ بہت سے حسین آدمیوں کو دیکھتا اور نہایت نفیس کھانے اور صاف وشفاف نہریں پاتا تھا۔ پھر وہ وہاں قیام کرتا اس کی یہ حالت یہاں تک ترقی کر گئی کہ وہ لوگوں سے کہنے لگا کہ میں ایسا ہوں کہ ہر روز بہشت میں جاتا ہوں۔ یہ خبر آپ تک پہنچی اور آپ اس کی خبر کو گئے۔ دیکھا کہ وہ نہایت شان وشوکت سے بیٹھا ہے۔ آپ کے دریافت فرمانے پر اس نے تمام حال ظاہر کیا۔ آپ نے فرمایا! آج رات کو جب وہاں پہنچو تو ذرا ''لا حول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم'' پڑھنا۔ حسب معمول رات کو جب وہ خواب کی حالت میں بہشت پہنچا۔ اگر چہ وہ

دل سے آپ کا انکاری تھا لیکن آزمائش کے طور پر ''لاحول'' پڑھی۔ اس کا پڑھنا تھا کہ سب چلا اٹھے اور اس کو چھوڑ کر بھاگ گئے۔ دیکھتا کیا ہے کہ گھوڑے پر سوار ہے اور مردوں کی ہڈیاں اس کے آگے رکھی ہیں۔ وہ چونکا اور آپ سے اپنی غلطی کو سمجھ لیا۔ صبح اٹھ کر توبہ کی اور آپ کی خدمت میں حاضر ہو گیا اور یہ بات اس کے دل نشین ہو گئی کہ مرید کے لئے تنہائی زہر ہے اور شیخ کامل کی صحبت ہی اس کی حقیقی حیات ہے۔

اسی ضمن میں ایک اور واقعہ منقول ہے کہ خواجہ چنن شاہ نوری آلومہاروی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک انتہائی چہیتا مرید تھا کہ جو شب و روز اپنے پیر کی صحبت میں رہتا تھا۔ خواجہ صاحب کا یہ معمول تھا کہ وہ اکثر ماہ دو ماہ کے لئے گوشہ نشین ہو جاتے اور اس دوران مریدین کثیر تعداد میں ان کے حجرے سے باہر ان کی جھلک دیکھنے کے منتظر رہتے۔ جب اس مرید خاص کو آپ کی صحبت میں رہتے کئی سال گزر گئے تو خیال ہوا کہ خواجہ صاحب تو اکثر ذکر و فکر میں رہتے ہیں اور مریدین کی کثیر تعداد ان کی منتظر رہتی ہے۔ تو کیوں نہ میں اس دوران اپنے فیض کا پرچار کروں اور اپنی غرض کی دنیا کو بہتر کروں۔ چنانچہ اس نے لوگوں کو یہ کہنا شروع کر دیا کہ میں خواجہ صاحب کے فیض کا امین ہوں اس لئے وہ تمام اب مجھ سے طالب فیض رہیں۔ اس واقعہ کو ابھی زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ اس کو کوڑھ کا مرض لاحق ہو گیا اور وہ محسوس کرتا تھا کہ اس کا تمام بدن آگ میں جھلس رہا ہے۔ ہر چند تدبیر کرتا لیکن رائیگاں جاتی۔ لوگ اس کے مرض سے خوف کھاتے اس سے دور رہتے تھے۔ جب حالت زیادہ بگڑ گئی تو ایک دن خواجہ صاحب کے حجرے کے باہر گڑگڑا کر آپ کو آوازیں دینے لگا اور معافی کا طلب گار رہا۔ خواجہ صاحب اس کی آہ و بکا سن کر باہر تشریف لائے اور اس سے کہا کہ تیرا فیض ایسا ہے کہ لوگ تجھ سے دور بھاگتے ہیں۔ یہ کہہ کر آپ نے اس پر تھوک دیا۔ اس لعاب کی برکت سے اس کو شفا نصیب ہوئی اور باقی ماندہ زندگی اپنے شیخ کی بارگاہ میں ایک طالب حقیقی کے طور پر گزار دی۔

ادب شیخ

اس موضوع پر برسرِ تحریر ہونے کے لئے جب میں نے سوچ و بچار شروع کیا اور الفاظ کی تراش خراش کو ایک انداز دینے لگا تو اچانک میرے خیالات نے مجھے حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کی بارگاہ کی جانب کھینچا اور میں اس جانب کھنچتا ہی چلا گیا۔ ایک اور مقام ایسا آیا کہ جہاں میں نے حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کو ایک مرید صادق کے روپ میں پایا۔

چنانچہ حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ اپنے مکتوب نمبر ۲۹۲ میں شیخ عبدالحمید بنگالی کو مریدین کے ضروری آداب اور بعض کے شبہات دور کرنے اور اس کے مناسب امور بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

"اے عزیز! جان لے کہ اس راہ فقیر پر چلنے والے دو حال سے خالی نہیں، یا مرید ہیں یا مراد۔ اگر مراد ہوں تو انہیں مبارک ہو کیونکہ انہیں انجذاب اور محبت کے راستے سے کشاں کشاں لے جائیں گے اور مطلب اعلیٰ تک پہنچا دیں گے اور ہر ادب جو درکار ہو بلواسطہ یا بلاواسطہ انہیں سکھا دیں گے اور اگر ان سے کوئی لغزش واقع ہوگئی تو اس پر انہیں جلدی آگاہ فرما دیں گے اور اگر ان پر گرفت نہیں کریں گے اور انہیں ظاہری پیر کی ضرورت ہوگی تو ان کی کوشش کے بغیر اس دولت تک پہنچا دیں گے۔ مختصر یہ کہ عنایت ازلی جل شانہ ان بزرگوں کے حال کی کفیل ہے۔ بالواسطہ یا بلاواسطہ ان کے کام کے لئے اللہ تعالیٰ کافی ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ اپنی بارگاہ میں جسے چاہتا ہے برگزیدہ بنا لیتا ہے۔ اور اگر مرید ہوں گے تو ان کا کام کامل اور کامل کرنے والے پیر کے واسطہ کے بغیر دشوار ہے۔ بلکہ ایسا پیر چاہئے جو جذبہ اور سلوک کی دولت سے مشرف اور فنا و بقا کی سعادت سے بھی سعادت مند ہو چکا ہو۔ سیر الی اللہ، سیر فی اللہ، سیر عن اللہ باللہ اور سیر فی الاشیاء باللہ (ان سب کی وضاحت آگے آئے گی) کو مکمل طور پر طے کر چکا ہو اور

اس کا جذبہ اس کے سلوک پر مقدم ہو اور مرادوں کی تربیت کا پروردہ ہو تو نہایت ہی اکسیر ہے۔ اس کا کلام دوا ہے اور اس کی نظر شفا۔ مردہ دلوں کی زندگی اس کی توجہ شریف سے وابستہ ہے اور مردہ جانوں کی تازگی اس کی التفات لطیف کے ساتھ مربوط ہے اور اگر اس طرح کا صاحب دولت پیر میسر نہ آئے تو سالک مجذوب ہی غنیمت ہے اور ناقصوں کی تربیت اس سے بھی ہو جائے گی اور اس کے واسطہ سے فنا و بقا کی دولت تک پہنچ جائیں گے۔'' ؎

آسمان نسبت بعرش آمد فرود
ورنہ بس عالی است پیش خاک تود

(یعنی آسمان عرش کی نسبت تو نیچے ہے لیکن تو وہ خاک سے بہت اونچا ہے)۔

اگر عنایت خداوندی جل سلطانہ سے کسی طالب کو اس طرح کے کامل اور کامل کرنے والے پیر تک پہنچا دیں تو چاہئے کہ اس کے وجود شریف کو غنیمت جانے اور اپنے آپ کو مکمل طور پر اس کے سپرد کر دے اور اپنی نیک بختی کو اس کی رضامندی کے کاموں میں جانے اور اپنی بدبختی کو اس کی ناراضگی میں خیال کرے۔ مختصر یہ کہ اپنی خواہش کو اس کی رضا کے تابع کر دے۔

حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں وارد ہے۔

''تم میں سے اس وقت تک کوئی مومن نہیں ہو سکتا جب تک اپنی خواہش نفس کو اس چیز کے تابع نہ کر دے جس کو میں لے کر آیا ہوں۔'' (مشکوۃ)

یہ بات بھی مرید کے ذہن میں رہنی چاہئے کہ آداب صحبت اور شرائط کا لحاظ بھی اس راہ کی ضرورت سے ہے تاکہ فائدہ پہنچانے اور فائدہ حاصل کرنے کا راستہ کھلے۔ اس کے بغیر صحبت کا کوئی نتیجہ نہیں اور مجلس کا کوئی فائدہ نہیں۔ بعض آداب اور ضروری شرائط بیان کی جاتی ہیں۔ گوش و ہوش سے سنیں۔

یہ جان لینا چاہئے کہ طالب اپنے دل کے چہرہ کو تمام اطراف سے موڑ کر اپنے پیر کی

طرف متوجہ کرے اور پیر کی موجودگی میں اس کی اجازت کے بغیر نوافل اور اذکار میں مشغول نہ ہو اور اس کے غیر کی طرف التفات نہ کرے اور اپنے آپ کو کلیۃً اس کی طرف متوجہ کر کے بیٹھے۔ یہاں تک کہ اس کے حکم کے بغیر ذکر میں بھی مشغول نہ ہو اور فرض وسنت ونماز کے علاوہ کوئی نماز اس کی مجلس میں ادا نہ کرے۔

بادشاہ اکبر کے متعلق منقول ہے کہ اس کا وزیر اس کے سامنے کھڑا تھا۔ اتفاقاً اسی دوران میں وزیر کی توجہ اپنے کپڑوں کی طرف ہوگئی اور اس نے اپنے کپڑوں کے کسی بند کو اپنے ہاتھ سے درست کیا۔ اسی دوران بادشاہ کی نظر اس پر پڑی۔ دیکھا کہ وزیر اس کی طرف متوجہ نہیں تو ڈانٹ کر کہا کہ میں اس چیز کو برداشت نہیں کر سکتا کہ میرا وزیر ہو کر میرے سامنے اپنے کپڑے کے بند کی طرف توجہ کرے۔

غور کرنا چاہئے کہ جب کمینی دنیا کے وسائل کے لئے باریک آداب درکار ہیں تو جو چیزیں (مرشد وغیرہ) خدا تک پہنچنے کا وسیلہ ہیں۔ ان کے آداب کی رعایت تو بہت کامل طریق پر کرنی لازم ہوگی اور جہاں تک ممکن ہو ایسی جگہ پر نہ کھڑا ہو کہ اس کا سایہ پیر کے کپڑوں یا پیر کے سائے پر پڑتا ہو اور پیر کی جانماز پر پاؤں نہ رکھے اور اس کے وضوخانہ میں وضو نہ کرے اور اس کے خاص برتنوں کو اپنے استعمال میں نہ لائے اور اس کے سامنے پانی نہ پئے اور نہ کھانا کھائے اور نہ کسی سے بات کرے۔ بلکہ کسی کی طرف بھی متوجہ نہ ہو اور پیر کی عدم موجودگی میں اس طرف پاؤں نہ کرے جس طرف پیر ہو اور نہ اس طرف تھوکے اور جو کچھ پیر سے صادر ہو، اسے درست جانے اگرچہ بظاہر درست نظر نہ آئے۔ کیونکہ پیر جو کچھ کہتا ہے الہام اور اذن سے کرتا ہے۔ لہٰذا ایسی صورت میں اعتراض کی گنجائش نہیں ہے۔ اگر اس کی بعض الہامی صورتوں میں خطا بھی واقع ہو جائے تو خطا الہامی خطا اجتہادی کی طرح ہے کہ اس پر ملامت یا اعتراض جائز نہیں۔ نیز چونکہ اس مرید کو اپنے پیر کے ساتھ محبت پیدا ہو چکی ہوتی ہے اس لئے محبوب سے جو کچھ صادر ہو مرید کو اچھا ہی نظر آتا ہے۔ لہٰذا اعتراض کی کوئی گنجائش نہیں اور تمام کلی وجزئی امور میں اپنے پیر کی اقتداء کرے۔ کیا کھانے

میں کیا پینے میں اور کیا سونے اور ہر نیک کام میں۔ نماز کو اپنے پیر کی طرح ادا کرنا چاہئے۔ اور فقہ کو اس کے عمل سے اخذ کرنا چاہئے۔

آں را کہ در سرائے نگاریست فارغ است
از باغ و بوستان و تماشائے لالہ زار

(جس گھر میں معشوق ہو وہ باغ و بوستان کی سیر اور لالہ زار کے تماشے سے فارغ ہے)۔

پیر کی حرکات و سکنات میں اعتراض کو قطعاً گنجائش نہ دینی چاہئے خواہ رائی کے برابر اعتراض ہو۔ کیونکہ اعتراض کا نتیجہ محرومی کے سوا کچھ نہیں اور تمام مخلوق میں سب سے زیادہ بے سعادت وہ شخص ہے جو اس گروہ اولیاء اللہ میں عیب نکالے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس بلائے عظیم سے نجات دے۔ اپنے مرشد سے خوارق و کرامات کا مطالبہ نہ کرنا چاہئے۔ اگر چہ یہ طلب دل میں وسوسے اور خطرے کی شکل میں ہو۔ تم نے کبھی سنا ہے کہ کسی مومن نے اپنے نبی سے معجزہ طلب کیا ہو، معجزہ طلب کرنے والے کفار اور منکر لوگ ہیں۔

معجزات از بحر قہر دشمن است
بوئے جنسیت پئے دل برون است
موجب ایمان بنا شد معجزات
بوئے جنسیت کند جذب صفات

(یعنی معجزات دشمن کو مغلوب کرنے کے لئے اور دل قابو کرنے کے لئے جنسیت کی بو ہے۔ معجزات ایمان کا باعث نہیں بلکہ جنسیت کی بو صفات کو جذب کرتی ہے)۔

اگر دل میں کسی کا شبہ بھی آ جائے تو بلا توقف پیر کی خدمت میں عرض کرے۔ اگر حل نہ ہو تو اپنی کوتاہی تصور کرے۔ لیکن پیر پر کوئی عیب نہ نکالے اور جو بھی واقعہ ظاہر ہو پیر سے پوشیدہ نہ رکھے اور واقعات کی تعبیر اس سے دریافت کرے اور جو تعبیر خود طلب پر منکشف ہو وہ بھی عرض کرے اور درستی اور خطا کو اس سے تلاش کرے اور اپنے کشفوں پر ہرگز اعتماد نہ

کرے۔ کیونکہ اس دنیا میں حق باطل کے ساتھ ملا ہوا ہے اور درستی خطا کے ساتھ ملی ہوئی ہے اور بے ضرورت اور بلا اجازت اس سے الگ نہ ہو۔ کیونکہ اپنے لئے پیر کے غیر کو اختیار کرنا عقیدت کے منافی ہے اور اپنی آواز کو اس کی آواز سے بلند نہ کرے اور اونچی آواز سے اس کے ساتھ گفتگو بھی نہ کرے کہ بے ادبی ہے اور ظاہر و باطن میں فتوح اور کشائش حاصل ہو تو اپنے مرشد کے توسط سے جانے اور اگر واقعہ میں دیکھے کہ دوسرے مشائخ سے فیض پہنچا ہے تو اسے بھی اپنے پیر کی طرف سے جانے اور یہ اعتقاد رکھے کہ جب پیر کمالات و فیوض کا جامع ہے تو پیر کا خاص فیض مرید کی خاص استعداد کے مناسب شیوخ میں سے ایک شیخ کے مناسب کہ اضافہ کی صورت اس سے ظاہر ہوئی ہے، مرید تک پہنچا ہے اور پیر کے لطائف میں سے ایک لطیفہ جو اس فیض سے مناسبت رکھتا ہے، اس شیخ کی صورت میں ظاہر ہوا ہے۔ مرید کی آزمائش کے طور پر وہ لطیفہ دوسرا شیخ خیال کر لیا گیا ہے اور فیض کو اس کی طرف سے جانا ہے۔ حق سبحانہ لغزش قدم سے بچائے اور پیر کے ساتھ حسن اعتقاد اور اس کی محبت پر قائم رکھے۔ بحرمہ سید البشر علیہ الصلوٰت والتسلیمات۔ مختصر یہ کہ طریقت سب ادب ہے۔ مثل مشہور ہے کہ کوئی بے ادب خدا تک نہیں پہنچ سکتا۔ اور اگر مرید بعض آداب کی رعایت میں اپنے آپ کو کوتاہ جانے اور ان کی مناسب ادائیگی تک نہ پہنچ سکے اور کوشش وسعی کے باوجود عہدہ برآ نہ ہو سکے تو اس کے لئے معافی ہے۔ لیکن اپنی اس کوتاہی کا اعتراف ضروری ہے اور اگر عیاذ باللہ سبحانہ آداب کی رعایت نہ کرے اور اپنی کوتاہی کا اعتراف بھی نہ کرے تو ایسا مرید ان بزرگان کی برکات سے محروم رہتا ہے۔ ؎

ہر کہ را روئے بہ بہبود نہ بود
دیدن روئے نبی سود نہ بود

(جسے اپنی بھلائی کا خود خیال نہ ہو وہ اگر نبی کے چہرے کو بھی دیکھ لے تو بے سود ہے)۔

ہاں وہ مرید جو اپنے پیر کی توجہ کی برکت سے فنا و بقا کے مرتبہ تک پہنچ جاتا ہے اور الہام

اور فراست کا راستہ اس پر ظاہر ہو جاتا ہے اور پیر بھی اسے مسلم رکھے اور اس کے کمال کی گواہی دے تو اس مرید کے لئے گنجائش ہے کہ بعض الہامی امور میں اپنے پیر سے خلاف کرے اور متقضائے الہام پر عمل کرے۔ اگر اس پیر کے نزدیک اس کے خلاف ہی بات ثابت ہو چکی ہو۔ کیونکہ ایسا مرید اس وقت حلقہ تقلید سے باہر نکل چکا ہے۔ اب اس کے لئے تقلید کرنا خطا ہے۔

جیسا کہ ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کے مرتبہ اجتہاد پر پہنچنے کے بعد ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی تقلید کرنا خطا ہے۔ درستی اپنے رائے کی مطابقت میں ہے نہ کہ ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی رائے کی مطابقت میں۔ ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق یہ قول مشہور ہے کہ ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ مسئلہ خلق قرآن میں چھ ماہ تک جھگڑتا رہا۔ آپ نے یہ ضرور سنا ہوگا کہ فن کی تکمیل بہت سے افکار کے ملنے سے ہوتی ہے۔ اگر فن اور علم ایک ہی فکر میں بند رہتا تو اس میں زیادتی اور اضافہ نہ ہوتا۔ علم نحو جو سیبویہ کے زمانہ میں تھا، آج نحویوں کے اختلاف آراء بہت سی انظار کے ملنے سے سو گنا زیادہ اور کامل ہو چکا ہے۔ لیکن چونکہ اس علم کی بنیاد امام سیبویہ نے رکھی ہے۔ لہٰذا بزرگی اور فضیلت اسی کیلئے مسلم ہے۔ فضیلت متقدمین کے لئے ہی ہے اور کمال متاخرین کیلئے۔

حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔

''میری امت کی مثال بارش کی سی ہے یہ پتہ نہیں چلتا کہ اس کا پہلا حصہ بہتر یا آخری حصہ۔''

(ایک مکمل مثال) حضرت اویس قرنی رضی اللہ عنہ

اب جبکہ ہم پر کسی حد تک پیر و مرید کا رشتہ واضح ہو چکا ہے تو ضروری ہے کہ کوئی ایسی بے نظیر مثال سامنے رکھی جائے کہ جو اس رشتہ پیر و مرید کے تمام پہلوؤں کا مکمل طور پر احاطہ کرے۔ اس ضمن میں جب نظر دوڑائی تو ایک ایسی شخصیت پر جا کر رکی کہ جس نے اپنے پیر (حضور صلی اللہ علیہ وسلم) کو ظاہری طور پر کبھی نہیں دیکھا۔ لیکن دیدہ باطن سے ان پر ایمان

لایا اور پھر ایک روحانی تصرف کی بدولت ہمیشہ ان سے دور رہ کر بھی ان سے قریب تر رہا اور فیض یاب ہوتا رہا۔ اور اپنے مقام کو اس قدر مضبوط اور بلند کیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو باطنی صحابی کا درجہ عطا کیا۔ اور آپ وہ واحد صحابی رسول صلی اللہ علیہ وسلم تھے کہ جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ظاہری دید سے بلا دیکھے ہی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی صف میں شامل ہوئے۔ یہاں پر جناب اویس قرنی رضی اللہ عنہ کی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی قربت و نسبت کو ایک پیر و مرید کے رشتے میں قلم بند کریں گے اور یہ اندازہ لگانے کی کوشش کریں گے کہ ایک سچا مرید اپنی کمال انتہا کو کس طرح چھوتا ہے اور پھر اس کا مرشد کس انداز سے اس کے حق میں دعا فرماتا ہے۔

جس مرید صادق کی گواہی حضور صلی اللہ علیہ وسلم دیں، مجھ سے اس کی صفت کیا بیان ہو گی؟ چنانچہ کبھی کبھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم یمن کی طرف منہ کرتے اور فرمایا کرتے۔

"نسیم رحمت یمن کی طرف سے پاتا ہوں۔"

پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"اللہ تعالیٰ قیامت کے روز ستر ہزار فرشتے اویس رضی اللہ عنہ کی شکل میں پیدا کرے گا تا کہ اویس رضی اللہ عنہ میدان قیامت میں ان کے درمیان آوے اور بہشت میں داخل ہو کہ کوئی مخلوق اس بات سے واقف نہ ہو کہ ان کے درمیان اویس رضی اللہ عنہ کون ہے۔ کیونکہ وہ دنیا میں پوشیدہ طور پر اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتے تھے اور اپنے آپ کو لوگوں سے علیحدہ رکھتے تھے اور آخرت میں بھی وہ لوگوں کی نظروں سے محفوظ رہیں۔"

حدیث میں ہے۔

"کل قیامت کے دن میں بہشت میں اپنے مکان سے باہر نکلوں گا اور کہوں گا کہ اویس رضی اللہ عنہ ہے تا کہ میں اسے دیکھوں۔ آواز آئے گی کہ رنج نہ کر کیونکہ تو نے اسے دنیا میں نہیں دیکھا، اس لئے یہاں بھی نہ دیکھے گا۔"

پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

''میری امت میں ایک ایسا مرد ہے کہ قبیلہ ربیعہ اور مضر کی بکریوں کے بالوں کے برابر لوگوں کی شفاعت قیامت کے دن کرے گا۔ (ان دونوں قبائل کی بکریاں عرب میں سب سے زیادہ تعداد میں تھیں)۔''

صحابہ رضی اللہ عنہم نے فرمایا! یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایسا شخص کون ہوگا؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا! اللہ کے بندوں میں سے ہوگا۔ انہوں نے جواب دیا ہم سب اللہ کے بندے ہیں لیکن اس کا نام کیا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا! اویس قرنی رضی اللہ عنہ۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے پوچھا وہ کہاں ہوگا؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا! قرن میں۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے دریافت کیا کہ اس نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا؟ دیدۂ ظاہر سے نہیں لیکن دیدۂ دل سے دیکھا ہے۔ پھر صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کی کہ ایسا عاشق آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں کیا نہیں آسکتا؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا! ہاں دو وجہ سے نہیں آیا۔ ایک تو جذبہ حال کی وجہ سے، دوسرے تعظیم شریعت کے لحاظ سے کہ اس کی ماں ضعیف اور نابینا ہے۔ اویس رضی اللہ عنہ شتربانی کرتا ہے اور ماں کا نفقہ اس سے حاصل کرتا ہے۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کی کیا ہم اسے دیکھ سکتے ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جناب صدیق رضی اللہ عنہ سے کہا کہ تو اسے نہ دیکھے گا لیکن فاروق رضی اللہ عنہ اور مرتضی علیہ السلام اسے دیکھیں گے۔ اس کے بال بکثرت ہیں اور دائیں ہاتھ کی ہتھیلی پر درہم کے برابر ایک سفید داغ ہے اور وہ برص کا داغ نہیں۔ تم جب اسے پاؤ تو میرا اسلام اس تک پہنچانا اور اس سے کہنا کہ میری امت کے لئے دعا کرے۔ پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا! کہ اللہ کے بزرگ دوست مخفی اور پوشیدہ ہیں۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے کہا ہم انہیں کہاں پائیں گے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا! وہ یمن میں شتربان ہے اور اس کا نام اویس رضی اللہ عنہ ہے۔ اس کے قدم بقدم چلو۔

نقل ہے کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے وصال فرما جانا چاہا تو صحابہ رضی اللہ عنہم نے

عرض کیا کہ یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ کا لباس مبارک کس کو دیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا! اویس قرنی رضی اللہ عنہ کو۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت علی علیہ السلام کوفہ تشریف لائے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے خطبہ کے درمیان کہا کہ اے اہل نجد! کھڑے ہو جاؤ، سب اٹھ کھڑے ہوئے۔ آپ نے فرمایا! تمہارے درمیان کوئی شخص قرن کا رہنا والا ہے؟ لوگوں نے کہا ہاں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اویس قرنی رضی اللہ عنہ کے متعلق پوچھا۔ لوگوں نے کہا ہم نہیں جانتے لیکن ایک وحشی ہے جو لوگوں سے دور ہے۔ حضرت فاروق رضی اللہ عنہ نے کہا وہ کہاں ہے؟ لوگوں نے کہا وہ وادی غرا میں اونٹ چراتا ہے اور رات کو خشک روٹی کھاتا ہے اور شہر میں نہیں آتا اور کسی شخص سے صحبت نہیں رکھتا اور جو چیزیں لوگ کھاتے ہیں وہ نہیں کھاتا اور غم وشادی کو نہیں جانتا اور جب لوگ ہنستے ہیں تو وہ روتا ہے اور جب لوگ روتے ہیں تو وہ ہنستا ہے۔ پس فاروق رضی اللہ عنہ وعلی علیہ السلام اس وادی کو گئے اور اس کو نماز میں مشغول پایا اور حق تعالیٰ نے فرشتوں کو حکم دیا کہ جب تک وہ نماز پڑھے وہ اونٹوں کو چرائیں۔ جب آپ نے آدمی کی جنبش پائی تو نماز کو کوتاہ کر دیا اور سلام کہا۔ حضرت فاروق رضی اللہ عنہ نے جواب دیا اور پھر پوچھا تمہارا نام کیا ہے؟ انہوں نے جواب دیا میرا نام غلام ہے۔ حضرت فاروق رضی اللہ عنہ نے کہا کہ ہم سب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے غلام ہیں، میں تمہارا خاص نام پوچھتا ہوں۔ پھر آپ نے جواب دیا اویس۔ پھر فرمایا! اپنا دایاں ہاتھ دکھاؤ، انہوں نے دیکھا اور جو نشان حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بتایا تھا وہ دیکھ کر کہا حضور پرنور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تجھے سلام کہا ہے اور اپنا لباس مبارک تمہارے لئے بھیجا ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے وصیت فرمائی ہے کہ میری امت کے لئے دعا کرو۔ اویس رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ دعا کرنے کے لئے تم مجھ سے بہتر ہو۔ جناب فاروق رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ میں بس یہی کام کرتا ہوں تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وصیت بجالاؤ۔ اویس رضی اللہ عنہ نے کہا اے عمر رضی اللہ عنہ غور کرو کہ شائد وہ شخص سوائے میرے کوئی اور

ہو۔حضرت فاروق رضی اللہ عنہ نے کہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تمہارا نشان دیا ہے۔ پھر اویس رضی اللہ عنہ نے کہا اچھا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا لباس مبارک مجھے دو تا کہ میں دعا کروں۔فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے لباس مبارک ان کے سپرد کر دیا۔انہوں نے لے لیا اور کہا ذرا صبر فرمائیے۔پھر حضرت اویس رضی اللہ عنہ ان سے کچھ دور چلے گئے اور چہرہ کو زمین پر رکھ دیا اور کہا اے خدا میں اس وقت تک اس لباس کو نہیں پہنوں گا جب تک کہ تمام امت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بخش نہ دے گا کیونکہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو میرے حوالے کیا ہے اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم، فاروق رضی اللہ عنہ و مرتضی علیہ السلام سب نے اپنا اپنا کام کر لیا ہے، اب تیرا کام باقی رہ گیا ہے۔آواز آئی میں نے چند آدمیوں کو تیری خاطر بخش دیا ہے۔اویس رضی اللہ عنہ نے کہا جب تک سب کو نہ بخشے گا نہیں پہنوں گا۔پھر آواز آئی کہ چند ہزار میں نے بخش دیئے۔اویس رضی اللہ عنہ نے کہا میں سب کو چاہتا ہوں۔اویس رضی اللہ عنہ اسی طرح کہتے تھے اور اسی طرح سنتے تھے۔اس حالت میں فاروق رضی اللہ عنہ و مرتضی علیہ السلام ان کے سامنے گئے، جب اس نے ان کو دیکھا تو کہا کیوں آئے ہو؟ میں اس وقت تک لباس نہ پہنتا جب تک کہ تمام امت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بخشوا نہ لیتا۔

حضرت فاروق رضی اللہ عنہ نے اویس رضی اللہ عنہ کی گوڑری کو دیکھا تو اس گوڑری کے نیچے اٹھارہ ہزار عالم کے سیر دیکھے۔حضرت فاروق رضی اللہ عنہ کا دل اپنے سے اور خلافت سے پھر گیا اور کہا کون ہے جو مجھ سے خلافت کو ایک روٹی کے عوض خریدے؟ (یہاں جناب عمر رضی اللہ عنہ کا یہ قول غور طلب ہے کہ انہوں نے خلافت کو ایک معمولی شے جانا ہے جو کہ انمول نہیں ہے۔اس کے برعکس جو چیز انمول ہے وہ ولائت ہے۔چنانچہ یہ ماننا پڑے گا کہ ولایت مقام لامحدود سے تعلق رکھتی ہے اور خلافت مقام محدود سے) بہر حال اویس قرنی رضی اللہ عنہ نے جناب عمر رضی اللہ عنہ کو جواب میں کہا وہ خریدے گا جو عقلمند نہ ہو گا، پھینک دو تا کہ جو چاہوے اٹھا لے، خرید و فروخت کا اس میں کیا کام۔(تذکرۃ الاولیاء)

پھر اویس رضی اللہ عنہ نے لباس مبارک پہن لیا اور کہا کہ اللہ تعالیٰ نے اس لباس کے طفیل قبیلہ بنی ربیعہ اور مضر کی بکریوں کے بالوں کے برابر امت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم کو میرے لئے بخش دیا ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ بزرگان کے تبرکات دعاؤں میں وسیلہ ثابت ہوتے ہیں۔ اس کے بعد جناب علی علیہ السلام ایک طرف بیٹھ گئے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے کہا اے اویس رضی اللہ عنہ تو نے کیوں رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت نہ کی۔ اویس رضی اللہ عنہ نے کہا تم نے دیکھا ہے؟ آپ نے جواب دیا ہاں۔ اویس رضی اللہ عنہ نے کہا شائد تم نے ان کا جبہ مبارک دیکھا ہے اگر تم نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا ہے تو بتاؤ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے آبرو ملے ہوئے تھے یا نہیں؟ تعجب ہے کہ جناب فاروق رضی اللہ عنہ کو معلوم نہ تھا۔ پھر اویس رضی اللہ عنہ نے کہا تم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دوست ہو؟ انہوں نے جواب دیا ہاں۔ اویس رضی اللہ عنہ نے کہا اگر تم دوستی میں درست ہوتے تو اس دن جبکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دندان مبارک شہید ہوئے تھے تو تم نے کیوں موافقت کے طریق پر اپنے دانت نہ توڑ دیئے کیونکہ یہ شرط موافقت ہے۔ پھر آپ نے تمام دانت دکھائے جو سب ٹوٹے ہوئے تھے اور کہا میں نے بلا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھے ہوئے غیب کی حالت میں اپنے دانتوں کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی موافقت میں توڑ ڈالا کہ جب میں ایک دانت توڑتا تھا تو میرے دل کو قرار نہ آتا تھا، حتیٰ کہ ایک ایک کر کے میں نے اپنے سب دانت توڑ ڈالے۔ اس مقام پر بھی ہمیں ایمان مرید کا صحیح اندازہ ہوتا ہے کہ جو اپنی انتہا منزل پر ہے اور دیدہ دل سے رابطہ شیخ کی بہترین مثال ملتی ہے۔

بہرحال یہ سب کچھ سن کر فاروق رضی اللہ عنہ و مرتضیٰ علیہ السلام پر رقت طاری ہوگئی اور سمجھا کہ منصب ادب دوسری شے ہے۔ حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نہیں دیکھا ہے۔ کہا! ادب یہاں تک ہے اور ادب انہیں سے سیکھنا چاہئے۔ پھر حضرت فاروق رضی اللہ عنہ نے کہا کہ میرے لئے دعا کیجئے۔ اویس رضی اللہ عنہ نے کہا! ایمان میں رعایت نہیں میں نے دعا کی ہے اور ہر نماز میں تشہد کے وقت کہتا ہوں اے اللہ! مومن مرد اور مومنہ عورتوں کو

بخش دے۔ اگر تم قبر میں ایمان سلامت لے جاؤ گے تو دعا تم کو ڈھونڈے گی ورنہ میں دعا ضائع نہیں کرتا۔ پھر حضرت فاروق رضی اللہ عنہ نے کہا مجھے نصیحت کیجئے۔ اویس رضی اللہ عنہ نے کہا اے عمر رضی اللہ عنہ! خدا کو پہنچانتا ہے؟ حضرت فاروق رضی اللہ عنہ نے جواب دیا ہاں پہچانتا ہوں۔ کہا اگر اس کے سوا کسی اور کو نہ جانے تو تیرے لئے بہتر ہے۔ پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا ذرا ٹھہریئے تاکہ میں کوئی چیز تمہارے لئے لاؤں۔ اویس رضی اللہ عنہ نے اپنا ہاتھ جیب میں ڈالا اور دو دام باہر نکالے اور کہا کہ یہ میں نے شتربانی سے کمائے ہیں۔ اگر تو اس بات کی ضمانت دے کہ میں اس کے خرچ کرنے تک زندہ رہوں گا تو اور لے لینا۔ پھر کہا تمہیں تکلیف ہوئی واپس تشریف لے جایئے قیامت قریب ہے۔ وہ جگہ دیدار کی ہوگی اور پھر واپس نہ پھرنا ہوگا۔ کیونکہ میں اب قیامت کا زادراہ حاصل کرنے میں مشغول ہوں۔ حضرت فاروق رضی اللہ عنہ و مرتضی علیہ السلام واپس ہو گئے تو اویس رضی اللہ عنہ کی جگہ اور حرمت ظاہر ہوگئی اور ان کے درمیان عہد نہ رہا تو وہاں سے بھاگے اور کوفہ آ گئے اور پھر کسی نے نہ دیکھا۔ نقل ہے کہ اپنی عمر کے آخری حصے میں وہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے پاس آئے اور ان کی موافقت میں جنگ جمل میں لڑتے رہے۔ یہاں تک کہ شہید ہو گئے۔ (تذکرۃ الاولیاء)

یہ حضرت اویس رضی اللہ عنہ کے کلمات ہیں۔

"جس نے خدا پہچان لیا اس پر کوئی شے پوشیدہ نہ رہی۔ یعنی خدا کو خدائی سے پہچانا جا سکتا ہے۔ سلامتی تنہائی میں ہے اور تنہا وہ ہوتا ہے جو فرد ہو اور وحدت یہ ہوتی ہے کہ غیر کا خیال نہ کرے۔ ظاہری تنہا ٹھیک نہیں کیونکہ شیطان دو آدمیوں سے بھاگ جاتا ہے اور فرمایا! دل کو حاضر رکھو تاکہ غیر اس میں جگہ نہ پائے۔ اور فرمایا! میں نے بلندی طلب کی تو عاجزی میں پائی، میں نے سرداری کو چاہا تو اسے سچائی میں پایا، میں نے فخر کو ڈھونڈا اسے فقر میں پایا، میں نے بزرگی کو ڈھونڈا تو اسے عنایت میں پایا، میں نے بے پرواہی کو ڈھونڈا تو اسے توکل میں پایا۔"

اب اگر آخر میں آداب پیر و مرید کا خلاصہ پیش کرنا مقصود ہو تو اس کے لئے چند اہم نکات کو ذہن نشین کرنا ضروری ہوگا۔

آداب پیر

☆ ''موتو اقبل ان تموتوا'' سے ہو کر جو ''حتیٰ یاتیک الیقین'' کے درجے پر پہنچے وہی مرشد کامل ہے اور وہی بیعت لینے کا حقدار ہے۔

☆ کسی کو دنیا کے واسطے قبول نہ کرے۔

☆ مرید کے ظرف اور استطاعت کو پیش نظر رکھے۔

☆ مرید کو غیر ضروری آزمائش میں نہ ڈالے اور فوراً معاف کر دے۔

☆ مہربان اور شفیق ہو۔

☆ فرائض اور سنت کا تارک نہ ہو۔

آداب مرید

☆ خوب غور و فکر اور چھان بین کے بعد شیخ کا انتخاب کرے اور پھر ہر طرف سے نظر پھیرے۔ یک گیر اور محکم گیر پر عمل کرے۔

☆ شیخ کے امر کو بلا تحمل اور بغیر غور و فکر کے قبول کرے۔

☆ مرید کو یقین ہونا چاہئے کہ شیخ کا ہر امر مرید کے فائدہ میں ہے خواہ بظاہر فائدہ نظر نہ آئے۔

☆ مرید سب کچھ اللہ کی طلب میں چھوڑ دے اس کے بعد قصد اور پھر عمل کا مقام ہے۔

☆ مرید کو چاہئے کہ کم کھائے کم سوئے اور کم گفتگو کرے۔

★ اپنی کیفیت اور واردات کو چھپائے۔

☆ خلافت یا کسی درجہ کا خواہش مند نہ ہو۔

☆ اپنے سنگی بھائیوں کو اپنے سے بہتر سمجھے۔ ان سے حسد نہ کرے۔

☆ شیخ کی غیر حاضری میں بھی تصور کرے کہ شیخ سامنے ہے تا کہ برائیوں سے دور رہے۔

☆ اپنے سلسلہ کے علاوہ بھی باقی تمام سلسلوں کی تعظیم کرے۔

منازل سلوک

ہم نے اب تک سفر سلوک میں موجود دو اہم عناصر یعنی پیر اور مرید کی وضاحت کی ہے اور اب آخر میں ان کے باہمی ربط میں موجود ان منازل کی تفصیل بھی ضروری ہے کہ جو ایک مرید اپنے شیخ کی صحبت میں بتدریج طے کرتا ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ''سلوک'' سے کیا مراد ہے؟ تو اس ضمن میں حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ مکتوب نمبر ۱۸ میں اپنے پیر بزرگوار کی خدمت میں رقم کرتے ہیں۔

''کسی نے حضرت خواجہ بزرگ بہاؤالدین نقشبند قدس سرہ سے پوچھا کہ سلوک سے مقصود کیا چیز ہے؟ آپ نے فرمایا! تا کہ اجمالی معرفت تفصیلی معرفت کی شکل اختیار کرے اور علوم استدلالی، کشفی ہو جائیں۔ یہ نہیں فرمایا کہ ان کے سوا کچھ اور علوم حاصل ہو جائیں۔ ہاں یہ بات الگ ہے کہ راہ سلوک میں نسبت سے علوم و معارف رونما ہوتے ہیں جن سے گزرنا پڑتا ہے۔ جب تک نہایۃ النہایۃ تک جو مقام صدیقیت ہے کوئی نہ پہنچے ان علوم سے حصہ نہیں پا سکتا۔ کاش میں جان لیتا کہ بعض اہل اللہ اس بات کے قائل ہیں کہ انہیں یہ مقام شریف۔ حاصل ہو چکا ہے۔ حالانکہ فی الواقع انہیں اس مقام کے علوم و معارف سے کوئی مناسبت نہیں۔ تو وہ کس طرح اس کے قائل ہیں اور ہر علم والے سے او پر علم والا موجود ہے۔''

منازل سلوک کی تفصیل نکات کی صورت میں ذیل میں واضح کی گئی ہے۔

جس کو اللہ ہدایت دیتا ہے تو عالم اور کائنات کا ہر ذرہ اس کے لئے ہدایت کا ذریعہ بن جاتا ہے کیونکہ خالق کائنات پوری کائنات کو اس کی ہدایت پر صرف فرماتے ہیں کہ مقصد حیات اور مقصد کائنات ''لِيَعْبُدُوْنَ'' ہے جس کی تفسیر علامہ آلوسی نے ''لِيَعْرِفُوْن'' سے کی

ہے۔ معلوم ہوا کہ پوری کائنات کو زمین و آسمان، سورج و چاند، دریا و پہاڑ کو ہماری تربیت اور حصول معرفت اور حیات معرفت اور تکمیل معرفت کے لئے اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا ہے اور کائنات کا مقصد بزبان رسالت صلی اللہ علیہ وسلم بیان فرمایا۔

اِنّ الدّنیا خلقت لکم وانّکم خلقتم للاٰخرہ

''ساری دنیا تمہارے لئے بنائی اور تم کو ہم نے اپنے لئے بنایا تو عالم کا ذرہ ذرہ تمہارے لئے ہماری نشانی ہے''۔

عالم علم سے ہے اور علم کے معنی ہیں نشانی، عالم کو عالم اس لئے کہا جاتا ہے کہ اس کا ذرہ ذرہ اللہ تعالیٰ کی نشانی ہے۔ مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ سے جب شمس تبریزی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا کہ میں کچھ نہیں ہوں تو فرمایا کہ آپ لاکھ زبان سے کہئے کہ میں کچھ نہیں ہوں لیکن مجھ سے اپنے آپ کو آپ نہیں چھپا سکتے۔ پھر یہ شعر مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ نے شمس الدین تبریز رحمۃ اللہ علیہ کی شان میں پڑھا

بوئے مے را گر کسے مکنوی کند
چشم مست خویشتن را چوں کند

(اگر شراب پی کر کوئی اس کی بو کو الائچی اور پان کھا کر چھپا دے۔ لیکن اپنی مست آنکھوں کو کہاں سے چھپائے گا''۔

اللہ تعالیٰ جس کو اپنی محبت کی شراب راتوں کی تنہائیوں میں پلا دیتے ہیں۔ وہ دن میں اپنی آنکھوں کو کہاں چھپا سکتا ہے۔ فرمایا کہ آپ کی آنکھیں بتاتی ہیں کہ آپ صاحب نسبت ہیں۔ جب مجنوں اپنی لیلیٰ کی قبر کی مٹی سونگھ کر بتا سکتا ہے کہ یہاں لیلیٰ ہے جب کہ اس کو علم بھی نہیں تھا کہ لیلیٰ کو کہاں دفن کیا گیا ہے۔ اس سے خاندان والوں نے چھپایا تھا کہ کہیں پاگل قبر کھود کر لیلیٰ کو نکال نہ لے۔ لیکن جب اس کو کئی مہینے کے بعد محلّہ کے بچوں سے پتہ چلا تو اس نے پورے قبرستان کی ایک ایک قبر کی مٹی کو سونگھا۔ جب لیلیٰ کی قبر کی مٹی اس نے سونگھی تو اس نے اعلان کیا کہ یہیں لیلیٰ ہے۔ اور اس نے صحیح خبر دی اب مولانا روم

فرماتے ہیں:

ہمچوں مجنوں بو کنم ہر خاک

تا نیایم نور مولیٰ بے خطا

مثل مجنوں میں بھی جسم کی مٹی کو سونگھتا ہوں تو جس مٹی کے اندر میرا مولیٰ ہوتا ہے میں اس مٹی میں اپنے مولیٰ کے نور کو محسوس کرتا ہوں اور یقین سے بتا سکتا ہوں کہ یہ شخص اللہ والا ہے اگر مجنوں لیلیٰ کی مٹی کو سونگھ کر بتا سکتا ہے کہ یہاں لیلیٰ ہے تو جو مولیٰ کے عاشق ہیں جو مولیٰ کے مجنوں ہیں وہ بھی جسم کی مٹی کو سونگھتے ہیں ان کی باتیں سنتے ہیں اور چند منٹ میں بتا دیتے ہیں کہ اس کے دل میں کیا ہے۔

❖ حضرات! صفت بصارت کی کوئی حقیقت نہ ہوتی اگر بصارت کی قوت نہ ہوتی اور اسی طرح اس قوت کی بھی کوئی ظاہریت نہ ہوتی اگر دیکھنے کے لئے کوئی اعضاء نہ ہوتا، یعنی آنکھ۔ اس لئے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ تمام صفات اپنے آپ کو ظاہر کرتی ہیں۔ ایک قوت یا استعداد کے ذریعے اور اس قوت یا استعداد کو شرعی اصطلاح میں ''ملائکہ'' کہتے ہیں۔ اور ایک صوفی کی زبان میں اسے ''روح'' یا باطن کہتے ہیں۔ ''قوت، قابلیت یا استعداد'' کے نام استعمال کرنے والی جماعت فلسفہ دانوں کی جماعت ہے۔ یہ دنیا ہی اس ذات باری تعالیٰ کی صفات کی ظاہری شکل ہے ہر صفت نے ایک قوت یا استعداد کی شکل اختیار کر لی ہے اور پھر اس قوت نے اپنے آپ کو ایک حصہ یا اعضاء میں پوشیدہ کر لیا ہے کہ جس کا تعلق اس فطری دنیا سے ہے۔ چنانچہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ قوت کا تعلق ملکوت سے ہے اور صفات کا تعلق جبروت سے ہے۔ اس لئے یہ تمام عضو و آلے ان صفات کی ظاہریت ہیں۔ ایک کامل ماہر اپنی دیدہ عقل سے ذات باری تعالیٰ کی صفات کا اپنے اعضاء کے آئینہ میں مشاہدہ کرتا ہے اور پھر وہ خود ہی اس آئینہ میں ایک ایکٹر بن جاتا ہے۔ صوفیاء اس حالت کو ''قرب نوافل'' بیان کرتے ہیں اور اس میں سالک کا ہتھیار یا آلہ ''حق'' ہے۔ بعض اوقات یہ کامل ماہر اپنے آپ کو قوت یا استعداد تصور کرتا ہے اور ان اعضاء کو اللہ کا آلہ اور اللہ کو ایک ایکٹر یا

عامل۔ اس حالت کو'' قرب فرائض'' بیان کیا جاتا ہے۔

❖ فنا کی حالت میں ایک سالک کا محدود وجود اللہ کے لامحدود اور خالص وجود مطلقیت میں مغلوب ہو جاتا ہے۔ جس کی وجہ سے سالک اپنے آپ سے اور اپنے گرد و نواح سے لاتعلق اور بے خبر ہو جاتا ہے۔ اس کو مقام ولایت کہتے ہیں۔ مختلف اولیاء کے مابین جو درجات کا فرق ہوتا ہے اس کا انحصار اس کے مقام کے عرصے پر ہوتا ہے۔ کچھ اس مقام کو ایک منٹ کے لئے پاتے ہیں، کچھ ایک گھنٹے کے لئے، کچھ ایک دن کے لئے اور اسی طرح یہ مدت بڑھتی جاتی ہے۔ وہ جو اپنی ساری زندگی کے دوران اس مقام پر ہی رہتے ہیں ان کو مجذوب کہا جاتا ہے۔ اس دوران وہ ایک ایسے درجے کو پالیتے ہیں کہ جس میں وہ لامحدود ہو جاتے ہیں، اس کو بقا کہتے ہیں۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ اللہ کی بقا سالک کو حاصل ہو جاتی ہے۔ جیسا کہ بعض لوگ خیال کرتے ہیں۔ بلکہ سالک کی بقاء سے مراد صرف اس کی ظاہری حیات تک مقام لامحدود کا حصول ہے۔

حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ مکتوب نمبر ۶ میں اپنے پیرو بزرگوار کو کیفیت فنا و بقا بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ مجھے صحبت ذاتی سے محقق کر دیا گیا ہے کہ صحبت ذاتی فنا کی علامت ہے اور فنا ماسوائے اللہ کو بھول جانے کا نام ہے۔ تو جب تمام علوم سینے سے دور نہ ہو جائیں اور انسان جہل مطلق سے موصوف نہ ہو جائے فنا سے حصہ نہیں پا سکتا۔ اور یہ حیرت اور جہل دائمی ہے اس کے زوال کا امکان نہیں۔ اور نہ یہ بات ہے کہ کبھی زائل ہو جائے اور کبھی حاصل ہو جائے۔ غائیۃ درجہ وہ بات ہے کہ بقا سے پہلے محض جہالت ہوتی ہے اور بقا کے بعد جہالت اور علم دونوں جمع ہو جاتے ہیں۔ عین نادانی میں شعور ہوتا ہے اور عین حیرت میں شہود حاصل ہوتا ہے اور یہ فناالیقین کا مقام ہے جہاں علم اور عین ایک دوسرے کے لئے حجاب نہیں ہیں اور وہ علم جو اس کی جہالت سے پہلے حاصل ہوا ہوتا ہے وہ درجہ اعتبار سے ساکت ہے۔ اس کے ہوتے ہوئے اگر علم ہے تو اپنے میں ہے، اگر شہود ہے تو وہ بھی اپنے اندر ہے اور اگر معرفت یا حیرت ہے تو وہ بھی اپنے ہی اندر ہے۔ جب تک نظر باہر ہے بے

نتیجہ ہے اگر چہ اپنے اندر کی نظر ہو لیکن ادھر ادھر کی نظر کو بالکل منقطع کرنا ضروری ہے۔

حضرت خواجہ بزرگ بہاؤالدین نقشبند رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

''اہل اللہ فنا و بقاء کے بعد جو کچھ دیکھتے ہیں اپنے اندر دیکھتے ہیں اور جو کچھ پہچانتے ہیں اپنے اندر پہچانتے ہیں ان کو اپنے وجود میں حیرت ہوتی ہے۔ اس سے بھی صریحاً معلوم ہوتا ہے کہ شہود، معرفت اور حیرت یہ سب چیزیں صرف نفس میں ہیں باہر کہیں بھی نہیں۔ جب تک ان تینوں سے باہر ہے چاہے اپنے اندر ہی ہو فناء سے بہرہ ور نہیں ہو سکتا تو بقاء سے کیسے حصہ پا سکتا ہے۔ فناء اور بقاء کا نہایت مرتبہ یہی ہے اور یہ فناء مطلق ہے اور مطلق فناء عام ہے۔ بقاء، فناء کے اندازے کے مطابق ہوتی ہے۔ لہٰذا بعض اہل اللہ فناء اور بقاء سے موصوف ہونے کے باوجود باہر کا بھی مشاہدہ کرتے ہیں۔ لیکن ان حضرات نقشبندیہ قدس سرہم کی نسبت تمام نسبتوں سے اعلیٰ اور جدا ہے۔''

نہ ہر کہ آئینہ دار سکندری داند

نہ ہر کہ سر بترا شد قلندری داند

(یعنی) ہر آئینہ رکھنے والا سکندری کے اسرار و رموز سے واقف نہیں ہوتا اور نہ ہر سر تراشنے والا قلندری ہی جانتا ہے۔

❖ ایک انگریز صوفی رقم کرتا ہے۔

''میں ساحل سمندر کی سیر کے لئے گیا وہاں ایک دلکش منظر دیکھا۔ ایک کشتی سمندر میں تھی اور سمندر کشتی میں تھا''۔

یہاں پر لامحدود وجود سے مراد سمندر ہے اور محدود وجود سے کشتی اور یہ ذات باری تعالیٰ کے مقابلے میں ایک انسان کامل کی خوبصورت مثال ہے۔

اس لئے ایک مکمل ''عارف'' اللہ کا حقیقی آئینہ صفاتی ثابت ہوتا ہے۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ حقیقت صرف ایک مکمل ''عارف'' یا ''انسان کامل'' تک ہی کیوں محدود ہے

جبکہ اس کائنات کا ہر ایک ذرہ ایک آئینہ ہے کہ جو اس ذات باری تعالیٰ کی کسی نہ کسی صفت کی ضرور عکاسی کرتا ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ انسان تمام صفات کے لئے سب سے زیادہ مکمل اور بے نقص آئینہ ثابت ہوا۔ وہ ایک ایسی موٹی گہری تہہ رکھتا ہے کہ جس طرح آئینہ کے سامنے کھڑے ہونے والے کی واضح شکل دیکھنے کے لئے اس آئینہ کی پچھلی طرف ایک موٹی تہہ کا ہونا ضروری ہوتا ہے۔ فرشتے یا ملائک صرف صفات کی شوخی کو ظاہر کرتے ہیں اور یہ مادی چیزیں صرف اپنے اپنے ذاتی وجود کا اخفاپن اور گمنامی ظاہر کرتی ہیں۔ جبکہ انسان فرشتوں اور مادی چیزوں دونوں کی خصوصیات رکھتا ہے اور اس طرح سے وہ ایک باقاعدہ اور بے نقص آئینہ ہے۔

جیسا کہ مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

انسان تمام قسم کے حیوانات کا جنگل ہے مگر ملکوتی صفات بھی اس میں مضمر ہیں۔ عصر حاضر کے ماہرین حیاتیات از روئے تخلیق اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ انسان ابتدائے آفرینش سے موجودہ صورت تک تمام حیوانی مراحل سے گزرا ہے اور کروڑوں برس کے اس ارتقاء کی تاریخ رحم مادر کے اندر نو مہینوں میں بسرعت دہرائی جاتی ہے۔ انسان نا تمام حشرات الارض، بہائم اور دام و در کا جامع ہے اس کے ضمیر خمیر میں چوہے بھی ہیں، بھیڑیئے بھی ہیں، پسو بھی ہیں۔ مولانا فرماتے ہیں کہ یوں سمجھ لو کہ انسان ایک بہت وسیع اور گھناؤنا جنگل ہے جس میں سب قسم کے حیوان موجود ہیں۔ مگر ساتھ ہی ساتھ ملائکہ کی صفات ملکوتی کا جوہر بھی اس میں پایا جاتا ہے۔ انسان کی حقیقت یہ ہے۔

آدمی زادہ طرفہ معجو نیست
از فرشتہ سرشتہ وز حیوان
گر کند میل ایں شود بہ ازیں
در کند قصہ آں شود بہ رزاں

❖ ایک شاعر کہتا ہے

علم حق در علم صوفی گم شود
ایں سخن کے باوری مردم شود

(یعنی اللہ کا علم ایک صوفی کے علم میں گم ہو جاتا ہے، عام لوگ اس کو کس طرح سمجھ سکتے ہیں)۔

اس علم کی ابتداء خالق اور تخلیق کے باہمی تعلق سے ہوتی ہے اور پھر اس تعلق کا علم جب اپنی انتہاء کو پہنچتا ہے تو یہ ایک صوفی یا درویش میں گم ہو جاتا ہے اور اس مقام کا حصول اس وقت ممکن ہے کہ جب خود بھی صوفی ''علم مطلق'' میں گم ہو جاتا ہے۔یعنی دونوں کا ایک دوسرے میں گم ہونا لازم وملزوم قرار پاتا ہے۔پنسلین کے موجد سر ایلیگز ینڈر فلیمنگ سے جب ایک شخص نے سوال کیا کہ وہ کون سا راز ہے جس کی بناء پر وہ ایک ایسی دوا تیار کرنے میں کامیاب ہو گیا جس سے کروڑوں بنی نوع انسان کو شفا نصیب ہوئی؟ تو اس نے جواب دیا۔

''میں ہر وقت اپنی لیبارٹری میں مست رہتا ہوں۔بالکل اسی طرح کہ جس طرح ایک درویش اپنی گدڑی میں مست رہتا ہے۔فرق صرف یہ ہے کہ وہ اپنے ناچ اور مستی سے علم الٰہی حاصل کرتا ہے اور میں اپنی مستی اور ناچ سے علم طب۔''

❖ لا الہ الا اللّٰہ (اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں) سالک کے وجود کے سوا کوئی اور وجود نہیں ہے۔یہ اولیاء کا عقیدہ اور دھرم ہے۔

اب آپ اس یقین کے ساتھ خیال کریں کہ یہ وجود ''حق مطلق'' کا وجود ہے۔

پھر اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے۔

''میں ہی ہوں اور میرے سوا کوئی نہیں۔'' (النحل:2)

پھر ارشاد ہوتا ہے۔

''میرے سوا کوئی وجود نہیں۔''

تو ان تمام نادر ظہور میں صرف سچ اور حق ہی کی حقیقت پنہاں ہے۔چینی یا شکر سے ہی

مٹھاس کی مختلف صورتیں یا اشیاء بنتی ہیں۔ لیکن جب آپ ان میٹھی چیزوں کو نگل جاتے ہیں تو ان چیزوں کی کوئی شکل نہیں رہتی بلکہ صرف مٹھاس ہی منہ میں رہ جاتی ہے۔ یہی حالت ایک کامل انسان کی ہوتی ہے کہ جب وہ مختلف اشیاء کی بناوٹوں کا بغور جائزہ لیتے اور اسے محسوس کرتے ہیں تو بعد میں جو ان سب کی اصل حقیقت نکلتی ہے وہ نور ہی ہوتی ہے اور جب وہ کامل انسان اپنی حقیقت کو محسوس کرتا ہے تو تب بھی اس کو اسی ذات باری تعالیٰ کی مطلقیت اپنے میں پنہاں نظر آتی ہے اور اس طرح وہ اللہ کے وجود مطلق کو اپنا وجود تصور کرتا ہے۔

اس ضمن میں حضرت مجدد پاک رحمۃ اللہ علیہ، مکتوب نمبر ۱۵ میں اپنے مرشد بزرگوار کو لکھتے ہیں۔

"عرض یہ ہے کہ مدت دراز تک میں مالک حقیقی کی تلاش کرتا رہا مگر اس کے باوجود میں نے اپنے آپ ہی کو پایا۔ اس کے بعد میرا کام اس مقام کو پہنچا کہ اگر میں نے اپنی تلاش کی تو پھر بھی میں نے بجائے اپنے، مالک حقیقی ہی کو پایا۔ اب اپنے کو گم کر چکا ہوں اور اپنے آپ کو ہی پاتا ہوں اور اپنے کو گم کرنے کے باوجود اس کا متلاشی نہیں رہا اور مطلوب حقیقی کے فقدان کے باوجود اس کا محو نہیں۔ اپنی ذات کو علم کے لحاظ سے حاضر پانے والا اور رجوع کرنے والا اور ذوق کے لحاظ سے غایت گم کرنے والا اور اعراض والا جانتا ہے۔ (میرا ظاہر بقا اور باطن فنا ہے۔ عین بقا میں فانی ہے اور عین فنا میں باقی۔ لیکن فنا علمی ہے اور بقا ذوقی ہے)"

❖ شرک (یعنی اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرانا۔ یا تو عبادت میں یا اس کی محبت میں یا الوہیت میں اور یا اس کے وجود میں) کی دو اقسام ہیں۔

☆ شرک کی پہلی قسم "جلی"

☆ شرک کی دوسری قسم "خفی"

شرک خفی نہایت ہی خفیف سا ہوتا ہے کہ جس طرح ایک سیاہ پتھر پر ایک سیاہ چیونٹی رینگتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ یہ شرک یا تو اس کی مطلقیت میں ہوتا ہے یا صفات میں اور یا

پھراس ذات کے کاموں میں۔

سورۃ یوسف میں ارشاد ہوتا ہے۔

''اوران میں زیادہ تر اللہ پر یقین نہیں رکھتے مگر شرک کرتے ہیں۔''

(یوسف:106)

تمام عابد پارسا انسان جو یہ کہتے ہیں'' اللھم انت ربی و انا عبدک'' (اے اللہ تو نے ہی خالق کوشکل دی اور میں تخلیق ہوں) وہ سب اس شرک خفی میں مبتلا ہیں۔شرک کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا کی'' اے اللہ! میں تیری پناہ مانگتا ہوں شرک سے'' تمام اوچھے اور برے کام شرک ہی ہیں کہ جب تک آپ ذات باری تعالیٰ میں اپنے آپ کی نفی نہ کریں آپ اس وقت تک شرک سے آزاد نہیں ہوسکتے۔'' لا الہ الا اللّٰہ ''یعنی اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں شرک کی نفی کرتا ہے اور توحید کا اثبات کرتا ہے۔

❖ ایک ''ملحد'' وہ ہوتا ہے کہ جو اپنے آپ کو شریعت اور طریقت سے علیحدہ کر لیتا ہے اور علم اورادراک کو بنیاد بنا کر اور عقل وفراست کے اسباق پر بات کر کے راضی ہوتا ہے۔

دوسرا'' مواحد'' ہوتا ہے جو'' حال'' کی کیفیت کو پالیتا ہے اور اس کی نظروں کے سامنے صرف وہی حقیقی وجود رہتا ہے اور وہ ابھی بھی شریعت کے کسی نقطہ سے بے خبر نہیں ہوتا سوائے اس وقت کے کہ جب وہ'' حال'' سے مغلوب ہوجاتا ہے۔

یہ جو آخری مقام میں نے بیان کیا ہے یہ صرف چند ایک اہل قسمت اور اہل نصیب کو حاصل ہوتا ہے کہ جس میں سالک اس ذات باری تعالیٰ کے وجود مطلقیت میں اس طرح کھو جاتا ہے کہ اس کو اپنا ہی وجود حق لگتا ہے اور وہ اپنے آپ کو ہی حق کہنا شروع کر دیتا ہے کہ جو بظاہر شریعت کے منافی لگتا ہے اس لئے یہ مقام اہل علم کی سمجھ سے باہر ہے لیکن اہل دل کو یہ مقصود ہے۔

❖ کفراور اسلام دونوں ہی کی دوقسمیں ہیں۔

❖ تشبیہی یا ظاہر کفراور حقیقی کفر

❖ تشبیہی، ظاہری اسلام اور حقیقی اسلام

ظاہری کفر سے ہم سب اچھی طرح واقف ہیں۔ یعنی سچ اور حق کو اس طرح چھپانا کہ جس طرح ایک کسان زمین میں بیج کو چھپاتا ہے۔ حقیقی کفر سے مراد سالک کا نفس ہے یعنی کہ حق کو اپنی خود بینی اور خود پرستی کے پردے میں چھپا دینا۔ ظاہری اسلام سے مراد صرف شریعت کے قوانین کا جائزہ لینا ہے اور حقیقی اسلام سے مراد ''فنا'' کے بعد ''بقا'' کا حصول ہے۔

❖ در پس آئینہ طوطی صفتم دشت آند
ہرچہ استاد ازل گفت ہم ان میں گوئم

(یعنی) '' آئینہ کے پیچھے میں ایک طوطی کی طرح رکھ دیا گیا ہوں جو بھی میرا ابدی مالک مجھے کہتا ہے میں اس کو دہراتا ہوں۔''

یہاں پر آئینہ سے مراد جسم لیا گیا ہے کہ جس کے پیچھے ایک نفس کارفرما ہے۔ جب ایک سالک اپنے وجود کو بے وجود میں بدلتا ہے تو اس کی تمام حرکات وسکنات اللہ تعالیٰ کی ہو جاتی ہیں۔

اس لئے سورۃ انفال میں ارشاد ہوتا ہے۔

''اور اے محبوب وہ خاک جو تم نے پھینکی تم نے نہ پھینکی بلکہ اللہ نے پھینکی۔''

(انفال:17)

❖ فکر کی تین اقسام ہیں۔

☆ دنیا کے معاملات میں فکر کرنا۔

☆ جنت وجہنم کے بارے میں فکر کرنا۔

☆ اور اس ذات باری تعالیٰ اور اس کی صفات پر فکر کرنا۔

یہ جو فکر کی آخری قسم ہے اس کے بارے میں کئی مقامات پر ارشادات ملتے ہیں کہ ''ایک لمحہ کی فکر الٰہی دونوں جہانوں سے بڑھ کر ہے'' اس مقام پر آپ کے لئے ضروری ہے

کہ چیزوں کے متفرق پن کا اللہ کی مطلقیت کے طور پر تصور کریں اور اس کے لئے اس متفرق پن کا آنکھوں سے اوجھل ہونا ضروری ہے تاکہ ان چیزوں کی متضاد خاصیتوں کے متفرق پن کو اللہ کی صفات کے طور پر جانا جا سکے اور ان اشیاء کی کارکردگی کو اللہ کی کارکردگی جانا جا سکے اسے ''وحدت'' کہتے ہیں کہ جس میں دوسرا نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔ اس کے حصول کا طریقہ درج ذیل ہے۔

سب سے پہلے اپنے آپ کو اس ذات کی حقیقت تصور کیجئے۔ ''میری ذات اللہ کی صفات ذات'' پھر یہ اس طرح آگے منتقل ہو جائے کہ ''میری صفات اللہ کی صفات ہیں'' اور پھر مزید آگے اس طرح منتقل ہو ''میرا عمل اللہ کا عمل ہے'' یہاں تک یہ عمل منتقلی یا ''نزول'' کے ذریعے پہنچتا ہے۔ اس کے بعد یہ عمل اوپر کی جانب بڑھتا ہے۔ یعنی ''عروج'' کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ ''میرا عمل اللہ کا عمل ہے، میری صفات اللہ کی صفات ہیں، میری ذات اللہ کی صفاتی ذات ہے'' پھر نزول کا عمل دوسری مرتبہ شروع ہوتا ہے اور یہ منتقلی کا سلسلہ اللہ کے ساتھ ہے۔ یہاں تک پہنچ کر سالک اپنے مقصد کو پا لیتا ہے جب سالک پہلی بار ''نزول'' کی منزل سے گزر کر ''عروج'' کی منزل کو یاد کرتا ہے تو وہ تمام ''فنا'' حاصل کر لیتا ہے اور جب وہ دوسری بار منزل ''نزول'' سے گزر جاتا ہے تو مقام ''بقا'' کو حاصل کر لیتا ہے۔ جب سالک منازل ''عروج'' میں ہوتا ہے تو اس کا عمل، صفات اور ذات صفاتی بالترتیب اللہ میں کھو جاتی ہیں اور منازل ''نزول'' میں اللہ کا عمل ہے۔ صفات اور ذات صفاتی بالترتیب اللہ میں کھو جاتی ہیں اور منازل ''نزول'' میں اللہ کا عمل ہے۔ صفات اور ذات صفاتی سالک میں بالترتیب اپنے آپ کو ثابت کرتی ہیں۔

اس ضمن میں حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ مکتب نمبر ۲۴۴ میں میر محمود نعمان کو تحریر کرتے ہیں۔

''اللہ تعالیٰ کے فضل سے جب سالک اپنے اصول پر کہ جس کا وہ خود ظل ہے عروج کرتا ہے تو ہر ایک اصل میں اول اس کو فنا ہوتی ہے اور پھر اسی میں (عروج

کے بعد نزول میں) بقا نصیب ہوتی ہے اور پھر جب اس اصل کی اصل میں عروج کرتا ہے کہ اس دوسری اصل کی اصل اول ظل ہے تو اس میں بھی فنا اور بقا نصیب ہوتی ہے اور جب دوسری اصل سے تیسری اصل میں ترقی ہوتی ہے جو دوسری اصل تیسری اصل کا ظل ہے تو اس تیسری اصل میں بھی سالک کو بقا و فنا حاصل ہوتی ہے اور سالک ہر مقام کو جو اوپر کے مقام کا ظل ہے اصل سمجھتا رہے گا۔ جب سالک ان مقامات میں فناء تام اور فناء اکمل سے مشرف ہو جائے گا تو تمام جہاں مثال قطرہ کے اور شخص مثال دریا کے ہو جائے گا۔ علیٰ ہذا مقامات اعلیٰ میں جس کو جس قدر عروج نصیب ہوگا اس کے مقابلے میں نیچے مقامات والے کی نسبت بھی دریا اور قطرہ کی طرح ہوگی۔"

ایک اور مقام پر اپنے پیر بزرگوار کو اپنی سلوک کی منازل سے آگاہ کرتے ہوئے مکتوب نمبر ۷ میں فرماتے ہیں۔

"کم ترین غلام احمد کی عرضداشت یہ ہے کہ وہ مقام جو عرش سے اوپر تھا یہ ناچیز اپنی روح کو بطریق عروج اس مقام میں پاتا تھا اور وہ مقام حضرت خواجہ بزرگ (خواجہ بہاؤالدین نقشبند رحمۃ اللہ علیہ) کے ساتھ خاص تھا۔ ایک زمانہ کے بعد اپنے بدن عنصری کو بھی اسی مقام پر پایا اور اس وقت خیال میں یوں گزرا کہ تمام عالم عنصریات و فلکیات نیچ کو چلا گیا ہے اور اس کا کوئی نام و نشان نہیں رہا۔ اور جبکہ اس مقام میں صرف بعض اکابر اولیاء تھے اب تمام عالم کو اپنے سمیت اس میں پا کر حیرت ہوتی ہے کہ مکمل بیگانگی کے باوجود اپنے آپ کو ان کے ساتھ پاتا ہوں۔ الغرض وہ حالت جو کبھی کبھی رونما ہوتی تھی اور اس میں بندہ نہ اپنے آپ کو دیکھتا تھا نہ جہاں کو، نہ نظر سے کچھ دیکھتا اور نہ علم میں کوئی چیز تھی۔ وہ حالت اب دائمی ہو چکی ہے اور خلقت عالم کا وجود دید و دانش سے باہر ہو چکا ہے۔"

اس کے بعد اس مقام میں ایک بلند محل ظاہر ہوا کہ اس کو سیڑھیاں لگی ہوئی ہیں۔ بندہ

ان سیڑھیوں سے باہر آیا اس کے بعد وہ مقام بھی باقی جہاں کی مانند آہستہ آہستہ، لحہ لحہ نیچے چلا گیا اور فقیر نے اپنے آپ کو بلندی پر پایا۔ بندہ اتفاق سے تحیۃ الوضو کے نفل ادا کر رہا تھا کہ ایک بہت ہی اونچا مقام نمایاں ہوا اور چار اکابر نقشبند کو اس مقام میں دیکھا اور دوسرے مشائخ بھی جیسے سید الطائفہ جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ کو اسی مقام میں پایا اور بعض دور سے مشائخ اس کے اوپر کے مقام میں ہیں۔ لیکن ان کے پائے پکڑے بیٹھے ہوئے ہیں اور بعض نیچے میں اپنے اپنے درجات کے مطابق اور اپنے آپ کو ان سے بہت دور پایا بلکہ ان سے کچھ نسبت ہی نہ دیکھی۔ اس واقعہ سے سخت پریشان اور اضطراب ہوا، قریب تھا کہ دیوانہ ہو جاؤں اور غم وغصہ کی زیادتی سے جسم کو ہی خالی کر دے۔ کچھ وقت ایسے ہی گزرا آخر آپ کی توجہات سے اپنے آپ کو بھی اس مقام کے مناسب پایا۔ پہلے میرا سر اس مقام کے برابر ہوا پھر بتدریج اوپر بلند ہوتا گیا اور اس مقام بلند میں بیٹھ گیا۔ توجہ کے بعد یوں دل میں گزرا کہ وہ مقام تکمیل تام کا مقام ہے کہ تمام سلوک طے کرنے کے بعد اس مقام پر پہنچتے ہیں۔ سلوک پورا نہ کرنے والے مجذوب سالک کو اس مقام سے حصہ نہیں مل سکتا اور اس وقت یہ بھی خیال گزرا کہ اس مقام پر پہنچنا اس واقع کے نتائج سے ہے جو حضور کی خدمت میں رہنے کے زمانے میں دیکھا تھا اور خدمت اقدس میں عرض بھی کیا تھا کہ حضرت علی کرم اللہ تعالیٰ وجہہ تشریف لائے اور فرمایا کہ "میں تجھے آسمانوں کا علم سکھانے آیا ہوں۔" جب خوب توجہ سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ تمام خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم میں سے یہ مقام حضرت علی علیہ السلام سے خاص ہے۔

❖ گلشن راز کہتے ہیں۔

(یعنی) جو حقیقی کفر کی ایک جھلک کو بھی پاتا ہے تو وہ ظاہری اسلام سے منحرف ہو جاتا ہے۔

ظاہری اسلام قوانین کا مشاہدہ کرنے پر مشتمل ہے اور حقیقی اسلام اپنے آپ کو معدوم اور بجھا لینے پر مشتمل ہے۔ ظاہری اسلام اس طرح ہے کہ جس طرح کسی بت پرستی کا مشاہدہ کیا جائے اس لئے اس کے صوفی کا کوئی دھرم نہیں ہوتا سوائے "حق" کے۔ ظاہری کافر اور

ظاہری مومن صرف اپنے ظاہر کے تزکیہ نفس میں لگے رہتے ہیں۔ جبکہ صوفی وہ ہوتا ہے جو اپنے آپ کو اس سے آزاد کر لیتا ہے۔

❖ اپنی غربت کا اللہ کے سامنے اظہار کرنا اس سے شکایت کرنا ہے۔ ایک غلام کو اپنے مالک کے سامنے شکایت کرنے کی اجازت نہیں ہوتی۔ شتری (یہ وہ صوفیاء کی جماعت ہے جو اپنے میں کچھ "میں" برقرار رکھنے کی قائل ہے اور مقام فنا سے اپنے آپ کو دور رکھتی ہے) شکایت نہیں کرتے، وہ کھا لیتے ہیں جو بھی انہیں ملتا ہے۔ اس چیز کو مدنظر رکھتے ہوئے کہ عطا کرنے والا کون ہے (یعنی کہ انحصار کرتے ہیں) اس لئے "وجود" کا مشاہدہ کرنا "توکل" یعنی انحصار کرنے سے بہتر ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک فقیر "فنا" میں اپنے وجود کو اللہ کے وجود صفاتی میں گم پاتا ہے اور اپنی حقیقت کو اللہ ہی کی مطلقیت تصور کرتا ہے۔ اسی لئے وہ اپنے آپ کو بھی دنیا کا مالک تصور کرتا ہے اور ایسی کوئی چیز نہیں ہوتی جو اس فقیر کو اس جائیداد کو استعمال کرنے سے روک سکے۔ یعنی کہ اس دنیا کی کل جائیداد۔ کیونکہ وہ فنا میں اپنے آپ کو کسی پر انحصار کرنے (جیسا شتری کرتے ہیں) سے آزاد تصور کرتا ہے۔

جیسا کہ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

"دنیا دار، دنیا کے پیچھے دوڑ رہے ہیں اور دنیا اہل اللہ کے پیچھے۔"

اوپر کی گئی وضاحت کا نچوڑ فقط یہ ہے کہ اللہ دین و دنیا کو ان پاک نفوس کے حوالے کر دیتا ہے کہ جو اپنے نفس کو اللہ کی یاد میں "فنا" کر دیتے ہیں۔

جیسا کہ قرآن مجید (سورۃ توبہ) میں ارشاد ہوتا ہے۔

"بے شک اللہ نے مسلمانوں سے ان کے نفوس اور اموال خرید لئے ہیں اس بدلے پر کہ ان کے لئے جنت ہے۔" (توبہ:111)

منازل سلوک کے دوران آپ کو اپنی نظروں کے سامنے سے "غیر" کا تصور مٹا دینا ہوگا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہاشم کے گھر سے جو ایک انصار تھا، کھجوروں کا گچھا مانگا۔ جو یہ بھی ظاہر کرتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بغیر کسی جھجک کے "غیر" کا

تصور مٹاتے ہوئے کھجور مانگیں۔ اسی طرح منازل سلوک میں بھی اللہ کو ''غیر'' کے تصور کے بغیر جاننا ہوگا اور اس کو اپنے باطن سے محسوس کرنا ہوگا تا کہ مانگتے وقت یا حاصل کرتے وقت کوئی جھجک نہ رہ جائے۔ اس مقام پر ہمیں یہ زیب نہیں دیتا کہ ہم مانگتے وقت معاملات کو الجھائیں۔

امام مالک نے ایک دفعہ ایک فقیر کو تحفہ بھیجا لیکن فقیر نے اس کو یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ ''میں اللہ کے سوا کسی سے کچھ نہیں لیتا'' مالک نے جب یہ سنا تو ایک کاغذ پر سورۃ الحدید کی یہ آیت لکھ کر بھیجی ''اللہ کی پاکی بولتا ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے'' اور پھر لکھا کہ اگر اللہ کا یہ فرمان کہ ہر چیز میں اس کی جھلک ہے اور یہی حق ہے تو کیا مالک کے اندر اس کی گنجائش نہیں۔ مالک کے کہنے کا مقصد یہ تھا کہ دینے اور لینے والی صرف اللہ ہی کی ذات ہے۔ لیکن وہ اپنے بندوں کو دینے اور لینے کا ذریعہ بناتا ہے اور جو اپنے رب کو پالیتا ہے اللہ اس کو اپنا بہترین ذریعہ بناتا ہے۔ اس لئے مجاہدہ کرنا تو بچوں کا کھیل ہے اور اپنے رب کو تلاش کرنا ہی اصل میں مرد کی جنگ ہے۔

❖ شریعت میں اپنی ذات کے لئے مرجانے سے مراد گناہوں اور اپنی خواہشات نفسانی سے باز رہنا ہے۔ یعنی فنا میں وہ اپنی خواہشات سے باز رہتے ہیں، بقا میں وہ اس کی صفات کو شمار کرتے اور جانتے ہیں۔ ''طریقت'' میں اس مرجانے سے مراد برے خیالات (برے خیالات اور نفسانی خواہشات میں فرق ہے) سے باز رہنا اور اپنے آپ کو نیک اور اچھی خوبیوں کا مالک بنانا ہے۔

جیسا کہ حدیث میں آتا ہے۔

''اللہ کی صفات کو حاصل کرو۔''

چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان ان لوگوں کے بیان کو رد کرتا ہے جو یہ کہتے ہیں کہ بزرگان کا مقام ''بقا'' کوئی حیثیت رکھتا اور یہ کہ اللہ کا حصول ایک بشر کے لئے ناممکن ہے۔ حقیقت میں مرجانا یہ ہے کہ انسان اپنی ''میں'' کو بازرکھے یا یوں کہئے کہ اپنی ذات کو

اپنے ہی لئے گم کردے اور یہ اوپر بیان کی گئی دونوں حالتوں سے زیادہ مشقت طلب ہے۔ کیونکہ یہ آسانی سے کوئی مستقل شکل نہیں اپنا سکتی۔ اس لئے کہ یہ ''فنا'' کی حالت ہے۔

حضرت جعفر صادق رضی اللہ عنہ نے بھی ان حالتوں کی وضاحت کچھ اس طرح کی ہے۔

''مومن وہ ہے جو اپنے نفس کے ساتھ مقابلہ کرے اور عارف وہ ہے جو اپنے خدا تعالیٰ کے ساتھ قائم رہے اور فرمایا کہ جو شخص نفس کو نفس کے لئے مجاہدہ میں ڈالتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کی کرامات تک پہنچ جائے گا اور جو شخص مجاہدہ خدا کے لئے کرتا ہے وہ خدا تک پہنچ جائے گا۔''

پہلی دونوں صورتوں میں کچھ کی گئی محنت اور کوشش خود اپنا صلہ اپنے ساتھ لے کر آتی ہے اور جو کوئی بھی ان دونوں صورتوں میں سے کسی ایک یا دونوں کے لئے کوشش کرتا ہے تو وہ اپنے مقصد کو پالیتا ہے اور تیسری صورت خالصتاً اللہ تعالیٰ کا صلہ اور انعام ہے اور ایک کامل پیر کی رہنمائی سے حاصل ہوتی ہے۔ صرف اپنے اعمال سے اپنے مقصد میں کامیاب ہونا اور مجاہدہ کرنا ہی ایک نہایت مشکل امر ہے۔

جیسا کہ سورۃ الجمعہ میں ارشاد ہوتا ہے۔

''یہ اللہ کا فضل ہے جسے چاہے عطا کرے۔'' (جمعہ:4)

بعض نے ''اپنی ذات کے مر جانے'' کا تجزیہ اس کو اس کی زندگی کہہ کر کیا ہے۔ جیسا کہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ اپنے اوپر اللہ کے اس فضل کو بیان کرتے ہیں کہ ان کو یہ شریفی و بزرگی ایک مرگِ شہزادہ کے تجزیہ سے حاصل ہوئی ہے۔

حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ وہ روم گئے اور وہاں کے وزیر سے ملاقات ہوئی۔ تھوڑی دیر اس کے پاس بیٹھے تو وزیر نے کہا ہم ایک جگہ پر جا رہے ہیں کیا آپ ہمارے ساتھ چلیں گے؟ آپ نے فرمایا ہاں چلوں گا۔ اس نے حکم دیا کہ ایک گھوڑا، حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کے لئے لایا جائے اور پھر گھوڑوں پر سوار ہو کر صحرا

کی طرف روانہ ہو گئے۔ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نے ایک خیمہ دیکھا جو دیبائے رومی کا بنا ہوا تھا اور اس کی طنابیں ریشمی تھیں اور میخیں سونے کی تھیں اور اس کے گرد مسلح سپاہی دیکھے جو خیمہ کے گرد پھرتے تھے اور کچھ کہتے تھے اور چلے جاتے تھے۔ اس کے بعد چند بوڑھوں کو دیکھا وہ بھی اسی طرح کر کے چلے گئے پھر فلسفیوں کو دیکھا جن کی تعداد چار سو تھی وہ خیمہ کے گرد پھرتے اور اسی طرح کہتے تھے۔ اس کے بعد دو سو ماہ رو کنیزوں کو دیکھا اور ہر ایک کے سر پر سونے کے جواہرات سے بھرا ہوا ایک طبق تھا۔ وہ بھی خیمہ کے پاس آئیں اور کچھ کہہ کر چلی گئیں اس کے بعد قیصر (بادشاہ) اور وزیر خیمہ میں داخل ہوئے اور کچھ کہہ کر چلے گئے۔ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ میں حیران ہو گیا اور کہا کہ یہ کیا معاملہ ہے؟ وزیر سے دریافت کیا تو اس نے کہا قیصر (بادشاہ) کا ایک نہایت خوبصورت لڑکا تھا جو نہایت عالم اور بہادر تھا، باپ ہزار جان سے اس پر فدا تھا۔ لیکن وہ بیمار ہو گیا، طبیبان حازق اس کے علاج سے عاجز آ گئے اور آخر کار وہ فوت ہو گیا، اسے اس خیمہ میں دفن کیا ہے اور اب سال بھر میں ایک دفعہ اس کی زیارت کو آتے ہیں۔ اول جو لشکر گراں تم نے اس خیمہ کے گرد دیکھا ہے وہ کہتے ہیں کہ اے شہزادے! یہ حالت جو اس وقت تجھ پر واقع ہو گئی ہے اگر وہ جنگ سے رفع ہو جاتی تو ہم جان بھی فدا کر دیتے اور تجھے چھڑا لیتے، یہ حالت اس کی پیدا کی ہوئی ہے جس کے آگے کوئی ایک دم بھی (اس کی اجازت کے بغیر) نہیں مار سکتا۔ پھر فلسفی اور بزرگ آتے اور کہتے ہیں اے شہزادے! اگر عقل مندی اور دانائی سے یہ حالت رفع ہو سکتی تو ہم اپنی پوری طاقت خرچ کر دیتے اور تجھ کو اس حالت سے بچا لیتے۔ اس کے بعد پیران محترم آتے ہیں اور کہتے ہیں اے شہزادے! اگر شفاعت اور زاری سے تجھے بچایا جا سکتا تو ہم ضرور تجھے بچا لیتے۔ پھر اس کے بعد خوبصورت لونڈیاں جواہرات سے بھرے ہوئے طبقوں کے ساتھ آتی ہیں اور کہتی ہیں کہ اے بادشاہ زادے! اگر مال و جمال سے تجھ کو خرید سکیں تو اپنے آپ کو تجھ پر فدا کر دیتیں۔ لیکن یہ حالت اس کی پیدا کی ہوئی ہے کہ اس کے سامنے مال و جمال کی کوئی حقیقت نہیں۔ پھر قیصر (بادشاہ) اپنے وزیر کے ہمراہ آتا ہے

اور کہتا ہے اے جان پدر! باپ کے ہاتھ میں کیا ہے؟ تیرے لئے لشکر گراں لایا ہوں، فلسفی، بزرگ، خوبصورت لونڈیاں اور طرح طرح کے مال ونعمت لایا اور خود بھی آیا ہوں اگر اس تدبیر سے یہ حادثہ رفع کرنا ممکن ہوتا تو میں سب کو تیرے کام میں لاتا اور جو کچھ بھی مجھ سے ہوسکتا کرتا لیکن یہ حالت اس کی پیدا کی ہوئی ہے کہ تیرا باپ اور جو کچھ بھی اس عالم میں ہے سب کچھ اس کے قبضہ قدرت میں عاجز ہیں۔ آئندہ سال تک تجھ پر میرا اسلام ہو۔ یہ کہتا ہے اور واپس ہو جاتا ہے۔

حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ان باتوں نے میرے دل پر ایسا اثر کیا کہ میرا دل کاروبار سے اچاٹ ہو گیا اور واپس بصرہ آ گیا اور پھر قسم کھائی کہ پھر دنیا میں نہیں آؤں گا اور اس طرح اپنے آپ کو مجاہدہ نفس اور عبادت میں ڈالا کہ جس کو ''مرگ نفس'' کہا گیا ہے۔ جبکہ شتری اس قسم کی موت کے فلسفہ پر یقین نہیں رکھتے۔ ان کے مطابق اصل موت یہاں پر پہلے سے موجود ہے کہ جب آدم اپنی دنیاوی زندگی کو مکمل کر لیتا ہے اور اس کے علاوہ اور کوئی ایسی موت نہیں ہے کہ جو انسان کو اس کی جستجو سے ملتی ہے۔ جیسے کہ منزل ''فنا'' یا ''بقا''۔ بہر حال یہ ان کا عقیدہ ہے اور وہ کیا سوچتے سمجھتے ہیں ہمیں اس سے کچھ لینا دینا نہیں۔ ہمیں صرف پیر و مرید کے باہمی ربط سے متعلق منازل سلوک بیان کرنا ہے اور اس سلسلے میں حضرت عبداللہ بلیانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ

''کوئی عارف اللہ کے علم کو نہیں پا سکتا جب تک کہ وہ اپنی ذات، صفات اور افعال کو اللہ کی ذات صفاتی، صفات اور افعال تصور نہیں کرتا۔''

اللہ اپنی لامحدودیت میں لامحدود ہے اور اس کے سوا کوئی دوسرا نہیں ہے۔

ارشاد ہوتا ہے۔

''اور کوئی بھی نہیں ہے اس کے وجود میں سوائے اللہ کے۔''

پھر ارشاد ہوتا ہے۔

''میں خدا ہوں میرے سوا کوئی خدا نہیں۔''

اس لئے قارئین کرام! کون کہہ سکتا ہے ''میں'' سوائے اللہ کے۔ یہی وجہ ہے کہ اولیاء اپنے اندر سے اس ''میں'' کو مٹانے کی کوشش کرتے ہیں۔

حدیث قدسی ہے۔

''جس نے اپنے نفس کو قابو کر لیا اس نے اپنے رب کو پا لیا۔''

عربی زبان میں چودہ ذاتی طبق (اسم ضمیر) ہوئے ہیں اور ان تمام کی اصل حقیقت ''میں'' سے وابستہ ہے۔ یعنی یہ چودہ طبق مختلف مفہومات کو واضح کرنے کے لئے ''میں'' کی جگہ استعمال ہوتے ہیں اور اگر کسی چیز کی یکتائی کو اس کے اسم ضمیر سے ضرب دیا جائے خواہ وہ کتنے ہی زیادہ اسم ضمیر ہوں تو تب بھی اس چیز کی یکتائی میں فرق نہیں آئے گا۔ اس لئے اگر یہ کہا جائے کہ جب انسان اپنے آپ سے بات کرتا ہے تو وہ پہلا انسان ہوتا کہ جو اپنے آپ سے بات کرتا ہے۔ اس لئے جب وہ ذات بھی اپنے آپ سے بات کرتی ہے تو کہتی ہے ''انا الحق''، یعنی ''میں ہی حق ہوں'' اور چونکہ مقام ''بقا'' میں سالک اپنی ''میں'' کو مٹا چکا ہوتا ہے۔ اور اس کو اپنی حقیقت میں اللہ کا نور محسوس ہوتا ہے اور جب اللہ کی مطلقیت سالک کی حقیقت میں سما جاتی ہے تو سالک ''انا الحق'' کا نعرہ بلند کرتا ہے تو یہ اس میں چھپی ہوئی اس ذات کی مطلقیت ہوتی ہے جو اس کو یہ کہنے پر مجبور کرتی ہے۔ کثرت یا تو صفات میں ہوتی ہے یا اثرات میں۔ وجود ایک سے زیادہ نہیں ہو سکتا لیکن وہ اپنی یکتائی کی ظاہر اور باطن میں اس طرح عکاسی کرتا ہے کہ ہمیں اس کا وجود کثرت اور بہتات سے نظر آتا ہے۔ لیکن حقیقت یہی ہے کہ وہ کثرت اور بہتات اصل میں اس کی صفات اور افعال ہوتے ہیں۔ بصورت دیگر جہاں تک اس کی پاک ذات کا تعلق ہے تو وہ پہلا ذاتی اسم ضمیر ہے یعنی کہ ''میں'' اور جب یہ اپنی غائب کی حالت سے باہر آ جاتی ہے یعنی دنیا کے مشاہدہ کی دعوت دیتی ہے تو پھر وہ ذات اپنے آپ کو ''میں'' کی بجائے ''تو'' کہہ کر پکارتی ہے اور یہ مقام ''تو'' پر اس وقت تک رہتی ہے کہ جب تک سالک اس کی مطلقیت کو پا نہیں لیتا اور جب وہ اس کو اپنی ذات میں پا لیتا ہے تو پھر وہ واپس غائب میں چلی جاتی ہے اور اپنے آپ

کو (سالک) میں ''میں'' کر کے یاد کرتی ہے۔ جب یہ اپنی حقیقت پر بحیثیت مجموعی نظر ڈالتی ہے یعنی اپنی صفات، افعال، اثرات اور حقیقی وجود کے ساتھ اپنے آپ کو پکارتی ہے تو ''ہم'' کہہ کر پکارتی ہے۔

جیسا کہ قرآن مجید کی سورۃ ق میں ارشاد ہوتا ہے۔

''ہم اس کی شہ رگ سے بھی زیادہ نزدیک ہیں۔'' (ق:16)

''میں'' اسی ذات کی تجلی کو ظاہر کرتا ہے اور دوسرے اسم ضمیر یا طبق اس کے اسمائے صفات اور افعال کے تجلی کو ظاہر کرتے ہیں۔ اللہ کی اپنی ذات خود اکیلی اپنے آپ کو ''میں'' کہہ سکتی ہے کیونکہ اس کا کوئی غیر نہیں۔

جیسا کہ اللہ تعالیٰ خود فرماتا ہے۔

''بے شک میں ہی معبود ہوں اور میرے (میں کے معنوں میں) سوا کوئی معبود نہیں۔'' (نحل:2)

اس لئے سالک کو چاہئے کہ وہ اپنی ''میں'' کو سمجھے اور اپنے آپ کا تصور اپنے وجود کے ساتھ ہی کرے اور ''غیر'' یعنی اللہ کا نام اپنانے کی کوشش نہ کرے۔

جب سالک اپنے میں اللہ کی مطلقیت کو محسوس کرتا ہے تو اس سے مراد یہ ہے کہ اس نے اللہ کو پالیا۔ لیکن اس کے وجود صفاتی کو اپنے میں محسوس کرنے کا مطلب یہ نہیں کہ سالک اللہ کی وحدانیت میں اپنے آپ کو شریک تصور کرنے لگے۔ اگر اس خیال سے اپنے رب کو پانے کی کوشش کی جائے تو انسان کبھی بھی اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ یہ تو شرک کے زمرے میں آجائے گا۔

حضرت ابوسعید خدری رحمۃ اللہ علیہ یقین الٰہی میں تصور غیر سے متعلق ایک واقعہ بیان کرتے ہیں کہ میں ایک بار جنگل میں جا رہا تھا۔ بھوک کا غلبہ ہوا نفس نے کچھ چیز طلب کی اور کہا حق تعالیٰ سے کوئی چیز طلب کر۔ میں نے کہا یہ متوکلوں کا کام نہیں ہے۔ جب نفس کو ناامیدی ہوئی تو اس نے دوسرا مکر شروع کیا اگر تو نہیں کھانا چاہتا تو صبر کی توفیق طلب کر۔

میں نے قصد کیا کہ صبر کی توفیق چاہوں۔ حق تعالیٰ کا تقدس میرے شامل حال ہوا میں نے آواز سنی کہ ہمارا دوست کہتا ہے کہ ہم اس کے نزدیک تو ہیں اور بے شک جو ہماری طرف آتا ہے ہم اس کو ضائع نہیں کرتے۔ تا کہ ہم سے قوت طلب کرے اور اپنی عاجزی اور کمزوری کا خیال رکھے کہ نہ اس نے ہم کو دیکھا اور نہ ہم نے اس کو دیکھا۔ یعنی کھانا مانگنے سے اس لئے محجوب ہو کہ صبر بھی ہمارا غیر ہے۔ تو آپ نے غور کیا کہ مقام فناء، میں سالک صبر تک کو بھی اللہ کا غیر تصور کرتا ہے اور اس کو بھی بھول کر خالص اپنے اللہ میں گم ہو جاتا ہے۔ اگر وجود کا کوئی دوسرا وجود ہوتا تو شائد اس صورت میں دوسرے رب کا تصور کیا جا سکتا۔ لیکن وہ تو باطن سے ظاہر کی طرف آیا ہے اور یہ ظاہر اس کا اپنا ہی ہے کوئی ''غیر'' نہیں ہے کہ جس کو ہم اپنا دوسرا معبود مان لیں۔

جیسا کہ سورۃ یوسف میں ارشاد ہوتا ہے۔

''بہت سے ایسے ہیں جو اللہ پر یقین نہیں رکھتے مگر شرک کرتے ہوئے۔''

(یوسف:106)

یہاں پر کسی ایسے ''غیر'' کا وجود نہیں ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے جنم دیا ہو یہ ''عالم'' اللہ کے لئے ''غیر'' نہیں ہے۔ اللہ نے تو اپنے آپ کو مختلف صفات اور اپنی قوت کو مختلف اشکال میں ظاہر کیا ہوا ہے۔ اس کا جو ظاہر ہے اس کو ''عالم'' کہا جاتا ہے اور یہ اس کی ظاہریت کی فقط ایک نشانی ہے۔ یہ عالم تو اس کے لباس کی طرح ہے اسی لئے تو کہا جاتا ہے کہ اگر سچی توحید کو حاصل کرنا ہے تو اس لباس کو اتارنا ہوگا اور اس کا طریقہ اپنی ذات کی نفی، محدود ذات کو مٹانے اور کائنات میں اس ذات کو سمجھنے میں مضمر ہے۔

❖ اب میں جو نکتہ بیان کرنے جا رہا ہوں اس میں اہل علم کی انتہائی توجہ چاہوں گا۔ اولیاء کو ایسا کوئی حکم نہیں ہوتا کہ وہ لوگوں کو اپنے دھرم اور عقیدہ کی طرف بلائیں لیکن انبیاء علیہم السلام کو یہ حکم ہوتا ہے۔ جس چیز پر حکم نہیں ہوتا تو ہم انتہا اسی کو کہہ سکتے ہیں۔ اس لئے اگر کہا جائے کہ ولائت منزل کی انتہا ہے اور رسالت ولائت پر انحصار کرتی ہے تو کچھ غلط نہ ہوگا اور

یہ پہلی صورت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کعبہ میں بتوں کو صاف کرنے کیلئے رسالت کو ولائت پر انحصار کرنا پڑا۔ دوسری صورت یہ ہے کہ اگر یہ کہا جائے کہ نبی کو انحصار بھی کرنا پڑا تھا تو یہ اس طرح ہوگا کہ جیسے بادشاہ کو اپنے خزانچی پر انحصار کرنا پڑے اور یہ بڑی عجیب بات ہوگی۔ کیونکہ خزانہ تو بادشاہ کا ہے لیکن وہ اس خزانے کو نکالنے کے لئے خزانچی پر انحصار کرتا ہے تو اب ان دونوں متضاد صورتوں کو اس طرح سے واضح کیا جا سکتا ہے کہ ظاہر میں تو ہمیں نبی انحصار کرتا ہوا نظر آتا ہے لیکن حقیقت میں تو یہ حکم (وحی) ہے۔ اس لئے کہا جا سکتا ہے کہ ولائت اللہ کے ساتھ راز و نیاز کرنا ہے اور رسالت لوگوں کو دعوت دینا ہے۔

جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

''میرے لئے اللہ کے ساتھ ایک وقت مقرر ہے کہ جس میں نہ تو کوئی نزدیکی فرشتہ داخل ہو سکتا ہے اور نہ ہی کوئی بھیجا ہوا نبی۔''

اس فرمان پر اگر ہم غور کریں تو معلوم ہوگا کہ اللہ کے ساتھ وقت گزارنے کے لئے نہ تو کسی فرشتہ کے روپ کو قبول کیا گیا اور نہ ہی کسی رسول کے روپ کو قبول کیا گیا ہے، تو پھر پیچھے کون سا روپ باقی رہ جاتا ہے؟ تو وہ ایک ''ولی'' کا روپ ہے اس لئے اگر یہ کہا جائے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کے مطابق وہ بھی اپنے اللہ کے ساتھ ایک ولی کے روپ میں ہم کلام ہوتے تھے تو اس میں کچھ غلط نہ ہوگا اور یہی وہ مقام ولایت ہوتا ہے کہ جس میں نبی کی قربت کی تجلی گم ہو جاتی ہے۔

خطیب الاسلام صاحبزادہ سید فیض الحسن شاہ آلومہاری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

''نبی کی خلوت اللہ کی دید اور اس کی جلوت اللہ کی شنید ہوتی ہے۔''

بشری تقاضوں کے تحت بھی دیکھا جائے تو جس انداز سے بات روبرو ہو کر سمجھ میں آتی ہے وہ خط و خطابت یا دیگر ذریعہ مواصلات سے نہیں آ سکتی۔ اور نبی کو جو حکم ہوتا ہے تو وہ لوگوں میں رہنے کا ہوتا ہے اور خلوت، صفت نبی نہیں بلکہ صفت ولائت ہے۔ چنانچہ یہ ماننا پڑے گا کہ ولائت نبوت کی بنیاد ہے اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جو خلوت میں جاتے تو

ایک ولی کے روپ میں جاتے نہ کہ نبی کے۔ جیسا کہ مندرجہ بالا حدیث سے واضح ہے۔ اور آپ ﷺ ولائت کے بلندترین مقام پر فائز ہیں کہ جس بناء پر سابقہ تمام انبیاء علیہم السلام کی نسبت لوگوں کے قلوب پر دیرپا اثر جما سکے۔ یہی وجہ ہے کہ جس وقت معراج پر اپنے رب کے روبرو ہوئے تو خلوت میں ہوئے اور یہ صفت ولائت ہے۔ اگر نبی کے روپ میں ہوتے تو مثل موسیٰ علیہ السلام جلوت میں اس تجلی کی تاب نہ لاسکتے۔

اس ضمن میں ایک اور مقام پر حضرت فیض الحسن شاہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

"عالم شریعت میں اس کی اطاعت، عالم طریقت میں اس کی محبت اور عالم معرفت میں اس کی کیفیت مقصود مومن ہے۔" (مقالات فیض رحمۃ اللہ علیہ)

اس قول کی اگر تشریح کی جائے تو اسی طرز پر کہ جب تک محبت کامل نہ ہو اطاعت بھی کاملیت سے دور ہے اور محبت طریقت ہے اور اطاعت شریعت۔ اس لئے طریقت بنیاد شریعت ہے اور طریقت روح شریعت ہے اور طریقت، ولائت سے ہے تو شریعت نبوت سے ہے اور پھر اسی مندرجہ بالا قول کے آخر میں بیان ہے کہ "عالم معرفت میں اسی کی کیفیت" اور یہ فلسفہ "انا الحق" کی عکاس ہے۔ آج انہی انبیاء علیہم السلام کے پیروکار کثیر تعداد میں موجود ہیں کہ جو ولائت کے اعلیٰ مقام پر فائز رہے۔ جیسے حضرت ابراہیم کہ جن کو امامت سے سرفراز کیا گیا، حضرت عیسیٰ کہ جن کو روح اللہ کہا گیا اور حضور خاتم علیہم السلام کہ جو نوراللہ ہیں۔

❖ رسالت ایک عارضی صفت ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر رسول اپنی دنیاوی زندگی کے عرصہ میں ایک عارضی مدت یا عرصہ کے لئے رسول تھا۔ اس رسالت کا تعلق اس علمی ترقی اور اخلاقی بلندی کے ساتھ ہوتا تھا کہ جس کے ساتھ اس کو عارضی طور پر تخلیق کیا ہوتا۔ جبکہ ولائت کا تعلق اس کی ذات پاک سے ہوتا ہے اس لئے وہ لامحدود رہتی ہے۔ رسول کی رسالت ایک موت کے بعد ختم ہوسکتی ہے لیکن ایک ولی کی ولائت ہمیشہ رہتی ہے۔

مقام ولائت اپنی انتہا پر مقام امامت میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ نبی آخر صلی اللہ

علیہ وسلم کو امام انبیاء کہا گیا ہے اور ان کو تمام رسولوں کی امامت بخشی گئی اور امامت ایک ایسی شے ہے کہ جس کو ابراہیم علیہ السلام نے نبوت حاصل کر لینے کے بعد خود دعا کر کے حاصل کیا ہے۔

جیسا کہ سورۃ البقر کی آیت نمبر ۱۲۴ میں ارشاد ہوتا ہے۔،

''اور جب ابراہیم علیہ السلام کو اس کے رب نے کچھ باتوں سے آزمایا تو اس نے وہ پوری کر دکھائیں۔فرمایا میں تمہیں لوگوں کا امام بنانے والا ہوں۔عرض کی اور میری اولاد سے۔فرمایا میرا عہد ظالموں کو نہیں پہنچتا۔''

یہاں پر دو باتیں غور طلب ہیں۔ایک یہ کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو نبی بننے کے بعد امامت نصیب ہوئی اور یہ امامت کچھ آزمائشوں میں پورا اترنے کے بعد حاصل ہوئی۔ بعض مفسرین خیال کرتے ہیں کہ ان آزمائشوں سے مراد دس چیزیں ہیں۔یعنی

☆ مونچھیں کتروانا۔

☆ کلی کرنا۔

☆ ناک میں صفائی کے لئے پانی استعمال کرنا۔

☆ مسواک کرنا۔

☆ سر میں مانگ نکالنا۔

☆ ناخن ترشوانا۔

☆ بغل کے بال دور کرنا۔

☆ موئے زیر ناف کی صفائی۔

☆ ختنہ۔

☆ پانی سے استنجا کرنا۔

لیکن میں حیران تو اس فصاحت ناتمام پر ہوتا ہوں کہ کیا یہ اتنی سہل چیزیں رب کی جانب سے آزمائشوں کے زمرے میں آسکتی ہیں۔اور اس صورت میں کہ جب یہ کسی نہ کسی

صورت میں پہلے سے ہی مختلف اقوام میں رائج ہوں۔ آزمائش سے مراد تو کوئی ایسا امر آہن ہے کہ جس کا تعلق یا تو جان سے ہوتا ہے یا مال سے اور یا پھر اولاد سے۔ اور جب ابراہیم علیہ السلام اپنی بیوی اور بیٹے کو مکہ کی خشک اور بے آب و گیاہ سرزمین میں لے گئے اور پھر آتش نمرود میں کود ے اور پھر اپنے بیٹے اسماعیل کی قربانی بھی دی اور پھر ایک مرتبہ اپنی زندگی کے سرمایہ کو ٹھوکر مار کر ہجرت بھی کی تو کیا یہ وہ آزمائشیں نہیں ہیں کہ جو اس آیت کی شان نزول سے تعلق رکھتی ہیں؟ اب ایک اور سوال یہ ہے کہ یہ امامت ہے کیا؟ تو امامت سے مراد ہے دینی پروگراموں کا ثابت ہونا جس میں حدود احکام الٰہی کے اجراء کے لئے حکومت کا وسیع مفہوم شامل ہے۔ اس طرح ظاہری اور باطنی پہلوؤں سے نفوس کی تربیت اور پرورش بھی امامت کے مفہوم میں داخل ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

''اور ہم نے انہیں امام قرار دیا جو ہمارے حکم سے لوگوں کو ہدایت کرتے ہیں۔''

(انبیاء:73)

پھر ارشاد ہوتا ہے۔

''جب انہوں نے استقامت دکھائی تو ہم نے انہیں امام قرار دیا جو ہمارے حکم سے لوگوں کو ہدایت کرتے ہیں۔'' (سجدہ:24)

پہلی آیت جو بعض انبیاء علیہم السلام و مرسلین کی طرف اشارہ کر رہی ہے اور دوسری جس میں بنی اسرائیل کے کچھ انبیاء علیہم السلام کا ذکر ہے نشاندہی کرتی ہے کہ امامت کا تعلق ہمیشہ سے ایک خاص قسم کی ہدایت سے رہا ہے جو فرمان خدا کے مطابق ہے کیونکہ یہ ہدایت ''ارائۃ الطریق'' (راستہ دکھانا) کے معنی والی نہیں ہے۔ کیونکہ ابراہیم علیہ السلام مقام نبوت و رسالت اور ''ارائۃ الطریق'' کے مفہوم کی ہدایت کے منصب پر تو قطعاً فائز تھے اس لئے یہ امامت سخت آزمائشوں پر پورا اترنے کے بعد عطا ہوئی اور وہ بشارت، ابلاغ اور انداز کے معنی سے ماوراء ہے۔ اس لئے ہم دیکھتے ہیں کہ انبیاء وہی افضل رہے کہ جو نبوت

کے ساتھ امامت کے بھی حامل رہے۔

حضرت امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ اپنی کتاب احیاء علوم الدین میں فرماتے ہیں۔

''معرفت یقینیہ صرف خواص اولیاء کا حق ہے یہ لوگ بغیر کسی واسطہ سے دیدار حق سے مشرف ہوتے ہیں۔اس کی مثال وہی ہے جو علم نبوت کی ہے جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں فرماتا ہے۔''واتینا من لدنا علما'' اس علم کی کیفیت کے بارے میں اختلاف ہے کہ آیا یہ الہام ہے یا وجدان ہے؟ بندہ نہیں جانتا کہ یہ کس طرح حاصل ہوتا ہے؟ نہ جانتا ہے کہ یہ کہاں سے آتا ہے؟ پھر بھی ایک بات بہرحال یقینی ہے کہ نبی اور ولی دونوں کا علم اللہ تعالیٰ کا عطا کردہ ہے۔خواہ اس کی نوعیت کسی قسم کی کیوں نہ ہو۔''

چنانچہ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ بھی فیضان ولائت کو فیضان نبوت ہی کی مثل قرار دیتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ امامت (ولائت منتہی) انہی خوبیوں سے مزین ہوکر رسول آخرالزماں صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچتی ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی انہی آزمائشوں میں پورا اتر کر خود کو اس امامت کا اہل ثابت کرتے ہیں۔حالانکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی نبوت سے سرفراز کیا جا چکا تھا۔یہاں تک کہ یہی امامت ظالمین کے مقابلے میں اپنے آپ کو میدان کربلا میں بھی ان آزمائشوں میں ثابت قدم رکھتی ہے۔

❖ انبیاء علیہم السلام کو پہلے توحید سکھائی جاتی ہے اور بعد میں شریعت کی مدد سے منازل سلوک سے آگاہی دلائی جاتی ہے۔

سورۃ یوسف میں ارشاد ہوتا ہے۔

''تم فرماؤ! یہ میری راہ ہے میں اللہ کی طرف بلاتا ہوں اور جو میرے قدموں پر چلیں دل کی آنکھیں رکھتے ہیں۔''(یوسف:108)

اس فرمان کی روشنی میں اللہ بزرگ و برتر نے نبی اور ولی کی پہچان خود ہی کروادی ہے۔ جیسا کہ میں پہلے بیان کر چکا ہوں۔ایک نبی سب سے زیادہ توحید کی طرف لوگوں کو دعوت

دیتا ہے۔

حدیث قدسی ہے۔

''وہ جو کہتا ہے اور کوئی معبود نہیں سوائے اللہ کے، جنت میں داخل ہوا۔''

سورۃ ص میں اللہ تعالیٰ نے کفار کی اس سوچ کی طرف اشارہ فرمایا ہے کہ جو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغام توحید کے بارے میں قائم کیئے ہوئے ہیں۔

''کیا اس نے بہت خداؤں کا ایک خدا کر دیا، بے شک یہ بڑی عجیب بات ہے۔''

توحید کا سبق یاد کرانے کے بعد رسول عبدیت کی طرف بلاتا ہے اور ان کی طرز عبادت کو ذکر (نماز) کی طرف موڑ دیتا ہے۔ اس لئے کہ تمام انبیاء علیہم السلام صرف توحید کی طرف رغبت دلاتے ہیں۔ اس لئے ان سب کی رسالت ایک جیسی ہے اگر فرق پڑتا ہے تو وہ مقام بزرگی میں اور علم میں پڑتا ہے جو اللہ اپنے ان انبیاء علیہم السلام کو نوازتا ہے۔ تمام مذاہب کی بنیاد ایک ہی ہے۔ انبیاء علیہم السلام اپنے مشن کو توحیدی تعلیمات سے شروع کرتے ہیں کہ جو وہ ایک خاص روحانی طبقہ کو پہلے سکھاتے ہیں (جیسا کہ اہل بیت اور خلفائے راشدین) اور عام لوگوں کیلئے ابتداء شریعت سے کرتے ہیں۔ اس طرح سے شائد بعد والے شریعت کی مدد سے اپنے آپ کو ''حقیقت صفاتی'' تک لے جا سکیں اور پہلے والے شائد ''حقیقت صفاتی'' سے ''شریعت'' کی طرف آ سکیں۔ اور اس طرح سے یہ دونوں حقیقتیں پختہ ہو سکیں۔ یہ اس طرح ہے کہ جس طرح ایک مجذوب اپنے آپ کو ''حقیقت صفاتی'' سے ''شریعت'' کی طرف اتارتا ہے۔ تاکہ وہ لوگوں کو حقیقت کی تعلیم دے سکے اور سالک کی مدد کرے تاکہ وہ شریعت سے حقیقت صفاتی یا مطلقیت کی طرف جستجو کر سکے۔

مختصراً یوں سمجھ لیجئے۔

''شریعت کو زیادہ ترجیح دو، حقیقت شریعت کی با قاعدہ جگہ کی حد کے بغیر نہیں ہے۔''

جیسا کہ نقل ہے کہ حضرت بایزید رحمۃ اللہ علیہ سے لوگوں نے کہا کہ فلاں مقام پر ایک

نہایت بزرگ شیخ ہے۔ آپ اس کو دیکھنے کے لئے تشریف لے گئے جب آپ اس کے قریب پہنچے تو اس مرد نے تھوک قبلہ کی طرف پھینکی۔ یہ دیکھ کر آپ اسی وقت واپس آ گئے اور فرمایا! اگر اسے کچھ بھی ''طریقت'' میں دخل ہوتا تو ''شریعت'' کے خلاف عمل نہ کرتا۔

حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کا بھی شریعت اور طریقت کو مضبوط کرنے میں بڑا اہم کردار رہا ہے اور اس خیال کی مزاحمت فرمائی کہ شریعت کے مکلّف صرف عوام ہیں، خواص تکلیفات شرعیہ سے مستثنیٰ ہیں۔ آپ نے اپنے متعدد خطوط اور تصانیف میں اس نظریئے کی پرزور مخالفت فرمائی۔

سید احمد قادری کے نام ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں!

''شریعت وطریقت ایک دوسرے کے عین ہیں حقیقت میں ایک دوسرے سے علیحدہ نہیں ہیں۔ ان میں صرف اجمال و تفصیل، استدلال و کشف، غیب و شہادت اور تعمل و عدم تعمل کا فرق ہے۔ وہ احکام وعلوم جو شریعت غرا کی روشنی میں ظاہر اور معلوم ہو گئے ہیں حقیقت حق الیقین کی تحقیق کے بعد یہی احکام وعلوم ''بعینھا'' مفصل طور پر منکشف ہوتے ہیں۔ غیبت سے شہادت میں آتے ہی مشقت کسب اور فریب عمل درمیان سے اٹھ جاتا ہے اور حقیقت الیقین تک پہنچنے کی علامت یہ ہے کہ علوم و معارف شرعیہ سے اس مقام کے علوم و معارف مطابقت رکھتے ہوں اور اگر ان دونوں میں بال برابر بھی فرق ہے تو یہ اس بات کی علامت ہے کہ حقیقت الحقائق تک ابھی رسائی نہیں ہوئی۔ اس کے برخلاف مشائخ طریقت میں سے جس کسی سے بھی کوئی علم وعمل مخالف شریعت ظہور پذیر ہوا ہے وہ حالت سکر پر مبنی ہے اور سکر صرف اثناء راہ میں ہوتا ہے۔ نتھیان نہایت النہایۃ کو تو صحو ہی صحو ہے۔'' (مکتوب نمبر ۸۴)

ایک اور مکتوب میں شیخ محمد یوسف کو اس طرح تلقین فرماتے ہیں۔

''اس طرح سے زندگی گزاریں کہ اس وراثت کے حق دار ہو جائیں، اپنے ظاہر

کو ظاہر شریعت سے اور باطن کو باطن شریعت سے آراستہ و پیراستہ کریں جو حقیقت شریعت میں عبارت ہے۔ کیونکہ حقیقت طریقت، حقیقت شریعت سے عبارت ہے اور راہ شریعت پر چلنا ہی حقیقت ہے نہ یہ کہ شریعت دوسری چیز ہے اور طریقت وحقیقت دوسری چیزیں۔ یہ الحاد و زندقہ ہے۔'' (مکتوب نمبر ۵۷)

❖ برائی وہ ہے کہ جس کا اپنا کوئی وجود نہیں ہے یعنی اس کا تعلق عدم سے ہے اور متضاد ''اسماء'' کے درمیان ایک تعلق کا نام ہے۔

سورۃ نساء میں ارشاد ہوتا ہے۔

''اے سننے والے تجھے جو بھلائی پہنچے وہ اللہ کی طرف سے ہے اور جو برائی پہنچے وہ تیرے نفس سے ہے۔'' (نساء:79)

اس فرمان میں برائی کو نفس سے منسلک کر دیا گیا ہے اور جب ایک بگڑا نفس اس کی متضاد صفات یعنی جمالی اور جلالی کا استحصال کرتا ہے تو اس سے برائی جنم لیتی ہے لیکن اگر ان دونوں صفات کا موازنہ نہ کیا گیا تو برائی کا وجود ہی پیدا نہیں ہوتا۔ جس طرح اگر کہا جائے کہ زندگی اور موت اللہ کی دو متضاد صفات ہیں وہ زندگی عطا کرتا ہے اور پھر ایک مقررہ مدت گزر جانے کے بعد موت بھی عطا کر دیتا ہے۔ اگر یہ نظام اس طرح چلتا رہے تو کوئی برائی جنم نہیں لیتی۔ لیکن جب انسان ان دونوں کا خود استحصال کرنے کی کوشش کرے یعنی اپنی مرضی سے جان لینا یا دینا شروع کرے تو یہ برائی بن جائے گی۔ اس طرح ''قہار'' اور ''رحیم'' بھی اس کے دو اسماء مبارکہ ہیں اور جو تعلق ان دونوں کے درمیان وابستہ ہے وہ ''شر'' کا ہے۔ اس لئے ایک ''عارف'' ان سب سے بالا ہوتا ہے۔

جیسا کہ سورۃ انبیاء میں ارشاد ہوتا ہے۔

''اور ہم نے تمہیں نہ بھیجا مگر رحمت سارے جہان کے لئے۔'' (انبیاء:107)

❖ ''علماء'' کے خیال کے مطابق رسول شرک سے پاک (آزاد) ہوتے ہیں جو کہ بذات خود ایک ''غیر'' (یعنی اللہ) کی تصدیق کرتی ہے۔ رسالت کے حصول کے لئے رسول پہلے

ہی ایک ''ولی'' کے مقام پر فائز کر دیئے جاتے تھے جو کہ کسی بھی دوسرے کی نفی کرتا ہے اور حق کی تصدیق کرتا ہے۔ حتیٰ کہ اس سب کے باوجود بھی ان سے اگر غلطیاں ہوئیں تو انہیں اس کا کچھ خوف نہیں ہوتا تھا۔

جیسا کہ سورۃ النساء میں آتا ہے۔

''بے شک اللہ اسے نہیں بخشتا کہ اس (اللہ) کے ساتھ کفر کیا جائے اور کفر سے نیچے جو کچھ ہے جیسے چاہے معاف فرما دیتا ہے۔'' (نساء:48)

اگر یہ کہا جائے کہ غلطیاں ان سے فرد ہوئیں تو یہ غلط ہوگا کیونکہ یہ غلطیاں حق کے حکم سے ہوئیں، حق کے لئے ہوئیں اور حق کو ثابت کرنے کے لئے ہوئیں۔ اس لئے تمام انبیاء معصوم گزرے ہیں۔

سورۃ الانفال میں ارشاد ہوتا ہے۔

''اور اے محبوب وہ خاک جو تم نے پھینکی (بدر میں) تم نے نہ پھینکی بلکہ اللہ نے پھینکی۔'' (انفال:17)

اس ضمن میں اگر یہ کہا جائے کہ ہابیل نے قابیل کو مار ڈالا تاکہ پہلے والا اپنی ''میں'' اور نفس کو قائم رکھ سکے تو یہ گناہ کے زمرہ میں آتا ہے۔ لیکن جب رسول نے کنکریاں پھینکیں تو اس وقت وہ ہاتھ رسول کا نہ تھا بلکہ وہ ہاتھ اللہ کا ہاتھ بن گیا تھا۔

جس طرح سورۃ فتح میں ارشاد ہوتا ہے۔

''ان کے ہاتھوں پر اللہ کا ہاتھ ہے۔'' (فتح:10)

اس لئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ عشق کے سچے راستہ میں گناہ معاف کر دیئے جاتے ہیں۔

جیسا کہ سورۃ الفتح میں ایک اور جگہ پر ارشاد ہوتا ہے۔

''اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم! تاکہ اللہ تمہارے سبب سے گناہ بخشے تمہارے اگلوں کے اور تمہارے پچھلوں کے۔'' (فتح:2)

❖ ولائت رب کو رب کے ذریعے دیکھنا ہے اور رسالت رب کو تخلیق کے ذریعے، پہلے

میں تخلیق کے کسی رنگ کی تیزی اور شوخی بلکہ سایہ تک بھی نمایاں نہیں ہے لیکن بعد والے میں اللہ کے مشاہدہ کے ساتھ چیزوں کی حقیقت ثبوت کے طور پر رہتی ہے۔ ولائت میں اللہ کا مشاہدہ تخلیق کے وجود کے شک یا اندیشہ کے بغیر ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ سالک کے اپنے وجود کا اندیشہ بھی اس سے باہر ہوتا ہے۔ جبکہ رسالت میں دونوں کا مشاہدہ ساتھ ساتھ مل کر رہتا ہے یعنی خالق کا بھی اور تخلیق کا بھی۔ پہلا مقام ''فنا'' کا ہوتا ہے اور دوسرا ''بقا'' کا۔ بعض کے خیال میں فنا کا خیال زیادہ مکمل اور کامل ہوتا ہے۔

حضرت بایزید رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

''جب میں حقیقت کے سمندر میں پہنچا میں نے انبیاء علیہم السلام کو ساحل پر اور اپنے آپ کو اس کے اندر پایا۔''

رسالت نبی کے وجود کی آغاز و ابتداء اور حالت مستقبل سے واقفیت اور شناسائی رکھنا ہے۔ جب کہ امت کے لئے ان کی تعلیمات پر عمل کرتے ہوئے خود اپنی ابتداء انتہاء کو سمجھنا مقصود ہے۔ انبیاء علیہم السلام اپنے بارے میں خیال ''اللہ کے ذریعے'' اور ''اللہ کے ساتھ'' کرتے ہیں۔ اپنے آپ کو اللہ کا محدود پہلو تصور کرتے ہیں۔ ان کی حدوں کا دائرہ اختیار آغاز سے لے کر بعد میں ایک تسلسل میں آنے والی حدوں تک محیط ہے اور وہ اپنے آغاز اور اپنے مستقبل کے بارے میں باخبر ہوتے ہیں۔

❖ کفر و اسلام درویت پویاں
وحدہ لا شریک کہ گویاں

یعنی کفر و اسلام دونوں تیرے راستے میں دوڑ رہے ہیں دعویٰ کرتے ہوئے کہ تم اس کو بغیر کسی شریک کے مانو۔

کفار اللہ کی یکتائی پر یقین رکھتے ہیں اور صرف رسالت پر یقین نہیں رکھتے گو کہ وہ خود ہی یکتائی سے منحرف ہوتے نظر آسکتے ہیں۔ اور اگر اس امر پر زور دے کر کہا جائے کہ فرق ظاہری عمل سے بھی پڑتا ہے تو یہ بھی اس وقت صحیح ہے جب یہ اعمال جان بوجھ کر اور مرضی

کے مطابق ابھریں۔

حدیث قدسی ہے۔

''تمام مخلوق فطرت اسلام پر پیدا کی گئی ہے۔''

قرآن میں سورۃ التغابن میں آتا ہے۔

''اللہ کی پاکی بولتا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمینوں میں ہے۔''

اس لئے کفار کو اس حلقہ سے نہیں نکال سکتے کہ جہاں پر اس کی یکتائی کی بات کی جاتی ہے۔تو میں اپنے اہل علم سے یہ دریافت کروں گا کہ اگر اللہ کی وحدانیت اور بزرگی پر صرف اقرار کرنے کا نام ایمان نہیں ہے تو پھر پیچھے کیا بچ جاتا ہے کہ جس کی نبوت اور بزرگی کا اعتراف کرنا ہی اصل میں ''ایمان'' ہے؟ اس کا جواب میں آپ ہی سے چاہوں گا۔

گلشن راز کہتے ہیں۔

مسلمان گر بدانستی کہ بت چیست
بدانستی کہ دین در بت پرستی ست

''یعنی اگر مسلمان جانتا ہے کہ بت کیا ہے تو وہ یہ بھی جانتا ہوگا کہ اصل دین بت پرستی میں ہی ہے۔''

اس کی تشریح میں اس سے کروں گا کہ ایک بت پرست اس وقت بت پرست بنتا ہے کہ جب وہ بت کی ظاہری حالت کو دیکھتا ہے یعنی کہ صرف تخلیق کو دیکھتا ہے اور اس طرح سے کافر ہو جاتا ہے۔ اگر وہ اس پتھر، درخت، آگ، ہوا کے پس پردہ طاقت یعنی ان چیزوں کے خالق کو ذہن میں رکھ کر عبادت کرتا ہے تو وہ اس یقین کے دائرہ میں داخل ہو جاتا ہے کہ جو'' یکتائی میں یقین'' کا محاصرہ کرتا ہے۔اسی طرح اگر ایک کلمہ گو اس میں چھپی ہوئی الوہیت خدا کو نہ دیکھتا تو وہ صرف شریعت میں مسلمان رہ جاتا اور حقیقی مسلمان نہ بن پاتا اور اس کو ہم اسلام مجازی یا ظاہری اسلام کہتے ہیں۔ یہاں پر فرق ہے مگر معنی میں نہیں۔ بلکہ الفاظ اور بناوٹوں میں مسلمان اس کو اللہ کہہ کر پکارتے ہیں۔رب وہ ہے جس کی عبادت ہر

جگہ کی جائے خواہ زمین ہو یا آسمان۔ ایک روائت کے مطابق جبرائیل علیہ السلام نے ایک آواز سنی، لبیک (میں یہاں ہوں) لبیک (میں یہاں ہوں) جو کہ اللہ کی طرف سے آ رہی تھی اور حیران ہوا کہ یہ رحمت الٰہی کس خوش نصیب کے لئے ہے؟ اس نے بڑی کوشش کی کہ وہ اس عبادت گزار کو کسی یہودی مجلس، چرچ یا مسجد میں ڈھونڈے کہ جو اس وقت اپنے رب کے گن گا رہا ہے لیکن وہ نہ ڈھونڈ سکا۔ اتنے میں ایک غیبی آواز آئی کہ "روم میں فلاں جگہ پر ایک مندر میں جاؤ اور حق کو ڈھونڈ لو" وہاں پر اسے ایک مجوسی ملا کہ جو ایک بت کے سامنے احتجاج کر رہا تھا۔ اس کا دل جل رہا تھا اور وہ رو رو کر چلا رہا تھا کہ اے رب! اے رب! اور جواب میں لبیک، لبیک کی آواز سن رہا تھا۔ جبرائیل علیہ السلام کو غصہ آیا اور رب سے دعا کی کہ اے اللہ! مجھے اجازت دے اور میں اس مجوسی کو مندر کے ساتھ ہی تباہ کر دوں۔ جواب ممانعت میں آیا کہ "اے جبرائیل علیہ السلام! اگرچہ اس نے اس چیز کو کھو دیا ہے کہ اصل میں جس کی پوجا کرنی چاہئے لیکن اس پوجا کے لائق نے اسے نہیں کھویا۔ وہ ذات عبادت کے لائق ہے ہر جگہ پر اور حالت میں۔"

❖ مطالعہ کتب کرنے والوں کی صحبت "اہل مراقبہ" کے لئے نقصان دہ ہے۔ علم وفہم سے مراقبہ کی حالت میں پرہیز اور اجتناب کرنا چاہئے۔ حق کی تجلیات بھی مراقبہ اور ذہن کو تاریک کر دیتی ہیں۔ یہاں پر تو اپنے آپ کو بے نیازی اور فراموشی کے حوالے کر دو اور کسی علم وفہم کو اندر نہ آنے دو جب خیالات اندر آتے ہیں تو یہ کئی تصوراتی اجسام کو ذہن پر کشیدہ کر دیتے ہیں اور ایک عجائب خانہ بنا دیتے ہیں۔

حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ حالت مراقبہ کو اس طرح سے بیان کرتے ہیں۔

"جب قدرت جلوہ گر ہوتی ہے تو دیکھنے والے کو سانس لینا بھی برا معلوم ہوتا ہے اور جب حق تعالیٰ کی عظمت دیکھتا ہے تو دم بخود رہ جاتا ہے اور جب اس کی ہیبت کو دیکھتا ہے تو پھر دم لینا بھی کفر جانتا ہے اور جو مرد دم بے قراری لیتا ہے تو وہ تمام پردوں کو اللہ اور بندہ کے درمیان میں جلا ڈالتا ہے۔"

حتیٰ کہ علم تصوف اور ''اشغال'' کی کثرت بھی اس فراموشی اور بے نیازی کو آنے سے روکتی ہے۔

جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے۔

''یعنی اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔'' (آل عمران:66)

آپ کو خود کو بھلانا ہوگا یہاں تک کہ بے نیازی اور فراموشی کے متعلق علم بھی اپنی حقیقت کو کھودے۔

حضرت مجدد الف ثانی قدس سرہ مکتوب نمبر ۱۹۰ میں طریقہ مراقبہ کو بیان کرتے ہوئے میر محمد نعمان بدخشی کو فرماتے ہیں۔

''پس تجھ پر لازم ہے کہ قبلہ توجہ کو ہر طرف سے ہٹا کر کلیۃً اس طریقہ کے بلند مرتبہ اکابر کی طرف کر اور ان کے باطن سے ہمت اور توجہ طلب کر لے۔ ابتداء میں ذکر کرنے سے چارہ نہیں۔ چاہئے کہ قلب صنوبری کی طرف متوجہ ہو۔ کیونکہ دل کے گوشت کا ٹکڑا قلب حقیقی کے لئے حجرے اور گھر کی مانند ہے اور اسم مبارک ''اللہ'' کو اس قلب پر گزارے اور اس وقت قصداً کسی عضو کو بھی حرکت نہ دے۔ کلیتہ قلب کی طرف متوجہ ہو کر بیٹھ جائے اور خیال میں بھی قلب صنوبری کو جگہ نہ دے اور اس طرف متوجہ نہ ہو۔ کیونکہ مقصود قلب کی طرف توجہ ہے نہ کہ اس کی صورت کا تصور اور لفظ مبارک اللہ کے معنی کو بے مثال اور بے کیف ملاحظہ کرے اور کسی صفت کو بھی اس کے ساتھ نہ ملائے اور اس کے حاضر و ناضر ہونے کو بھی لحاظ و خیال میں نہ لائے تا کہ حضرت ذات تعالیٰ و تقدس کی بلندی سے صفات کی پستی کی طرف نہ آئے اور اس سے شہود وحدت و کثرت میں نہ پڑے اور بے کیف ذات کی گرفتاری سے چون اور کیف والی شے کے ساتھ آرام نہ پکڑے۔ کیونکہ جو چون اور کیف رکھنے والی شے میں نمایاں ہوگا وہ بے کیف نہیں ہوسکتا اور جو کچھ کثرت میں نمودار ہوتا ہے واحد حقیقی نہیں ہوسکتا۔ بے

چون ذات کو چون کے دائرہ سے باہر تلاش کرنا چاہئے، بسیط حقیقی کو احاطہ کثرت سے باہر طلب کرنا چاہئے اور اگر بوقت ذکر الٰہی بے تکلف پیر کی صورت میں ظاہر تو اسے بھی دل میں لے جائے اور دل میں بٹھا کر ذکر کرے۔''

(حضرت مجدد الف ثانی قدس سرہ کو سلسلہ نقشبندیہ سے سب سے کم واسطوں سے نسبت تھی اور قادریہ، سہروردیہ سے زیادہ واسطوں سے نسبت تھی لیکن جو ذکر کا طریقہ آپ نے اختیار کیا وہ نقشبندی سلسلے سے متاثر ہے۔

سکون قلب اسی وقت ہوتا ہے جبکہ اس میں افکار یا وساس حرکت نہ کریں۔ دل میں افکار اور وساس کی حرکت کو روکنا بڑی حد تک ایک اختیاری امر ہے۔ اس اختیار کو استعمال کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ ایک محدود شے کی طرف متوجہ ہو جائے۔ اس سے دوسری غیر محمودہ حرکات خود بخود بند ہو جائیں گی۔ اس سے یکسوئی ہو جاتی ہے۔ دل میں بیک وقت دو خیالات سمانے کی گنجائش نہیں ہوتی۔

سورۃ احزاب میں ارشاد ہوتا ہے۔

''اللہ نے کسی کے سینے میں دو دل نہیں بنائے۔'' (احزاب:4)

اس میں اس بات کی اصل ہے کہ دل ایک آن میں دو طرف متوجہ نہیں ہوتا۔ اسی اصول کی بنیاد پر اختیاری وسوسوں کا حل فقط یہ ہے کہ دل میں دوران ذکر و فکر فقط ایک ہی خیال سمانے پائے۔ اسی سے اس شخص کا جھوٹ بھی ثابت ہوتا ہے جو تسبیح بھی پھیرتا رہتا ہے اور باتیں بھی کرتا رہتا ہے۔ اس سے وہ یہ دعویٰ کرنا چاہتا ہے کہ عین باتیں کرنے میں بھی وہ ذکر الٰہی میں مشغول ہے۔ نام نہاد مدعیوں کا یہ دعویٰ سراسر غلط اور باطل ہے۔ وسوسہ سے قلب کو خالی کرنے کی طرف متوجہ ہونا یہ خود ایک وسوسہ بن جاتا ہے۔ اس کے لئے معتدل توجہ کافی ہے اگر اس درجہ کے ساتھ دوسرے خیالات اور وساس بھی آتے رہیں تو مضر نہیں کیونکہ وہ غیر اختیاری ہیں۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ جیسے آنکھ سے کسی کتاب میں کسی خاص لفظ کو قصداً دیکھیں تو اس کے ساتھ اس کے آس پاس کے کئی دوسرے الفاظ پر بھی ضرور نظر پڑ

جاتی ہے۔ مگر چونکہ یہ نظر قصداً نہیں۔ اس لئے یہی کہیں گے کہ فلاں خاص لفظ کو دیکھا۔ دوسرے الفاظ کو خود نہیں دیکھا بلکہ نظر آ گئے۔ اس طرح کے غیر اختیاری وساس عموماً ابتدائی مراحل میں ہوتے ہیں اور بسا اوقات بڑے کٹھن محسوس ہوتے ہیں۔ لیکن آسانی اسی میں ہے کہ اگر عمل کے اعلیٰ درجہ پر قدرت نہ ہوسکے تو اس کے ادنیٰ درجہ پر ہی عمل کرے۔ اعلیٰ کے قادر ہونے کے انتظار میں نہ رہے کیونکہ خطرہ ہے کہ تمام عمر اسی انتظار میں گزر جائے اور ادنیٰ سے بھی محروم رہے۔ اللہ کا نام اعلیٰ طریقہ پر لیا جائے یا ادنیٰ طور پر اپنا اثر ضرور رکھتا ہے۔ دنیا میں بعض اشیاء ایسی ہیں کہ ان کا نام لینے سے ہی منہ میں پانی بھر آتا ہے۔ پھر یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا نام لیا جائے اور اس میں اثر نہ ہو خود خالی نام میں بھی برکت ہے۔ خواہ پوری توجہ سے لیا جائے یا کم توجہ سے (یہ انداز فقط سالک کو آغاز میں اپنانا چاہئے کہ جب اسے غیر اختیاری وساس پر قابو نہیں ہوتا)۔

❖ ذات اور صفات کی تجلیات انفس سے ہی پھوٹتی ہیں اور آپ کے دماغ کے آئینہ میں منعکس ہوتی ہیں لیکن آپ نے اس آئینہ کو اپنی فطرت انسانی اور مزاج سے تاریک کر دیا ہے اور خود بھی ان تجلیات کے لئے اندھے ہو گئے ہیں۔

❖ ہر برائی ''عدم'' (جس کا کوئی وجود نہ ہو) سے ہوتی ہے کہ جو ''وجود'' کی متضاد ہے، برائی اپنے آپ کو کسی وجود سے منسلک نہیں کرتی۔ برائی کسی انسان سے اس طرح منسوب کی جاسکتی ہے کہ وہ اسے اس دنیا میں یا دوسری دنیا میں برداشت کرے گا یا اس سے سزا پائے گا۔ برائی کو برائی صرف نسبتی طور پر کہا جاسکتا ہے۔ مثال کے طور پر کتا اور سور اپنے اپنے مقام پر اچھے ہیں اور اللہ کی صفات ان میں بھی جھلکتی ہیں لیکن ان میں سے کچھ صفات اس صفات کی متضاد ہیں کہ جو اس نے انسان کو بخشی ہیں۔ اس لئے ہمیں ان دونوں جانوروں سے برائی منسلک نظر آتی ہے۔ کسی بھی چیز کا اپنا وجود خالصتاً اچھا ہوتا ہے۔ لیکن برائی صرف اس وقت پیدا ہوتی ہے کہ جب اس وجود کی صفات کے سامنے کوئی متضاد صفات یا اسماء آجاتے ہیں۔ ایک صوفی نے کہا تھا کہ چار اربعہ عناصر (حس) اپنی اپنی جگہ پر

چلے جاتے ہیں اور روح صرف رہ جاتی ہے کہ جس میں اللہ کی تجلی چمکتی ہے۔

❖ ایک صوفی نے کہا تھا کہ اللہ ؐ کے ساتھ مجنوں بن کر رہو اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اپنے پر پہرہ رکھ کر رہو۔ یعنی کہ اللہ کے بندوں کے ساتھ مجنوں بن کر رہو کیونکہ ''عشق'' اسی ذات میں دیوانگی اور جنون ظاہر کرتا ہے اور وہ لوگ جو شرع کے پابند ہوتے ہیں ان سے اپنی ''عقل'' استعمال کرو اور ان سے عشق کی بات مت کرو۔

کسی عاقل نے کہا۔

''انسان کے ساتھ اس کی سمجھ کے مطابق بات کرو۔''

دیوانگی اور جنون اس ذات سے محبت و عشق ظاہر کرتا ہے اور باخبری اور ہوشیاری کا تعلق ''وحدت'' سے ہے یا آپ اس کو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی حقیقت کہہ لیجئے۔ یہ وہ مقام ہے جس کو ''می باش ومباش'' یعنی ''رہو اور نہ رہو'' کہتے ہیں۔ ''حقیقت'' کا مطمع نظر یا منزل مقصود ''شریعت'' ہوتی ہے۔ یعنی ''لا الہ الا اللّٰہ'' (اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں) شریعت کا مطمع نظر ہے اور محمد رسول اللہ (محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں) حقیقت کا مطمع نظر ہے۔ اس لئے ایک سے دوسرے میں قدم رکھیئے تا کہ ایک کامل انسان (مجذوب سالک) بن سکیں اور پھر ''مقام محمود'' کو پالیں۔ بغیر ''سکر'' (سود) کے آپ ''ساہو'' (بنیا) کا مقام حاصل نہیں کر سکتے۔ اس طرح جب تک آپ اپنے آپ کو نہیں بھولیں گے اور یہ جانیں گے کہ آپ نے اپنے آپ کو بھلا دیا ہے تو تب تک ایک کامل انسان کی کیفیت کا حصول ناممکن رہتا ہے۔ صرف فراموشی (سکر) اکیلی اس وقت تک مؤثر نہیں ہو سکتی جب تک کہ آپ اپنی ذات میں واپس نہ آئیں اور اس مقام فراموشی کو اپنے ساتھ پکڑ کر رکھیں (ساہو)۔ جب آپ پر عالم میثال کا سورج طلوع ہوتا ہے تو اس کا اثر اس قدر پکا اور پائیدار ہوتا ہے اگر آپ چاہیں تو فقط اس ایک دفعہ کے اثر کے ساتھ ایک ولی اور ایک Super Man بھی بن سکتے ہیں۔

جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو صرف ایک دفعہ معراج ہوئی۔ ڈاکٹر آر۔ ایم بیوک

جو کہ ایک کینیڈین فلسفہ دان ہے وہ کہتا ہے کہ وہ انسان جس کو عالم مثال کے متعلق یہ احساس چند منٹ کے لئے بھی ملتا ہے تو وہ شائد روحانی اعتبار سے کبھی بھی ایک عام (باخبر) آدمی کے مقام پر نیچے نہیں گر سکتا۔ خواہ اس شخص کی اس کیفیت کے بعد بیس، تیس یا چالیس سال ہی کیوں نہ گزر جائیں۔ لیکن وہ پھر بھی اپنے اندر ایک پاکیزہ، مضبوط اور بلند روحانی اثر کو محسوس کرے گا۔

❖ ''لا الہ الا اللہ'' (اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں) ''لا'' یعنی نہیں سے مراد اپنی ذات اور دنیا کی نفی کرنا ہے۔ ذات اور دنیا کی نفی اس طرح سے ہوتی ہے کہ سالک اپنی ذات کے حوالے سے فانی ہو جاتا ہے۔ لیکن اُس ذات پاک کے حوالے سے ''باقی'' رہ جاتا ہے اور اس لئے احدیت اکیلی باقی رہ جاتی ہے جو کہ فہم وادراک کی حد سے باہر ہے اس ضمن میں حقیقت محمدی صلی اللہ علیہ وسلم وہ پہلا مقام ہے کہ جہاں تک ذات اپنے آپ کو جان سکتی ہے۔

قدرت اللہ شہاب اپنی شہرہ آفاق تصنیف ''شہاب نامہ'' میں انتہائی خوبصورت انداز سے حقیقت محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کو حب محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کے سانچے میں ڈھالتے ہیں، فرماتے ہیں۔

> ''جس طرح ہر مسلمان کے باطن میں نور باطن کی کچھ نہ کچھ شعاعیں ضرور مستور ہوتی ہیں اسی طرح ہر صاحب ایمان کے دل میں حب رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور احترام رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا جذبہ بھی کسی نہ کسی حد تک یقیناً موجزن ہوتا ہے۔''

قدرت اللہ شہاب مزید فرماتے ہیں کہ جب میری عمر پانچ یا چھ سال کے قریب تھی تو اس زمانے میں مجھے اسلام سے کچھ خاص واقفیت نہ حاصل تھی۔ مسلمان گھرانے میں پیدا ہونے کی وجہ سے میکانکی طور پر کلمہ جانتا تھا اور دینیات کے نصاب سے بعض سورتیں اور دعائیں رٹ رکھی تھیں۔ آبادی سے دور ایک مجنوں صفت مجذوب نما شخص ویرانے میں بیٹھا

ہمہ وقت ''الا اللہ الا اللہ'' کی ضربیں لگا تا رہتا تھا۔ میں اور میرا ایک ہم عمر ہندو دوست اکثر اس کے پاس جا کر اس کا منہ چڑایا کرتے تھے اور اس کے ذکر کی نقلیں اتارا کرتے تھے۔ میرا ہندو دوست ''الا اللہ'' کے وزن پر کبھی کبھی فحش قافیہ جوڑ کر مذاق بھی اڑایا کرتا تھا۔ مجذوب نے ہمیں بار بار ڈانٹا کہ ہم اللہ کے نام کی بے حرمتی نہ کریں لیکن ہم باز نہ آئے۔ ایک روز ہم دونوں اسی مشغلے میں مصروف تھے کہ ایک شخص ادھر سے چند نعتیہ اشعار الاپتا ہوا گزرا، جس کا ایک مصرعہ یہ تھا

محمد نہ ہوتے تو دنیا نہ ہوتی

یہ مصرعہ سن کر میرا ہندو دوست زور زور سے ہنسنے لگا اور اس نے اسم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں کچھ گستاخیاں بھی کیں۔ میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، لپک کر ایک پتھر اٹھایا اور اسے گھما کر ہندو لڑکے کے منہ پر ایسے زور سے دے مارا کہ اس کا سامنے کا آدھا دانت ٹوٹ گیا۔ لاشعور کی نہ جانے وہ کون سی لہر تھی کہ جو اللہ کے ساتھ مذاق پر تو خاموشی رہتی تھی لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ گستاخی پر آناً فاناً جوش میں آ گئی تھی۔ اس ہندو دوست کا آدھا دانت توڑنے کے بعد مجھے شعوری طور پر احترام رسالت صلی اللہ علیہ وسلم کا احساس ہو گیا تھا اور باطنی طور پر اس احترام رسالت صلی اللہ علیہ وسلم کا کھلا مظہر وہ پوشیدہ حقیقت ہے جو ہر اچھے یا برے مسلمان کے لاشعور میں اسی طرح جاری و ساری رہتی ہے جس طرح کہ خون اس کی رگوں میں گردش کرتا ہے۔

تاریخ شاہد ہے کہ جن لوگوں نے ناموس رسالت صلی اللہ علیہ وسلم پر اپنی جان عزیز کو قربان کر دیا ان میں اکثر ظاہری طور پر نہ تو علم و فضل میں نمایاں تھے اور نہ ہی زہد و تقویٰ میں ممتاز تھے۔ ایک عام مسلمان کا شعور اور لاشعور جس شدت اور دیوانگی کے ساتھ شان رسالت صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں مضطرب ہے اس کی بنیاد عقیدے سے زیادہ عقیدت پر مبنی ہے۔ خواص میں یہ عقیدت ایک جذبہ اور عوام میں ایک جنون کی صورت میں نمودار ہوتی ہے۔ یہ جذبہ و جنون نہ تو کسی منظم تحریک کی پیداوار ہے اور نہ ہی کسی خاص Brain

Washing کا نتیجہ ہے۔ اس کے برعکس یہ تو ایک خودکار تخلیقی عمل کی طرح جنم لے کر فطرت انسانی کے ایسے نہاں خانوں میں پوشیدہ رہتا ہے جس کا ہمیں بسا اوقات خود بھی علم نہیں ہوتا۔ عقیدت کی حدت اور شدت کا یہ وسیع و عریض ہمہ گیر پھیلاؤ یقیناً اس آیت کریمہ کی منہ بولتی تصویر ہے۔

''ہم نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر بلند کر دیا۔'' (سورۃ الم نشرح، آیت ۴)

❖ تا عکس ہستی تو نماید در آئینہ
معبود تو خیال تو باشد ہر آئینہ

(یعنی جب تک آپ کے وجود کا عکس آئینہ میں رہتا ہے تب تک آپ کا معبود آپ کے اپنے خیالات رہیں گے)۔

جب تک آپ کے اپنے وجود کا عکس آپ کی فہم کے آئینہ میں رہے گا اور آپ ''آپ'' رہیں گے تو تب تک آپ کے معبود آپ کے اپنے خیالات رہیں گے اور آپ حقیقی وجود کے پردہ کے پیچھے ہی رہیں گے۔ جب آپ میں سے ''میں'' نکل جاتی ہے۔ تو اس ذات پاک کی ''میں'' داخل ہو جاتی ہے اور اپنے جمال کو آپ کی بے خبر ذات پر ظاہر کرتی ہے۔ ذات مطلق انسان ہی ہے یہ اشیاء تو آئینہ میں ایک محدود عکس کو ظاہر کرتی ہیں۔ جب تک یہ وجود کے عکس آپ کی فہم، سوچ اور تصور میں اشیاء ہیں تو تب تک جس چیز کو آپ ''جانیں'' گے یا ''پائیں'' گے تو وہ اشیاء ہی ہوں گی اور یہ چیزیں آپ کی عبادت کا حصہ ہوں گی نہ کہ حق کے وجود کو ظاہر کریں گی۔ حق یعنی سچ روح میں پوشیدہ ہے، روح قلب میں پوشیدہ ہے اور قلب قالب یعنی جسم میں پوشیدہ ہے۔ اس لئے آپ کو حق کو سمجھنا ہوگا اس طرح کہ جسم آپ کی نظر میں رہے۔

حق بے جاں اندر نہاں و جاں بدل اندر نہاں
اے نہاں اندر نہاں اندر نہاں اندر نہاں

❖ ایک درویش وہ ہوتا ہے کہ جو مجاہدہ اور مشاہدہ (یعنی وجود کا مشاہدہ) کی مشق کرتا ہے یا

پھر فنا اور بقا (یعنی قرب نوافل) کی۔

❖ ایک سالک جو کہ ابتدائی منازل میں ہوتا ہے اس کو جسمانی آرام و آسائش سے اجتناب کرنا چاہئے اور دوسری طرف ایک کامل صوفی اس کو اختیار کر سکتا ہے۔

حدیث قدسی ہے۔

"جتنا تم جسمانی آسائشوں کا مزہ اٹھاؤ گے اتنی ہی تمہاری پشت دوسری دنیا کی جانب پھر جائے گی۔"

لیکن جب ہم مقام "عارف" کو پاتے ہیں تو پھر یہ پابندی ایک عام سالک کی طرح نہیں رہتی۔

جیسا کہ علی بن عثمان جیلانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

"مجاہدہ تو بچوں کا کھیل ہے مرد کا اصل کام تو معرفت میں پوشیدہ ہے۔"

بشر حافی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے آپ کو "زہد" اختیار کرنے کی خاطر تمام جسمانی ضرورتوں سے دور کر دیا لیکن معروف کرخی رحمۃ اللہ علیہ نے ان سے فائدہ اٹھایا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ حافی رحمۃ اللہ علیہ ابھی ابتداء میں تھے لیکن کرخی رحمۃ اللہ علیہ اپنی انتہا کو پا چکے تھے۔ اس کی مثال اسی طرح ہے کہ جس طرح ایک ڈاکٹر اپنے بیمار مریض کو ایک پرہیزی زندگی گزارنے کا مشورہ دیتا ہے لیکن ایک صحت مند انسان کو ان تمام چیزوں سے فائدہ اٹھانے کے لئے کہتا ہے کہ جو اس نے بیمار مریض کے لئے بند کی ہوتی ہیں۔

حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

"جس نے مجھے آغاز میں دیکھا وہ صدیق (سچے ایمان والا) بن گیا اور جس نے مجھے انتہا کا دیکھا وہ زندیق بن گیا۔"

حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ مطلب ہے کہ شروع میں انہوں نے بھی اپنے اوپر جسمانی پابندیاں لاگو کر رکھیں تھیں تا کہ وہ مقام عارف کو پہنچ سکیں۔ اس لئے اس وقت جس نے انہیں دیکھا تو اس کے ایمان کو بھی اس جانب رغبت ہوگئی اور ایمان مضبوط ہو گیا۔

لیکن جب انہوں نے مقام عارف کو پالیا تو اس وقت ان کے لئے اس جسمانی پابندی کا پرہیز ختم ہو جاتا ہے اور اگر اس وقت کسی نے انہیں دیکھا تو اس کو اس جانب جستجو کی رغبت نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ دیکھنے والا "عارف" کو ان پابندیوں سے آزاد دیکھے گا اور اس کا ایمان متزلزل ہو جائے گا۔

❖ کچھ مشائخ یہ خیال کرتے ہیں کہ شکایت اور پریشانی کا اظہار صبر کے معیار کے متضاد ہوتا ہے اور بعض کا یہ بھی خیال ہے کہ اس قسم کا اظہار صرف غیر اللہ کے سامنے ہو سکتا ہے۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ انسان شکایت یا احتجاج اس دنیا کے سامنے کر سکتا ہے لیکن اللہ کے سامنے کسی قسم کا شکوہ کرنے کا واحد طریقہ انکساری اور آبدیدہ ہونا ہے۔ اس کے علاوہ دوسرے طریقوں سے شکوہ کرنا صرف دنیا کے سامنے جائز ہے لیکن اللہ کے حضور نہیں۔ انبیاء علیہم السلام اور اولیاء رحمہم اللہ جو کہ صبر اور برداشت کے معیار میں بہت مضبوط تھے وہ بھی انکساری، استدعا اور دعا کرنے سے پرہیز نہیں کرتے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود بھی اپنے وصال کے وقت یہ دعا کی تھی۔

"اے اللہ! موت کی کھڑ کھڑاہٹ پر میری مدد فرمانا۔"

❖ اگر سالک پر اپنے مقصد کے حصول کے درمیان حال کی کیفیت طاری ہو جائے تو اس کو مجذوب کہتے ہیں۔ لیکن اگر اس کی طبیعت میں حال کی بجائے چڑ چڑاپن اور بدمزاجی نمایاں ہونے لگے تو اس کو ہم "مجنوں" کہیں گے۔ دونوں صورتوں میں جب ان کے سامنے پردہ اٹھایا جاتا ہے اور وہ اس علم غیب میں جھانکتے ہیں۔ تو دونوں کی کیفیت میں فرق پڑتا ہے کہ مجنوں پر ایک بار پھر جنونی کیفیت طاری ہو جاتی ہے اور اس کی کوئی یادداشت باقی رہی نہیں اور مزید اس کے علاوہ کوئی دوسرا اثر نہیں پڑتا۔ یا یوں کہہ لیجئے کہ یہ کیفیت بار بار اپنے آپ کو دہراتی ہے کہ جب بھی اس کو پردہ کے پیچھے جھانکنے کا موقع ملتا ہے۔ دوسری طرف مجذوب پر اس کا اثر یہ پڑتا ہے کہ وہ کشف پر اپنے قدم مزید مضبوط کرتا چلا جاتا ہے یہاں تک کہ اس کا یہ مقام دوسرے جہاں میں بھی اسی طرح قائم رہتا ہے۔

❖ شیخ اکبر اپنی ''فصوص الحکم'' میں رقم طراز ہیں کہ ''عارف وہ ہوتا ہے کہ جو اللہ کو صرف چیزوں میں ہی نہیں دیکھتا بلکہ اللہ کو تمام چیزوں کی حقیقت تصور کر کے دیکھتا ہے۔'' اگر وہ اس سے انکار کرتا ہے تو فقط وہ اپنے ظاہر سے انکار کرتا ہے کیونکہ یہ اللہ کی شریعت کا تقاضا ہے ورنہ اس کا باطن تو ہر چیز میں اللہ ہی کو پاتا ہے اس لئے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قارون کے لئے غصہ صرف ظاہری طور پر تھا اور یہ کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا سامری کے بچھڑے سے انکار کرنا فقط ایک شرعی قانون کے تابع تھا۔ ورنہ ظاہر کے مقابلے میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے باطن نے حق کو ہی سامری کے بچھڑے کا باطنی پہلو پایا تھا۔

آپ یہ کہتے ہوں گے کہ یہ کیا میں نے شریعت کے خلاف کہہ دیا تو میں یہی کہوں گا کہ گھبرائیے نہیں یہی سچ ہے۔ کیونکہ سامری اگر گناہ گار ہوا تو اس کا گناہ صرف اتنا تھا کہ اس نے حق کو صرف ایک بچھڑے کی حد تک محدود کر دیا تھا۔ حالانکہ حق تو کائنات کی ہر چیز میں پایا جاتا ہے اور سامری اگر فقط ایک بچھڑے کی بجائے ساری کائنات میں رب کو تلاش کرنے کی دعوت دیتا تو میں اپنے ایمان کو حاضر و ناظر جان کر یہ کہہ سکتا ہوں کہ وہ منکر کی بجائے ولی کہلاتا ہے۔ اسی لئے تو کہا جاتا ہے کہ ولی کا کام تمام اشیاء کے آئینہ میں حق کا مشاہدہ کرنا ہے نہ کہ کسی خاص حد تک اپنے مشاہدہ کو محدود کرنا۔

❖ ''اس کی ذات اپنی ذات پر طلوع ہوتی ہے اپنی ذات کے ذریعے اپنی ذات کے ساتھ اور اپنی ذات میں ہی جذب ہو جاتی ہے۔ اپنی ذات کے ساتھ اور اپنی ذات کے ذریعے اور یکتا ہو جاتی ہے اور پھر ظاہری ہو جاتی ہے اپنی ذات کے ساتھ اور اپنی ذات کے ذریعے۔''

اس مقام پر پہنچنے کے بعد یہاں پر صفات کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ توحید کا مقام یا نکتہ صرف اسی ذات کی تجلی کو ظاہر کرتا ہے اور اگر سالک کو دوسروں کو نصیحت کرنا مقصود ہو تو اسے اس مقام سے نیچے آنا ہوگا۔ یعنی اس کی صفات کے ذریعے نصیحت کرنا ہوگی۔

❖ آزمائش اور زوال اس انسان کے لئے ہوتا ہے کہ جس کو اللہ نے کسی خاص کام کے

لئے منتخب کرنا ہو اور اگر وہ اس کے لئے منتخب نہیں ہو پاتا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اللہ سے ایک نئی اور خاص نسبت سے نہیں ابھرتا۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم ہوا۔ "جاؤ اور دنیا کے ساتھ مصروف ہو۔"

اویس قرنی رضی اللہ عنہ کو حکم ہوا کہ "آؤ اور انہی کے ساتھ ہولو" اس لئے یہ کہا جاتا ہے کہ جن کا انتخاب اس مقصد کے لئے نہیں ہو پاتا وہ خاندان اور دنیا کے لئے بے مقصد ہی زندگی گزارتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پابندیوں میں خاندان کے ساتھ زندگی کو اختیار کیا اور یہ دباؤ اچھائی کے لئے تھا۔

❖ انقلاب اسی راستہ پر قدم اٹھانے کی ہدایت کرتا ہے کہ جس کا ذکر میں اوپر بیان نکتہ میں کر کے آیا ہوں اور مسلک میں یہ انقلاب اللہ کی جانب ابھارتا ہے۔

جوہر جز خود شناسی نیست در بحر و جود
ما بگرد خویش می گردیم چوں گرداب ہا

(یعنی وجود کے سمندر میں اس سے بڑھ کر جواہر اور کوئی نہیں کہ اپنی ذات کے بارے میں علم و دانش حاصل کی جائے۔ ہم خود بھی اپنے گرد اس طرح گھوم رہے ہیں کہ جیسے گرداب کی گردش)۔

یہاں ہمارے اعمال میں بھی انقلاب پوشیدہ ہے ہمارے خیالات میں بھی اور ایک چھپے ہوئے شرک سے توحید کی جانب بھی۔ ہمیں یہاں پر کسی قسم کی نفی کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ جس چیز کا وجود ہی نہیں ہے اس کی نفی کس طرح ہو سکتی ہے۔ یہاں پر اس چیز کی زیادہ ضرورت نہیں کہ ہم اپنے اعمال اور خیالات سے ابھرنے والے انقلابات کی طرف زیادہ توجہ دیں۔ جیسا کہ اس پوشیدہ شرک سے توحید کی جانب رغبت کے متعلق انقلاب پر توجہ کی ضرورت ہے۔ زمانۂ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کے دوران جتنی کوشش شرک سے بھاگنے کے لئے کی گئی تھی اتنی کوشش سادگی اپنانے کے لئے نہیں کی گئی تھی۔ آپ جس چیز کو بھی "غیر" میں تصور کریں وہ حق ہی ہوگی۔ آپ اپنے آپ کو اور اس دنیا کو "غیر" میں تصور کریں اور اس

طرح سے حق کو اپنے آپ اور اس دنیا میں کشید ہوتا ہوا اور تفصیل میں پائیں۔ ؎

مغربی آنچہ تو آش می طلبی در خلوت
مے عیاں بر سر ہر کوچہ و کومی نیم

(یعنی او مغربی! تم جو کچھ اپنے اندرونی چیمبر میں تلاش کر رہے ہو وہ میں ہر گلی اور ہر سڑک کے موڑ پر ظاہر ہوتا ہوا دیکھتا ہوں)۔

عبادت، روزہ، چلہ اور تسبیح کرنے کا مقصد یہی ہے کہ ساحل سمندر کی ریتوں میں اور اپنے میں حق کا مشاہدہ کیا جائے۔ اگر آپ لہروں کا مشاہدہ کریں تو سمندر آپ کی نظروں میں نہیں رہے گا اور ان لہروں کا تصور عارضی ہے جبکہ اصل حقیقت تو پانی کی ہے۔ اس لئے یہ کہا جاتا ہے کہ اپنے وجود کو اس کے وجودِ مطلقیت سے ہی تصور میں لاؤ اور اپنی صفات اور اعمال کو اللہ کی صفات اور اعمال سے۔ اس کے لئے سب سے پہلے اپنی ذات کو مٹادو اور پھر جو کچھ آپ نے کھویا ہے یعنی ''گمشدہ ذات'' اس کو وجود میں تلاش کرو۔ اس تلاش کے ضمن میں سب سے پہلے اپنی ذات کو بالکل کالعدم سمجھو اور پھر حق کی مطلقیت کو اپنی حقیقت تصور کرو۔

❖ اللہ وہ ہے جو غیب کا جاننے والا ہے اور ''شاھداء'' کا بھی۔ اس کے اسماء ''اول'' اور ''باطن'' غیب کی نشاندہی کرتے ہیں اور ''آخر'' اور ''ظاہر'' شاھداء کی۔ ان میں جو کچھ ہے وہ اس کے علم میں شامل ہے اور یہ شریعت کی زبان ہے کہ جس میں وہ تمام علم شامل ہے کہ جس کا تعلق احدیت، الوہیت اور ربوبیت کے باطنی مراحل کے علاوہ ظاہری مراحل سے بھی ہے۔ جیسے کہ ارواح، امثال اور اجسام۔ جبکہ ایک صوفی کی زبان میں یہ مراحل غائب، شاہداء، ارواح، میثال اور اجسام ہیں اور ان کو ''حضرات خمسہ'' یعنی پانچ حسیں کہتے ہیں۔ یہاں پر غائب پھر ایک بار غیب الغیب اور غیب کے تحت ظاہر ہوتا ہے اور اس طرح سے شریعت کے مطابق یہاں پر بھی چھ مراحل پورے ہو جاتے ہیں۔

صوفیاء اور علماء دونوں میں جو مراحل مشترک ہیں وہ ارواح، امثال اور اجسام سے متعلق ہیں تو ضروری ہے کہ ان تینوں کی اصل حقیقت کو بھی اپنے پڑھنے والوں پر ظاہر کر دوں۔

چنانچہ حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ مکتوب نمبر ۳۴۴ میں ملا بدر الدین کو لکھتے ہیں۔

''صوفیاء کے عالم ممکنات کی تین قسمیں مقرر ہیں۔ عالم ارواح، عالم میثال، عالم اجسام۔ عالم میثال وہ ہے کہ جو عالم ارواح اور عالم اجسام کے درمیان برزخ کی طرح ہے۔ اور صوفیاء یہ بھی کہتے یں کہ عالم میثال باقی دونوں کے درمیان مثل آئینہ کے ہے کہ ان دونوں عالموں کے حقائق ومعانی کا عکس اس میں پڑتا ہے۔ عالم میثال میں باضابطہ کوئی ہیت واشکال نہیں ہیں۔ جس طرح آئینہ میں کوئی صورت اور شکل نہیں۔ اگر آئینہ میں کوئی شکل کوئی صورت ہے تو خارج سے آئی ہوئی ہے۔ روح، تعلق بدنی سے پہلے عالم ارواح میں رہتی ہے جو عالم میثال کے اوپر ہے اور بعد تعلق جسم کے عالم ارواح سے عالم اجسام میں اتر آتی ہے، اس عالم اجسام میں آنے کے بعد عالم میثال سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہوتا اور نہ پہلے عالم ارواح میں اس عالم میثال سے کوئی تعلق تھا صرف اس قدر ہے کہ اللہ تعالیٰ کی توفیق سے۔ بعض اوقات روح اپنے احوال کو عالم میثال کے آئینے میں مطالعہ کرتی ہے اور اپنی برائی اور بھلائی کو معلوم کرتی ہے۔ جیسا کہ واقعات اور خوابوں میں واضح روشن ہے۔ اور اکثر سالک کو جب استغراق نصیب ہو جایا کرتا ہے تو ایسی باتوں کو معلوم کرلیا کرتا ہے۔ اس جسم کی مفارقت کے بعد اگر روح ہے تو فوق کی طرف متوجہ ہو جاتی ہے اور اگر سفلی ہے تو اسفل میں گرفتار ہو جاتی ہے۔ عالم میثال سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ عالم میثال صرف دیکھنے کیلئے ہے نہ کہ رہنے کیلئے۔ رہنے کے لئے یا عالم ارواح ہے یا عالم اجسام۔''

سورۃ الحدید میں ارشاد ہوتا ہے۔

''وہی ہے جس نے آسمان اور زمین چھ دن میں پیدا کئے پھر عرش پر استواء فرمایا۔'' (حدید:4)

شریعت کونافذ کرنے والے اس کے بھیدوں اور رازوں کو عام انسانوں کے لئے افشاء نہیں کرتے۔ کیونکہ ایک پرانی کہاوت ہے ''انسان سے اس کی عقل کے مطابق بات کرو'' انبیاء کا تعین اس مقصد کے لئے نہیں کیا گیا تھا کہ وہ رازوں کو افشاء کریں ان کے لئے لازم تھا کہ وہ صرف اپنی شریعت کو مکمل کریں اور دوسری حقیقتوں کو پوشیدہ رہنے دیں۔ کچھ لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا'' انت احد ''؟ یعنی آپ احد ہیں؟ آپ نے جواب دیا'' انا احمد بلا میم ''یعنی ''نہیں! میں احمد صلی اللہ علیہ وسلم ہوں۔ بغیر ''م'' کے۔

احمد سے پیچھے ہے سدرہ کی سرحد
اک فرقِ 'م' ہے پھر وہ بھی احد
سنا ہم نے محشر ہے جلال کی حد
پر جو شافعی ہے اس کا جمال بھی احد

(مرتضٰی امین)

اس فرمان کا مطلب یہ ہوا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ''میں بندہ ہوں اور میری حقیقت حق ہے۔'' آپ کا یہ فرمان ظاہر کرتا ہے کہ آپ کی ظاہریت بشر کی ہے۔ لیکن آپ کی حقیت حق ہے اور حق نے جس سے خود کو ظاہر کیا وہ نور ہے۔ اس لئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ بشری حقیقت کے (نور) نے شریعت کا لبادہ اوڑھ رکھا ہے۔

جیسا کہ مشہور ہے۔

''سچا یقین برہنا ہے اور اس کا لباس رحم ہے۔''

اولیاء کا تعین اس مقصد کے لئے کیا گیا ہے کہ وہ ان رازوں اور بھیدوں کو برہنہ کریں۔ اس لئے وہ ان کی عام لوگوں کی مجلسوں میں وضاحت کرتے ہیں اور اگر اولیاء یہ نہ کرتے تو قرآن کے یہ راز ہمیشہ کے لئے پوشیدہ رہتے۔ اولیاء نے ایسے ایسے راز کھولے ہیں کہ جو انبیاء علیہم السلام نے اپنی انگلی تک سے چھوئے بغیر چھوڑ دیا تھا اس کو اولیاء نے کھولا اور منتشر

کردیا۔

حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

''میں ہی کہنے والا اور میں ہی سننے والا ہوں۔ دوسرا کون ہے جو دونوں جہانوں میں ہے۔''

ایک اور ولی اس طرح کہتا ہے۔

''کون ہے میرے چوغہ کے نیچے کون ہے سوائے اللہ کے۔''

اس کے علاوہ ایک اور کہتا ہے۔

''کون ہے یہاں ان دونوں جہانوں میں میری ذات کے سوا۔''

یہ تمام اس بیان کی تفصیل ہے کہ جو رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاصہ کو بیان کرتا ہے۔ یعنی (میں احمد ہوں بغیر ''م'' کے) اولیاء کی مثال رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ایسی ہی ہے کہ جیسے باجے کا وہ حصہ کہ جس کو منہ لگایا جاتا ہے وہ وہی ظاہر کرتے ہیں کہ جو انبیاء علیہم السلام کے الفاظ کے باطن میں چھپا ہوتا ہے۔

جیسا کہ مشہور ہوتا ہے۔

''بچہ اپنے باپ کے راز کا اظہار ہوتا ہے۔''

اس ضمن میں ایک دفعہ کچھ لوگوں نے حضرت میر حسن سعادت اور حضرت فخر الدین عراقی رحمہما اللہ سے کہا کہ جس چیز کا اظہار آپ نے اپنی کتابوں میں کیا ہے وہ آپ کے پیر شیخ حضرت بہاؤالدین زکریا رحمۃ اللہ علیہ میں نہیں ملتی اور یہ کہ انہوں نے اپنی طرف سے ایسا لکھ کر بدعت کی ہے۔ تو حضرت فخر الدین عراقی رحمۃ اللہ علیہ نے جواب میں کہا کہ

''ہم ان کے مرید ہیں اور مریدین اپنے پیروں کی زبان ہوتے ہیں جو کچھ پیر کے اندر ہوتا ہے اسی کا اظہار زبان سے ہوتا ہے۔ ہم چمچوں کی طرح ہیں کہ جس سے وہ سب کچھ نکال لیتے ہیں کہ جو ہنڈیا میں ہوتا ہے۔''

انبیاء علیہم السلام نے اپنے پیچھے ایک نقطہ چھوڑ دیا اور اولیاء نے اس کو ایک دائرہ کی شکل

دے دی یہ دائرے ہمیشہ کے لئے جنت میں رہیں گے اگرچہ وہ اس دنیا سے غائب ہو جائیں گے۔ کیونکہ ان کے لئے ایک ابدی دنیا ہے کہ جہاں تمام راز و بھید غائب ہو کر اپنا نیک صلہ پائیں گے۔ سوائے ان کے کہ جو صرف شریعت کے پیچھے چپک کر رہ جاتے ہیں۔ اور یہ وہ ہیں کہ ان پر یہ رحمتیں بھی حرام کر دی جائیں گی۔ کیونکہ انہوں نے ان رازوں سے انکار کیا۔ یہ وہ ہیں کہ جو اس دنیا اور انسان میں تجلی الٰہی کے مشاہدہ کے منکر رہے کہ جس کو ایک خاص تجلی حق قرار دیا گیا ہے۔

حدیث پاک میں آتا ہے۔

''میں نے اپنے رب کو ایک خوبصورت جوانی کے روپ میں دیکھا۔''

❖ اگر آپ خود کو ایک آئینہ میں دیکھیں تو آپ کی آنکھوں کی نور کی شعائیں آئینہ سے منعکس ہو کر آپ کے چہرہ پر پڑتی ہیں اور اس طرح سے آپ کو شیشے میں اپنا عکس نظر آتا ہے۔ چونکہ چہرہ ایک ہی ہے اس لئے ایک ہی چہرہ کا عکس نظر آئے گا۔ لیکن جب چہرے زیادہ ہوں گے تو پھر وہی آنکھ بہت سے چہروں کا عکس محسوس کرے گی۔ پھر اگر آپ اس آئینہ کو توڑ ڈالیں اور اس کے مختلف ٹکڑوں کو گوند کی مدد سے جوڑیں اور پھر اس میں اپنا چہرہ دیکھیں تو آپ کو اس ہر ایک ٹکڑے میں اپنا ہی چہرہ نظر آئے گا۔ اور آپ کو ایک جیسے بہت سے چہرے محسوس ہوں گے۔

اس ضمن میں جامی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

ع ایک بار فرد ہر کسی، بیچارہ جامی بارہا

(یعنی ہر کوئی صرف ایک دفعہ مرتا ہے لیکن بیچارہ جامی کئی بار مرتا ہے)۔

اس کی تشریح کچھ اس طرح سے ہے کہ جامی رحمۃ اللہ علیہ کا عکس کئی مرتبہ نمودار ہوا اور مٹ گیا۔ محسوس ایسے ہوتا ہے کہ جیسے چہرہ ایک ہی ہے اور آنکھیں کئی۔ جیسا کہ جڑے ہوئے شیشوں سے محسوس ہوتا ہے کہ چہرہ تو ایک ہی ہے لیکن شائد آنکھیں لاتعداد ہو گئی ہیں۔ اس طرز پر اس ذات کا جمال بھی کئی طرح سے عیاں ہوتا ہے اور ان تمام کو دیکھنے کے

لئے کئی آنکھوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ یعنی اس کی محبت کو پانے کے لئے کئی آنکھوں کی ضرورت ہے۔ اس لئے محبت کے اس کھیل میں وہ خود ہی عاشق بھی ہے اور حسن بھی۔ یعنی محبوب بھی خود ہی ہے۔ اس کے حسن کی ظاہریت لامحدود ہے اور محبت کا احساس بھی لامحدود ہے۔ لیکن انسان چشم محدود رکھتا ہے جس بناء پر محبت میں محدود ہی رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب کوئی اپنی محبت میں لامحدودیت کی جانب مائل ہوتا ہے تو محدود عقلیں اور محدود آنکھیں اس کی ایسی کیفیت کو شرک پر، پرکھتی اور دیکھتی ہیں اور وہ عاشق فقط سولی کی زینت بن کر ہی لامحدود محبت کو پا سکتا ہے۔ یہ حسن نہ تو صرف مشرق سے منسلک ہے اور نہ مغرب سے۔ اس کی نمود نہ تو صرف عرب تک محیط ہے اور نہ صرف عجم تک۔ اس کے حسن کو منعکس ہونے کے لئے کئی آئینے درکار ہیں تا کہ وہ اس طریقے سے اپنے حسن کو کئی اطراف سے ان مختلف شیشوں میں ظاہر کر سکے۔ آئینوں کی اس لاتعدادیت نے اس ایک حسن کے کئی پہلو نمایاں کئے ہیں تا کہ ہم ان پہلوؤں سے یکے بعد دیگرے فیض یاب ہو سکیں۔

جیسا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔

''میں اس (خدا) کو اس حد تک نہ جان سکا جتنا میں جاننا چاہتا تھا اور میں اس کو اتنا نہ دیکھ سکا جتنا میں دیکھنا چاہتا تھا۔''

❖ اس کے ہاں نہ کوئی چیز حقیقی شرک جیسی ہے اور نہ ہو سکتی ہے۔ کیونکہ شرک کا نفاذ کسی ''دوسرے'' کی شراکت سے ہوتا ہے تو پھر حلاج رحمۃ اللہ علیہ کیسے شرک کر سکتا ہے؟ وہ تو محبوب کے حسن کا مکمل احاطہ کرنا چاہتا تھا اور یہ اس وقت تک ممکن نہ تھا جب تک وہ اس مطلقیت کل میں کھو نہ جاتا اور جو ''انا الحق'' کہا تو اس سے مراد یہی تھا کہ حضرت حلاج رحمۃ اللہ علیہ جو اس وقت لامحدود حسن میں غرق تھے۔ بس وہی حسن تمام اطراف سے حق ہے یعنی یکتا ہے۔ یا یوں کہیئے کہ حضرت حلاج رحمۃ اللہ علیہ کی زبان، رب کی زبان بن گئی جو برملا اپنی یکتائی کا اعلان کرتی ہے۔ اس کے علاوہ تو یہاں پر کوئی غیر نہیں کہ جو حق کے مقام وحدت کو چھو سکے۔ اس صورت میں جب غیر کی مکمل طور پر نفی کر دی جاتی ہے تو پھر کوئی

مشرک نہیں ہوسکتا۔ خواہ وہ کتنا ہی اپنے آپ میں یکتا ہونے کی کوشش کرے۔ حق کی اصل حقیقت تو اپنے اوپر کئی طرح سے لبادہ اوڑھے رکھتی ہے کہ جس کو عام انسان اپنے تصور میں غیر سمجھ لیتا ہے اور اس کی ذات کو لاتعداد محسوس کرتا ہے۔ لیکن حقیقت میں وہ لبادہ کوئی غیر نہیں ہوتا اور نہ ہی کوئی بہتات ہوتی ہے۔ کیونکہ جو ظاہر ہے وہ حقیقت سے ایک بڑی مختلف چیز ہے۔ ظاہر کا اپنا کوئی وجود نہیں ہوتا یہ تو صرف حقیقت سے متعلق ایک تصور ہے کہ جس نے اپنے آپ کو ہی اپنے پر ایک غیر معیاری تصور میں ظاہر کیا ہے۔ یہ تصوراتی شرک کہ جو ایک تخیلاتی ظاہریت کی پیداوار ہے ایک ایسی کاوش ہے کہ جو حقیقت کی تجلی میں غائب ہو جاتا ہے۔

جیسا کہ سورۃ بنی اسرائیل میں آتا ہے۔

''حق آ گیا اور باطل مٹ گیا۔ بے شک باطل کو مٹنا ہی تھا۔'' (اسراء:81)

ظاہر ہے کہ وجود کی کوئی حقیقی تہہ نہیں ہوتی اور جو کچھ بھی یہ دیکھتا ہے وہ اس سے حتمی طور پر غائب ہو جاتا ہے اور جب یہ غائب ہوتا ہے تو پھر فقط ایک دائمی شکل ہی باقی رہ جاتی ہے۔ یہ اس طرح ہے کہ جیسے ایک عورت کی پوشاک سے مرد نمودار ہو اور جب اصل حقیقت خود جانچنے لگے تو وہ زنانہ پوشاک بغیر کسی نتیجہ کے غائب ہو گئی۔ اس لئے کہ زنانہ پن صرف ایک ظاہریت ہے اور یہ زنانہ پن کسی دائمی حقیقت کا اصل نہیں ہے اس لئے اپنی ہی نفی کرتا ہے۔ اس لئے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ حقیقت ان منفی نظریات پر حاوی ہو جاتی ہے۔

سورۃ مؤمن میں ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

''آج کس کی بادشاہی ہے کہ ایک اللہ سب پر غالب کی۔'' (مومن:16)

❖ شر ظاہر سے ابھرتا ہے اور ظاہر کا تعلق فہم و ادراک سے ہے اور جو کچھ بھی اس فہم سے وابستہ ہے وہ ''اعتبار'' ہے اور ''اعتبارات'' قیاس آرائی سے ہوتے ہیں اور اس طرح سے یہ دنیا ایک تصور بن جاتی ہے۔ لیکن یہ خیال مت کیجئے گا کہ ہم اس دنیا کو فقط ایک تصور کہہ رہے ہیں بغیر کسی حقیقت کے۔ ہمارے کہنے سے مراد فقط یہ ہے کہ حقیقت تصور کی مختلف

اشکال میں ظاہر ہے۔ دنیا کا وجود تو ہے لیکن ایک سوچ و بچار کرنے والے کے تصوراتی تخیل میں۔ یہ مت سمجھیں کہ تصور فقط ایک قیاس ''اعتبار'' ہے اور یہ قیاس بھی ''قدیم'' (مستقل) نہیں ہوسکتا۔ اگر آپ ایسا خیال کریں گے تو پھر آپ کے نزدیک علم الٰہی کی کوئی حقیقت باقی نہ رہے گی اور یہ نامکمل ایمان کی نشاندہی ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ ہماری حقیقت فہم جھوٹی ہے اور اللہ کا علم تو لامحدود اور مستقل ہے اور جس طرح سے وہ ''قدیم'' ہے اسی طرح سے اس کے ''اعتبارات'' باقی رہنے والے ہیں اور ان مستقل اعتبارات کو اس کی صفات کہتے ہیں۔ یہ صفات فقط اس کے علم میں ''اعتبارات'' ہیں اور جب یہ غائب ہوجاتے ہیں تو اکیلی ذات باقی رہ جاتی ہے۔ اس کے علاوہ اس کی ذات میں اس کی ذات کے سوا کچھ نہیں ہے اور پھر یہ صفات فقط اس ذات کے نشانات کے سوا اور کیا ہوسکتی ہیں؟ جب ذات نے خود کو اپنے پر ظاہر کیا تو صفات سے منسلک فہم و ادراک نے جنم لیا اور پھر اعتبارات جن کو آپ صفات کا نام دیتے ہیں وہ فہم و ادراک کے آئینہ میں ظاہر ہوئے اور اس آئینہ میں اپنے وجود کی ظاہریت کو حاصل ہے۔ اس طرح سے اس ایک مطلقیت نے اپنے آپ کو اعتبارات اور صفات کے ساتھ اہل علم کے لئے متلاشی بنادیا اور ایک ظاہری آنکھ کے لئے اپنے آپ کو مطلقیتی یکتائی سے ایک تصوراتی لاتعدادیت تک اتارلیا۔

یہاں پر ایک بات غور طلب ہے کہ یکتائی سے لاتعدادیت تک کا یہ سفر دو مقامات پر مشتمل ہے ایک وہ مقام ہے کہ جس کو ہم مقام علم و فہم کہتے ہیں اور دوسرا مقام اس علم و فہم کی مختلف صورتوں پر مشتمل ہے۔ پہلے مقام تک مطلقیتی یکتائی قائم رہتی ہے اور تصوراتی لاتعدادیت اس مقام پر جنم نہیں لیتی۔ لیکن جب ہم دوسرے مقام پر منتقل ہوتے ہیں یعنی فہم وادراک کی آگے کی تقسیم اور اس کی مختلف صورتوں کا تجزیہ کرتے ہیں تو پھر ہمیں لاتعدادیت کا نظریہ سمجھ میں آتا ہے اور اس طرح سے یہ اصل تعداد ہمیں اس اصل مطلقیت کا احاطہ کرتے ہوئے نظر آتی ہے۔ پھر جب اس کے بعد کوئی اس کی مطلقیتی یکتائی کو نہیں سمجھ سکتا تو وہ مشرک ہوجاتا ہے (حالانکہ وہ حقیقی شرک میں مبتلا نہ بھی ہو لیکن اس کی یکتائی کو نہ سمجھنا بھی

اس ضمن میں ہی آتا ہے)۔ اس لئے مشرک وہ ہوتا ہے جو وحدت میں اپنا مقام نہیں پا سکتا ہے اور اپنے آپ کو فقط لاتعدادیت کے پردہ میں پہچاننے کی کوشش کرتا ہے اور اپنے آپ میں ''عارف'' نہیں بنتا۔ اس طرح سے مشرک اور کافر اپنی پہچان حاصل کرتے ہیں اور انبیاء علیہم السلام کو ان لوگوں کی رہنمائی کے لئے بھیجا جاتا ہے۔ یہ ظاہری صورتیں، رخ جمال پر ایک پردہ کی مانند ہوتی ہیں اور بعض لوگوں کیلئے اس پردہ کے ایک کونے کو اٹھایا جاتا ہے فقط چند سیکنڈ کے لئے اور دوسرے لوگوں کیلئے یہ کبھی نہیں اٹھتا اور یہ وہ ہیں کہ جو ہمیشہ کے لئے پردہ کے پیچھے ہی رہتے ہیں۔

سورۃ بقرہ میں آتا ہے۔

''وہ دوزخ والے ہیں ان کو ہمیشہ اس میں رہنا ہے۔'' (بقرہ:81)

وہ لوگ جن کے لئے یہ پردہ اٹھتا ہے وہ بہشت والے ہیں اور ان کو جمال پر زندہ رکھا جائے گا اور پردہ والوں کو جلال کے لئے زندہ رکھا جائے گا اور ان جمال پر زندہ رہنے والوں کے لئے ایک طرف تو دودھ اور شہد ہے تو دوسری طرف زیتون کے درخت کا رس اور پھل وغیرہ۔ یہ وہ خیالات ہیں جن کا تعلق حق سے ہے اور جو ہم پر ظاہر ہوتے ہیں۔ اس نے اپنے اوپر اچھائی کا بھی لبادہ اوڑھ رکھا ہے اور قہر کا بھی، رحم کا بھی اور بزرگی کا بھی۔ اور کسی کو یہ اختیار نہیں کہ وہ اس کے ساتھ شریک ہو سکے۔

سورۃ مائدہ میں آتا ہے۔

''بے شک اللہ حکم فرماتا ہے جو چاہے۔'' (مائدہ:1)

❖ شر کی ابتداء ''کثرت'' سے ہے۔ اس ذات واحد نے اپنے آپ پر کئی لاتعداد لبادے اوڑھ رکھے ہیں۔ اس بناء پر اگر انسان فقط اس لاتعدادیت پر انحصار کرے گا اور ان لبادوں کے نیچے چھپی ذات واحد کو نہیں پہچانے گا تو یہ شرک کہلائے گا۔ ہم اس کی صفات کو لاتعدادیت کے آئینہ میں دیکھ سکتے ہیں۔ لیکن ان سب صفات کا تجزیہ کرنے کے بعد ہمیں نچوڑ فقط ایک ذات واحد کا حاصل ہونا چاہئے۔ اس نے اس دنیا کو اپنے جمال سے لبھایا ہے

اور پھر اس کو ایک حجاب کی آڑ میں کر دیا۔ اور پھر وقفہ وقفہ سے بعض لوگوں کے لئے کبھی ایک کونے سے تو کبھی دوسرے کونے سے اس حجاب جمال کو اٹھاتا رہتا ہے۔ حالانکہ اس حجاب سے مراد اس ذات باری تعالیٰ کا اپنا ہی ظاہری بناؤ سنگھار ہے نہ یہ کہ وہ اس حجاب سے اپنی ذات مطلقیت کو پوشیدہ رکھتا ہے۔ یہ اس طرح ہے کہ جس طرح سہاگ رات میں دلہن خود کو خوبصورت گھونگھٹ کی آڑ میں رکھتی ہے کہ جس سے دولہا اس کی ظاہریت سے متاثر ہو کر اس کی اصل حقیقت کو بے نقاب کرے اور اس کی اصل سے وصل پائے یا یوں کہہ لیجئے کہ یہ حجاب فقط ایک احساس رغبت ہے یہ پردہ چند خیالات سے منسلک ہے اور اس پردہ کو اٹھانے سے مقام ''وصال'' حاصل ہوتا ہے۔

❖ حالت عبادت میں سالک کو چاہئے کہ وہ اپنی ذات کو بھی خود سے کالعدم رکھے تا کہ وہ لاتعدادیت اور کثرت جو اس معبود حقیقی کے ساتھ شراکت کے وجود میں آتی ہے اس سے اجتناب کیا جا سکے۔ یہاں تک کہ خود عبادت بھی اپنی حقیقت کو اس میں معدوم پائے۔

غوث جو کہ محفوظ و سرفراز پر ہیں ان کا یہی نظریہ ہے۔

''کہ اللہ خود ہی عبادت گزار بھی ہے اور لائق عبادت بھی۔''

عبادت کے دوران آپ خود کے ہی عبادت گزار بن جاتے ہیں اور آپ کو عبادت کے لئے کسی خاص شکل کو تراشنے کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ لیکن یہ نظریہ اس کے برعکس ہے کہ آپ خود کو اللہ کا ''دوسرا'' تصور کریں اور اللہ کو اپنی ذات کا ''دوسرا''۔ اس صورت میں آپ نے شرک کی بنیاد بچھا دی ہے۔ یہ تصور غیر اس وقت جنم لیتا ہے کہ جب کسی ''دوسرے'' کا وجود ممکن ہوتا ہے۔ لیکن جہاں ہر کوئی دوسرا نہیں ہوتا وہاں صرف ایک ہی وجود اپنے یکتا رہتا ہے۔ اللہ کا ''دوسرا'' وقت کے آغاز سے ہی کبھی پیدا نہ ہوا تو پھر کیوں اپنے آپ کو ''دوسرا'' کہہ کر پکارتے ہیں۔ یہی ''انا الحق'' کی بنیاد ہے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد پاک ہے۔

''میں احمد ہوں بغیر ''م'' کے۔ (یعنی اللہ کی کل مطلقیت آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر

ظہور پذیر ہوئی نہ کہ اللہ کی حقیقت۔ اللہ کی مطلقیت بھی حقیقت کی مانند احد ہے۔فرق صرف یہ ہے کہ اس کی اپنی مطلقیت مختلف تناسب سے مختلف اوقات میں مختلف افراد پر ظہور پذیر ہوتی رہی اور جو اس کی مطلقیت کا سب سے زیادہ حامل ہے وہی اس کی حقیقت سے بھی قریب ترین ہے۔ اور یہ وہی ہوسکتا ہے کہ جو اگر درخت کو اشارے کرے کہ جھومتا ہوا چلا آئے، اگر چاند کی جانب اشارہ کرے تو دو ٹکڑے ہو جائے اور اگر سورج کو اشارہ کرے تو وہ واپس لوٹ آئے۔ کیونکہ وہ رب کریم کی کل مطلقیت کا ظاہر ہے)۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس بیان سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم احمد سے احد بن جاتے ہیں یعنی وہ اپنی ذات کے شعور کو بھی اس ذات میں فنا پاتے ہیں۔ جب سالک اس مقام کو پالیتا ہے تو اس کے جسم کا ہر ایک بال ''انا الحق'' پکار اٹھتا ہے۔ لیکن اگر عابد اپنی ذات میں اپنے رب کو تصور نہیں کرسکتا تو اس کو اس کی عبادت میں کسی سمت کی ضرورت درپیش آتی ہے۔

سورۃ بقرہ میں ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

''تم جدھر منہ کرو ادھر وجہ اللہ۔'' (بقرہ:115)

اگر عابد اپنی طرف بھی توجہ کرے تو تب بھی اللہ کا ہی چہرہ سامنے آتا ہے۔ عابد کو چاہیئے کہ وہ اپنی ذات کو خود میں ہی کالعدم کر دے اور اس میں اپنے رب تک رسائی کی کوشش کرے اور پھر اپنی ذات کو ایک سمت میں وقف کر دے۔

سورۃ انعام میں آتا ہے۔

''میں نے اپنا منہ اس کی جانب کیا جس نے آسمان اور زمین بنائے۔''

(انعام:80)

مختصراً یہ کہ خود کو اپنی ہی طرف پھیر لو کیونکہ وہاں کوئی ''غیر'' نہیں ہے۔

- کفر کی اگر تعریف کرنا مقصود ہو تو وہ اس طرح ہے کہ جس طرح ایک بیج کو زمین میں

چھپا دیا جائے۔ لیکن تکنیکی طور پر یہ حق کو ڈھانپنے کا نام ہے۔ اس لئے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ شخص جس کے مشاہدہ سے حق چھپا رہے وہ کافر ہے۔ اس کے دیدۂ ذہن میں باطل کے سوا اور کسی چیز کا مشاہدہ نہیں ہوتا ہے۔ اس کو تشبیہی یا ظاہری کفر کہتے ہیں۔ حقیقی کفر یہ ہے کہ انسان اپنی ''میں'' کو اللہ کی الوہیت سے ڈھانپ دے اور اس کفر میں شریعت کے برخلاف کام کرنا کوئی نقصان نہیں پہنچاتا اور یہ اسی طرح ہے کہ اگر حلق میں کوئی لقمہ اٹک جائے تو شراب کا ایک گھونٹ نقصان کی بجائے سکون پہنچاتا ہے۔ سالک یہ سب کچھ اپنے پیر کی ہدایات کے تحت کرتا ہے۔

جیسا کہ ایک حافظ صاحب کہتے ہیں۔

''اپنی جائے نماز کو شراب میں رنگ دو اگر تمہارا کامل پیر اس کی ہدایات کرے اور اس طرح سالک اپنے راستے کی رسمی وابستگی والفت سے کبھی بھی بے خبر و غافل نہیں ہوسکتا۔''

یہ کفر حقیقی اصل میں ''فنا فی اللہ'' ہے جس کو دوسرے الفاظ میں ''بے خودی'' اور ''فقر'' وغیرہ بھی کہا جاسکتا ہے۔ ایک فقیر ایک مرتبہ حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ کی خانقاہ میں داخل ہوا اور کہا ''الحمدللہ''۔ حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا! جس طرح اللہ تعالیٰ نے کہا ہے اس طرح کہو۔ یعنی اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۔ فقیر نے کہا کہ وہ دنیا کہاں ہے کہ جس کی میں اپنے اللہ کے ہمراہ نشاندہی کروں؟

یہ فقیر مقام ''فنا'' میں گم تھا اور اس کو اللہ کے سوا باقی تمام چیزیں بے حقیقت اور بے وجود نظر آتی تھیں۔ اور حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ مقام ''بقاء'' میں تھے کہ جس میں وہ اس مشاہدہ کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ جو اس ذات کے عکس سے متعلق ہے کہ جو انہوں نے ان بے وجود و بے حقیقت اشیاء کے آئینہ میں پایا ہے۔

❖ مقام فنا میں سالک ہر قسم کی باخبری کو کھو دیتا ہے لیکن اس کا وجود صفات اور اعمال غائب نہیں ہوتے۔ یہاں پر باخبری سے مراد مختلف انبیاء علیہم السلام کا علم و واقفیت ہے اور

ان چیزوں سے متعلق ''دوسرے'' کا احساس ہے۔ مقام فنا میں سالک کے علم وفہم میں ان اشیاء کا کوئی اپنا وجود باقی نہیں رہتا اور نہ ہی ان چیزوں سے متعلق کسی ''دوسرے'' کا احساس باقی رہتا ہے۔ اگر یہ کیفیت ایک سالک پر زیادہ دیر تک کے لئے حاوی رہے تو اس کو ''جذب'' اور ''جنون'' کہتے ہیں۔ اور جس پر یہ کیفیت ایک منٹ تک کے لئے رہتی ہے اس کو ''ولی'' کہتے ہیں اور اگر زیادہ دیر تک رہے تو وہ ''غوث اور قطب'' کہلاتا ہے۔

❖ ایک عابد کا اپنے رب کی جانب واصل ہونا حقیقی طور پر رب کا عابد کی جانب وصل ہے۔ لیکن جب تک خود وہ ذات ایزدی نہ چاہے عابد، اللہ کی جانب رغبت حاصل نہیں کرسکتا۔ یہ تو خالصتاً اللہ کا فضل ہے جسے چاہے عطا کرے۔ اسی لئے سلوک کو خالصاً ''جذب'' کہا گیا ہے۔ سالک اس وقت تک اپنے اللہ کی جانب رخ نہیں کرسکتا جب تک اللہ ''فرق'' سے ''جمع'' کی طرف رخ نہ کرے۔ انسان اس وقت تک اپنی ذات میں گم رہتا ہے جب تک کہ کسی ''دوسرے'' کا خیال احاطہ ذہن میں داخل نہیں ہوتا۔ ''فنا فی الذات'' اور خلوت سے مراد تمام خیالات کا ذہن انسانی سے غائب ہو جانا ہے کہ جن کا تعلق کسی دوسری ذات سے ہوتا ہے۔

❖ جب ایک انسان حالت نیند میں بھی باخبر رہتا ہے یعنی وہ ذہنی اعتبار سے نہیں سوتا اور اس کی آنکھیں صرف بند ہوتی ہیں اور اس حالت میں ذکر وفکر میں مشغول رہتا ہے تو اس کے لئے جاگنا اور سونا، زندگی اور موت ایک جیسے ہو جاتے ہیں۔

حضرت ابوسعید خدری رحمۃ اللہ علیہ ذکر کی تعریف کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

''ذکر کی تین اقسام ہیں ایک ذکر زبان سے ہوتا ہے اور دل اس سے غافل ہے اور یہ ذکر عادت میں داخل ہے۔ دوسرا وہ ذکر ہے جس میں زبان خاموش ہو اور دل حاضر ہو یہ طلب ثواب کا ذکر ہے۔ تیسرا ذکر یہ ہے کہ زبان کو گونگا بنا دے اور دل سے حق تعالیٰ کا ذکر کرے اور اس ذکر کی قدر سوائے حق تعالیٰ کے اور کسی کو نہیں۔''

❖ کھانے کے اوقات میں اس امر کو تصور میں رکھنا چاہئے کہ دینے والا ایک خدائی اسم ہے "منعم" کا اور آپ کے ہاتھ خدائی اسم ہے "رازق" کا، اور آپ کا پیٹ یا معدہ ایک کیانی اسم ہے "مرزوق" کا۔ پیتے وقت پانی کو الہامی نام "حیی" سے تصور کریں یعنی "حیی" (زندگی دینے والا) کو اس طرح تصور کریں کہ وہ پانی کی شکل میں ہے اور ذہن و جسم کو سیراب کرتا ہے۔

❖ دنیا کی تمام جمالی اشیاء ایک قسم کا حجاب ہی ہیں جب تک کہ آپ ان میں اللہ کو نہ پا لیں۔ بعض عابد تو اسی بناء پر ان تمام جمالی تصویروں سے اپنا تعلق ہی منقطع کر لیتے ہیں کہ کہیں یہ پردہ ہمیشہ کے لئے ان کی راہ میں رکاوٹ نہ بنا رہے۔

جیسا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دفعہ اپنے ایک جوتے کو پھینک دیا کیونکہ وہ عبادت کے دوران انہیں چبھتا تھا۔ ایک عابد اس کو اس وقت تک قبول کرتا ہے کہ جب تک زندگی کا سہارا قائم ہے۔

حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ نے ڈیڑھ سال کے لئے ٹھنڈا پانی پینا چھوڑ دیا۔ لیکن ایک "عارف" ان تمام اچھی چیزوں کے آئینہ میں عطا کرنے والے کے چہرہ کا مشاہدہ کرتا ہے اور ان تمام چیزوں کو اختیار کرتا ہے۔ لیکن پھر وہ ان کو چھوڑ دیتا ہے کہ جب محسوس کرتا ہے کہ وہ ان چیزوں میں مشاہدہ نہیں کرسکتا۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے۔

"مجھے تیری دنیا کی تین چیزوں سے محبت ہے یعنی خوشبو، عورت اور میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز۔"

ایک سالک کی نظر میں ان تمام اشیاء کی افادیت کا چٹخارہ غائب ہو جاتا ہے کہ جب وہ ان تمام چیزوں کے دینے والے کی تعریف میں لگ جاتا ہے۔

❖ انسان جو کہ اللہ کی سب سے معزز اور باآبرو تخلیق ہے وہ خود ہی اپنے آپ کو دیگر تخلیقات جیسے درخت اور پتھر وغیرہ کے سامنے بےآبرو کرتا ہے۔

سورۃ جاثیہ میں ارشاد ہوتا ہے۔

''اور تمہارے لئے کام میں لگائے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں اپنے حکم سے۔'' (جاثیہ:13)

انسان کی تذلیل، خواہش سے ابھرتی ہے۔ وہ خواہش کہ جس کا تعلق جائیداد اور مرتبہ سے ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ اگر دیکھا جائے تو اللہ کی عبادت بھی جنت کی لالچ کی خواہش سے جنم لیتی ہے۔ جب انسان اپنے رب کی خواہش کرتا ہے تو یہ خواہش اس کی محبت میں تجلی کا ایک عکس ہوتی ہے۔ جب انسان اپنے اصل مقام کی جانب اوپر بڑھتا ہے تو وہ اپنے آپ کو ان تمام مادی خواہشات سے جدا کر لیتا ہے اور حقیقی محبوب کے ساتھ وابستگی اختیار کر لیتا ہے۔

❖ شیخ اکبر فرماتے ہیں۔

''عارف وہ ہوتا ہے جو ہر چیز میں اللہ کو دیکھتا ہے۔''

عارف نہ صرف چیزوں میں اللہ کو دیکھتا ہے بلکہ وہ ان چیزوں کی حقیقت میں بھی اللہ کو پا لیتا ہے۔ اس طرح وہ اس ضمن میں اپنے باطن سے بھی انکار نہیں کرتا۔ (کیونکہ وہ اس باطن کو بھی اللہ کی حقیقت تصور کرتا ہے) اگر وہ اس سے انکار کرتا ہے تو یہ ظاہر واقعات و حالات کا نتیجہ ہوگا۔ جیسا کہ شرعی قوانین ان کے بارے میں حکم جاری کرتے ہیں۔ کیونکہ شریعت، ظاہریت پر لاگو ہوتی ہے اور یہ بندے کی باطنی حقیقت اور ذات الٰہی میں ایک پردے کا کام کرتی ہے (یعنی ذات الٰہی کو بندے پر مکمل واضح نہیں کرتی)۔ اس لئے اولیاء کے نزدیک مقام بقاء اور فنا میں ان شرعی قوانین کا مقصد ختم ہو جاتا ہے۔ کیونکہ ان کا تعلق فقط ظاہر سے ہے اور یہ اس حق (یعنی ذات باری تعالیٰ) سے محجوب (یعنی پردہ میں) کر دیتی ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ جس بناء پر موسیٰ علیہ السلام قارونی سے بیزار تھے۔ کیونکہ وہ جستجو تو معبود اعظم ہی کے لئے کرتا تھا لیکن قوانین شریعت سے ہٹ کر کرتا تھا۔ یہاں پر میرے کہنے کا مقصد ہرگز یہ نہیں ہے کہ انسان کو شریعت سے اختلاف رکھنا چاہئے بلکہ یہ کہنا ہے کہ شریعت ایک سیدھا سادھا راستہ ہے جو انبیاء علیہم السلام نے اپنایا۔ لیکن مقام ولایت وہ

ہے کہ جہاں پر پہلے تو شریعت پہ عمل کیا جاتا ہے۔لیکن پھر بعد میں اس ذات کی مطلقیت میں مقام فنا کے حصول کے لئے دروازہ کی ضرورت پڑتی ہےلیکن گھر میں رہتے ہوئے دروازہ کا عمل دخل ختم ہو جاتا ہے۔ اس مثال میں دروازہ ''شریعت'' ہے تو اندرون گھر ''طریقت''۔شریعت کا تعلق ظاہر سے ہےاور مقام فنا و بقاء کا تعلق باطن سے۔اس راستے میں رکاوٹیں بے شمار ہیں اور ان رکاوٹوں کا مقصد ان کو اختیار کرنے اور برداشت کرنے والوں کے حق میں ہوتا ہے جو ان کو قبول نہیں کرتے وہ منافقین کہلاتے ہیں اور رب الارباب کے جلال اور خفگی کا نشانہ بنتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ گزشتہ انبیاء علیہم السلام کا اپنے پیروکاروں پر غصہ اسی لئے تھا کہ یہ بعد والا راستہ سیدھا اور آسان نہ تھا اور وہ اس راستہ کی سختیوں سے گھبرا کر معجزات کے طلب گار ہوتے تھے۔ایک عارف اللہ کا مشاہدہ اس دنیا کی تمام ظاہری صورتوں میں کرتا ہے۔ایک کامل عارف وہ ثابت ہوتا ہے کہ جو ان رکاوٹوں اور پابندیوں کا بغور تجزیہ کرتا ہےاور خود کو ان سے پیدا شدہ مشکلات سے وابستہ و پیوستہ کر لیتا ہے۔

سورۃ طلاق میں آتا ہے۔

''اور جو اللہ کی حدوں سے آگے بڑھا بے شک اس نے اپنی جان پر ظلم کیا۔''

(طلاق:1)

وہ اس کے اسماء کا اس کی تمام ظاہری صورتوں میں مشاہدہ کرتا ہےاور ساتھ ہی انبیاء علیہم السلام کے راستے کو بھی اپناتا ہےاور لاتعدادیت اور کثرت کے پردہ میں نہیں چھپتا۔ اس مقام کو جم الجم کہتے ہیں (یعنی جس میں انبیاء علیہم السلام کے راستے اور اسماء مل کر ابھرتے ہیں)۔

سورۃ رحمٰن میں ارشاد ہوتا ہے۔

''اس نے دو سمندر بہائے کہ دیکھنے میں معلوم ہوں ملے ہوئے اور ان میں روک ہے کہ ایک دوسرے پر بڑھ نہیں سکتا۔'' (رحمٰن:19-20)

یہ دو سمندر عارف میں ایک دوسرے سے مل جاتے ہیں۔

❖ ''ایک'' کا مشاہدہ ''کئی'' میں کیا جاتا ہے۔

جیسا کہ ایک مقام پر ارشاد ہوتا ہے۔

''کیا تمہارا رب ہر شئے پر شاہد نہیں۔'' (حم سجدہ:53)

مشاہدہ کرتے وقت عاشق خود ہی محبوب ہوتا ہے کیونکہ جب سالک اس ذات پاک کی صفات کو ایک محبوب میں رکھ کر کھو جاتا ہے تو وہ چونکہ خود بھی اپنے آپ میں اس ذات پاک کو محسوس کر رہا ہوتا ہے۔ اس لئے اس کو اپنے میں ہی یہ دوہرا پن (یعنی عاشق اور محبوب کا) نظر آتا ہے۔

❖ انسان جمال الٰہی کا آئینہ ہوتا ہے۔ ایک خوش لباس انسان اتنا خیال اپنے لباس کے بناؤ سنگھار کا نہیں رکھتا کہ جتنا وہ اس آئینہ کا رکھتا ہے جس میں وہ اپنے آپ کو دیکھتا ہے۔ اگر ایک لمحہ کیلئے بھی ایک آئینہ پر مٹی کی تہہ جم جائے تو فوراً اپنے آستین سے اسے صاف کر دیتا ہے۔

❖ روح وحقیقت انسانی کی اپنے رب میں گہری نظر ہوتی ہے۔ لیکن یہ نظر وفکر نہایت کشید کیا ہوتا ہے اور ان کا انسانی جسم میں موجود ہونا، انسان کو علم وفکر عطا کرتا ہے۔

سورۃ الذاریات میں ہے۔

''اور میں نے جن وانس اس لئے بنائے کہ وہ میری بندگی کریں۔''

(ذاریات:56)

اور جو لوگ اپنا وعدہ بھول جاتے ہیں ان کے متعلق اللہ عزوجل نے سورۃ اعراف میں صریحاً بیان فرمادیا ہے۔

''کیا میں تمہارا رب نہیں۔ سب بولے کیوں نہیں ہم گواہ ہیں۔''

(اعراف:172)

تو وہ اللہ کو بھی بھول جاتے ہیں۔ جن لوگوں کو اس وعدہ اور گواہی کا کچھ حصہ بھی یاد ہے

تو وہ انبیاء علیہم السلام پر ایمان لائے ہیں۔

❖ شیخ عبداللہ بلیانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

"درویشی اس میں مضمر نہیں کہ انسان صوم وصلوٰۃ کا پابند ہو اور رات کو شب بیداری کرے۔ یہ سب تو عبادات کا حصہ ہیں اصل درویشی تو یہ ہے کہ انسان نعمتوں کی ناشکری نہ کرے۔ کیونکہ یہ تمام اشیاء تو ایک نظام کے تحت ہوتی ہیں جس کو اللہ ترتیب دیتا ہے۔ یہ نظام الاوقات تو اللہ کی طرف سے جاری کردہ ہے اور کسی غیر کی جانب سے نہیں ہے۔ ایک درویش کی جانب سے ان حالاتِ واقعات کو قبول کرنا ہوتا ہے۔"

انسان کو اس دنیا میں جو کچھ حاصل ہوتا ہے وہ اللہ کی نعمت میں سے ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ ایک درویش زندگی سے اچاٹ ہو کر بیٹھ جائے اور فقط موت ہی کی فکر کرتا رہے تو یہ بھی ناشکری ہے۔ کیونکہ اس نے زندگی کو اس ذات کی نعمت شمار نہیں کیا۔ اس لئے سچا درویش وہی ہے جو موت کو پسند کرے لیکن اس کی آرزو نہ کرے۔

❖ جب تک سالک کے دل سے تکبر اور خود پسندی نہیں نکل جاتی تب تک اس کو "فنا" حاصل نہیں ہوسکتی۔ کیونکہ یہ تمام فقط اس ذات تعالیٰ کی "میں" کی صفات ہیں۔ پہاڑ کشائی کرنا کسی دل سے تکبر نکالنے سے آسان ہے۔ اس لئے سالک کو چاہئے کہ وہ اس کی صفات کو اپنے سے دور کرنے کی بجائے خود اپنی "میں" کو اپنے میں سے نکال ڈالے۔

❖ سورۃ یٰسین میں ارشاد ہوتا ہے۔

"پاک ہے وہ ذات جس کے ہاتھ میں ہر چیز کا قبضہ ہے۔" (یٰسین:83)

پھر سورۃ ملک میں اس طرح آتا ہے۔

"بڑی برکت والا ہے وہ جس کے قبضہ میں سارا ملک اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔"

(ملک:1)

تمام حقائق کا آغاز اسی کی ذات سے ہے۔ لیکن عزت واحترام جو محبت کی پیداوار ہے

اس کا تقاضا یہ ہے کہ جہاں تک ''اچھائی'' کا سوال ہے تو آپ کو ''جبر'' سے حوالہ رکھنا چاہئے۔اور جہاں تک ''شر'' کا تعلق ہے تو آپ کو حوالہ ''قدر'' (رحم) سے رکھنا چاہئے۔

جیسا کہ شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

''ایمان جبر وقدر کے درمیان میں ہے۔''

سورۃ نساء میں ارشاد ہوتا ہے۔

''تجھے جو بھلائی پہنچے وہ اللہ کی جانب سے ہے اور جو برائی پہنچے وہ تیری اپنی جانب سے ہے۔'' (نساء:79)

ایسے رویہ کو بلاشبہ ہم تقویٰ کا ایک پہلو کہہ سکتے ہیں۔ جب آدم علیہ السلام سے اس کی نافرمانی کے بارے میں سوال کیا گیا تو انہوں نے کہا!

''اے ہمارے رب! ہم نے اپنے آپ کا برا کیا۔''

عابد کے تمام اعمال اللہ ہی کے تخلیق کردہ ہیں۔ جب ایک چابی کو گھمایا جاتا ہے تو اصلی حرکت چابی کی نہیں ہوتی بلکہ اس ہاتھ کی ہوتی ہے جو چابی کو گھماتا ہے۔اگر چہ اس میں مکانی حالت کا عمل دخل ہو گیا ہے کہ وہ ان دونوں میں فرق کر دیتا ہے۔ یہ دونوں حرکات اللہ ہی کے دست کی پیدا کردہ ہیں۔

جیسا کہ سوۃ فتح میں آتا ہے۔

''ان کے ہاتھوں پر اللہ کا ہاتھ ہے۔'' (فتح:16)

❖ حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

''معرفت، انسان میں اس حقیقی جاہلیت اور لاعلمی کا وجود ہے کہ جو وہ علم الٰہی کے چہرے میں محسوس کرتا ہے۔''

علم الٰہی کے مقابلے میں انسان کی یہ لاعلمی اس کی ذات کی ایک بے داغ حقیقت ہے کہ جو وہ اپنے میں محسوس کرتا ہے۔

حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

"اللہ کی حقیقت سے متعلق علم جہل ہے۔یعنی یہ وہ علم نہیں ہے جو اس علم کی جنس
سے ہو جو کہ ممکن کے علم سے متعلق ہے۔کیونکہ وہ تو کیف کے مقولے سے ہے
اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک کیف نہیں ہے۔"

اپنے علم کو اللہ کا علم تصور کیجئے تو آپ کو محسوس ہوگا کہ آپ کا یہ علم حقیقی طور پر علم الٰہی کا ایک بیرونی وظاہری اور محدود حصہ ہے۔لیکن اگر باطنی طور پر خیال کیا جائے تو یہ علم خالص اور لامحدود ثابت ہوتا ہے۔

ایک فارسی مثنوی میں ہے۔

"علم حق در علم صوفی گم شود"

(یعنی) علم الٰہی صوفی کے علم میں گم ہو جاتا ہے۔

❖ "فنا" سے مراد ہر طرح کے علم غیر کا غائب ہو جانا ہے اور بقاء سے مراد علم الٰہی ہے۔جو کہ اسی وقت حاصل ہوتا ہے کہ جب علم غیر سے نجات حاصل کر لی جائے اور ہم اس مقام پر اس وقت پہنچتے ہیں کہ جب منازل سلوک کی انتہا منزل آتی ہے کہ جس میں ولائت حاصل ہوتی ہے۔

❖ حدیث قدسی ہے۔

"اللہ نے انسان کو اپنے ہی عکس مین پیدا کیا۔"

ذات الٰہی، غیب، شہادت، روح مثال کے تمام درجات کا مکمل احاطہ کرتی ہے۔اس لئے حقیقت انسانی بھی ان تمام کا احاطہ کرتی ہے۔یہاں پر یہ احاطہ حقیقت میں تو صرف اس کی ذات کرتی ہے۔جبکہ یہ ذات انسانی تو فقط اس کے احاطہ کی نقل کرتی ہے۔

حدیث قدسی ہے۔

"جس نے اپنے نفس پر قابو پالیا اس نے اپنے رب کو پالیا۔"

جو بھی اپنے رب کو اس انداز سے بخوبی سمجھ لے کہ وہ ان تمام مقامات کا مکمل احاطہ کرتا ہے۔تو وہ اپنے رب کو ان سب کا احاطہ کرتے ہوئے اچھی طرح سمجھ لیتا ہے۔

حدیث میں ہے۔ ''میں نے اپنے رب کو اپنے رب سے سمجھا ہے''۔

❖ خواہش و آرزو کو شرک خفی کہا جاتا ہے اور یہ جسم کے تمام اعضاء میں رائج ہوتا ہے۔ وہاں سے ہر ایک ذرہ میں سرائیت کر جاتا ہے۔

سورۃ یوسف میں آتا ہے۔

''اور ان میں اکثر وہ ہیں جو اللہ پر یقین نہیں رکھتے مگر شرک کرتے ہوئے۔''

(یوسف:106)

اس آیت سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ ایمان و یقین علیحدہ علیحدہ حقیقتیں ہیں۔ ایمان کے بعد اگر خواہشات نفسانی پر قابو نہ پایا جائے تو یہ شرک خفی ہے جو کہ یقین کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ شرک کی ''میں'' شیطانی ہوتی ہے۔ جب تک یہ اس کے سینے سے خارج نہ ہو جائے تب تک اللہ کی ''میں'' اس میں ظاہر نہیں ہوسکتی۔

❖ ان منازل کے اختتام پر ایک بات جو کہنی ضروری سمجھوں گا۔ وہ یہ کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

''واذکر اسم ربک''

پھر آگے فرمایا:

تَبَتَّلْ اِلَيْهِ تَبْتِيلًا (مزمل:8)

بعض لوگ کہتے ہیں کہ بیٹی کی شادی ہو جائے، مکان بنا لوں، تھوڑا سا کاروبار جما لوں، ذرا دنیوی فکروں سے چھوٹ جاؤں، پھر میں اللہ والوں کے پاس جاؤں گا اللہ کی یاد میں لگ جاؤں گا اور بالکل صوفی بن جاؤں گا۔ آیت کی ترتیب بتا رہی ہے کہ جس فکر میں ہو، جس حالت میں ہو فوراً اللہ تعالیٰ کا ذکر شروع کر دو۔ ذکر اللہ کی برکت سے ہی تم فکروں سے چھوٹو گے، کیونکہ جب سورج نکلے گا جب ہی رات بھاگے گی۔ غیر اللہ اور افکار دنیویہ جب ہی مغلوب ہوں گے جب اللہ تعالیٰ کو یاد کرو گے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا کہ پہلے قلب کو یکسو کرو پھر میرا نام لو۔ بلکہ یہ فرمایا کہ پہلے میرا نام لو۔ میرے نام ہی کی

برکت سے تم کو افکار و غم اور پریشانیوں سے نجات ملے گی اور یکسوئی حاصل ہوگی۔ اگر تَبَتَّلْ ذکر پر موقوف نہ ہوتا تو آیت کی تقدیم دوسرے اسلوب پر نازل ہوتی اور تَبَتَّلْ اِلَیْهِ تَبْتِیْلًا مقدم ہوتا "واذکر اسم ربک" پر۔ جس کے معنی یہ ہوتے کہ پہلے غیر اللہ سے یک سو ہو جاؤ پھر ہمارا نام لو۔ لیکن "واذکر اسم ربک" کی تقدیم بتا رہی ہے کہ تبتل اور یک سوئی ہمارے ذکر ہی پر موقوف ہے۔ پہلے تم ہمارا نام لینا شروع کر دو۔ ہمارے ذکر کی برکت سے تمہیں خود بخود یکسوئی حاصل ہوتی جائے گی۔ اور غیر اللہ دل سے نکلتا چلا جائے گا۔

اس آیت کی تفسیر مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ نے عجیب انداز میں فرمائی ہے یہ عاشقوں کی تفسیر ہے۔ فرماتے ہیں کہ ایک دریا کے کنارے ایک شخص واجب الغسل کھڑا تھا جس کے جسم پر نجاست لگی ہوئی تھی دریا نے کہا کہ کیا بات ہے تو بہت دیر سے باہر کھڑا ہے کہا کہ مارے شرم کے تیرے اندر نہیں آ رہا ہوں کہ میں ناپاک ہوں اور تو پاک ہے۔ تو قیامت تک ناپاک ہی کھڑا رہے گا جس حالت میں ہے میرے اندر کود پڑ۔ تیرے جیسے لاکھوں یہاں پاک ہوتے رہتے ہیں اور میرا پانی پاک ہی رہتا ہے لہٰذا اللہ کی یاد میں دیر مت کرو۔ کیسی ہی گندی حالت میں ہو اللہ کا نام لینا شروع کر دو ذکر کی برکت سے غیر اللہ کی نجاست چھوٹے گی۔

اعتذار

محترم قارئین، السلام علیکم!

''شعائر الحق'' کی اشاعت کے ضمن میں ہر ممکن احتیاط کے باوجود کتابت کی کچھ اغلاط رہ گئیں۔ جنہیں بوجوہ دور نہ کیا جاسکا۔ ہم اس پر انتہائی شرمسار ہیں۔ اور اُمید کرتے ہیں کہ آپ درگزر فرمائیں گے۔ ایڈیشن میں اس کی تصیح کردی جائے گی۔ انشاءاللہ تعالیٰ

ناشر

صفحہ نمبر	سطر نمبر	غلط	صحیح
18	4	صفائی	صفاتی
24	11	بالواسطہ	بلاواسطہ
25	12	elemest	element
29	21	طور پر پھٹ	طور پھٹ
31	4	Ceartive	Creative
31	8	Incamation	Incarnation
34	6	Refomatory	Reformatory
35	12	و	لو
35	13	و	لو
38	9	Incarmation	Incarnation
48	22	عل	علم
63	9	ہاوی	حاوی
68	10	مقدر ہے۔	مقدر سے ہے۔
76	11	دیکھ کر	دیکھ کر حیران
83	18	کسی	کس
86	8	عکس بند	عکس بندی
110	2	Mdeicine	Medicine
117	1	Prychology	Psychology
150	2	cans	can
165	24	thie	this
192	7	نذرانوں کے	نذرانوں کا
193	4	میان	ایمان
220	18	and evil	of evil
221	2	مدمقابل تھا	مدمقابل شیوع تھا
221	19	mature	nature
221	20	dignith	dignity

Follow Us on Social Media

Gulaman e syed

Subscribe our Youtube Channel

Peer Syed Murtaza Amen Shah Naqshbandy

Like our Facebook Page

+923059295312

Whatsapp + Mobile

Gulamanesyed @gmail.com

Email Us at

آستانہ عالیہ آلومہار شریف